"مولف"

ترکی جدیدہ کے بانی غازی مصطفےٰ کمال اتاترک کی حالاتِ زندگی

از

محمد مرزا دہلوی

بسعی و اہتمام

کامریڈ بک ڈپو۔ دہلی

ملنے کا پتہ

کتب خانہ علم و ادب دہلی

طبع اوّل — قیمت مجلد دو روپیے — مارچ ۱۹۳۹ء

غازیٔ اعظم "کمال اتاترک" کی اس رفیقِ دیرینہ کے

نام

جو رزم بزم میں برابر کا شریک اور ترکی جدید

کی تعمیر میں ہمیشہ اتاترک کا دستِ راست بنا رہا اور جو

آج

اتاترک کا سچا جانشین اور ترکوں کا سردار ہے

مطبوعہ محبوب برقی پریس دہلی

"آتاترک" کی انگریزی ماخذ

(۱) "دی اوتوماں ایمپائر اِن یورپ" از ایڈورڈ فری من مطبوعہ لندن ۱۸۷۷ء
(۲) "دی کیلفس لاسٹ ہری ٹیج" ،، سر مارک سائیکس ،، لندن ۱۹۰۰ء
(۳) "دی خلافت" ،، سر ولیم میور ،، اڈنبرا ۱۹۱۵ء
(۴) "ماڈرن ٹرکی" ،، ای، جی، میرس ،، نیویارک ۱۹۲۵ء
(۵) "ایسٹرن کویسچن" ،، جے، سی، میرٹ ،، لندن ۱۹۲۷ء
(۶) "ٹرکش آرڈیل" ،، خالدہ ادیب ،، لندن ۱۹۲۸ء
(۷) "ٹرکی یسٹرڈے، ٹوڈے اینڈ ٹومارو" ،، سر ٹی، داگھ ،، لندن ۱۹۳۰ء
(۸) "گرے وولف" ،، ایچ، سی، آرم اسٹرانگ ،، لندن ۱۹۳۲ء
(۹) "کمالسٹ ٹرکی" ،، ڈاکٹر کے کروگر ،، لندن ۱۹۳۲ء
(۱۰) "مصطفےٰ کمال" ،، ڈگوبرٹ فان می کشک ،، لندن ۱۹۳۳ء
(۱۱) "ٹرکش ٹرانسفرمیشن" ،، ایچ، ای، آلن ،، شیکاگو ۱۹۳۳ء
(۱۲) "مصطفےٰ کمال آف ٹرکی" ،، ایچ، ای، ورتھم ،، لندن ۱۹۳۴ء

(۱۳) "ترکی میں مشرق اور مغرب کی کشمکش" از خالدہ ادیب مطبوعہ دھلی ۱۹۳۵ء

(۱۴) "ترکی" " ٹی، سی، جارمن " لندن ۱۹۳۵ء

(۱۵) "مسلم ویمن انٹر اے نیو ورلڈ" " آر، ای، ووڈ اسمال " لندن ۱۹۳۶ء

(۱۶) "انسائڈ یورپ" " جے، گنتر " لندن ۱۹۳۶ء

(۱۷) "کمال اتاترک" " ہانس فروم جن " لندن ۱۹۳۷ء

(۱۸) "اے ہسٹری آف یورپ" " ایچ، اے، ال فشر " لندن ۱۹۳۷ء

(۱۹) "ایشیاٹک ریویو" اگست ۱۹۳۷ء

(۲۰) "گریٹ برٹین اینڈ دی ایسٹ" دسمبر ۱۹۳۷ء

وغیرہ وغیرہ

فہرست

ترکی جدید کی تعمیر کے دوران میں ایک مدت تک مصطفٰے کمال اور ترکوں پر یورپ کی خبر رساں ایجنسیوں کی "نظر عنایت" رہی۔ کبھی اتاترک کے الحاد اور بے دینی کے افسانے نئے نئے انداز میں هندوستانیوں کے گوش گذار کئے جاتے اور کبھی حالات کو عجیب "معصومانہ" طریقہ پر مسخ کر کے ترکوں کی مغرب پرستی اور اسلام دشمنی کا چرچا کیا جاتا۔ اس مسلسل پروپیگنڈہ سے هندوستان کا روشن خیال طبقہ تو بیشک متاثر نہیں ہوا لیکن قدامت پرستوں کا وہ گروہ جو مذهب کی اصلی روح کو توهم پرستی سے علیحدہ کر کے سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا بے تکلف اس کا شکار ہو گیا۔ اور غالباً آج بھی وہ اسی مغربی سند پر ترکوں کو "اپنی طرح کا پکا" مسلمان ماننے کیلئے تیار نہیں!

لیکن ابھی مذهب کے ان هندوستانی اجارہ داروں میں ترکوں کا اسلام زیر بحث ہی تھا کہ ۱۹۳۴ء میں ملک کے سمجھدار طبقہ میں مصطفٰے کمال

اور ترکی سے متعلق ایک اور بحث چھڑ گئی۔ اس بحث کی نوعیت سیاسی تھی۔
خالدہ ادیب خانم اور رؤف بے، جنھیں مصطفےٰ کمال کی ذات اور انکی طرز حکومت کیخلاف سازش کرنے کے الزام میں حریف پارٹی کے بعض اور ممبروں کے ساتھ ترکی سے نکالا ملا تھا ۱۹۲۴ء میں ھندوستان آئے۔ یہاں ان لوگوں نے اگرچہ اپنی پبلک تقریروں میں اپنے ذاتی اختلافات کا تذکرہ نہیں کیا۔ لیکن نج کی صحبتوں میں یہ اس قدر محتاط نہ رہ سکے۔ سیاست کے جس خاص اسکول سے ان دونوں کا تعلق تھا اس کی نمائندگی بہرحال انھیں کرنی پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کی موجودہ طرز حکومت سے متعلق جمہوریت اور آمریت کی بحث چھڑ گئی۔ اور اپنے بعض دوستوں اور دور ابتلا کے چند ساتھیوں کے ساتھ انتہائی مستبدانہ انداز اختیار کرنے پر مصطفےٰ کمال کی ذات ہوس اقتدار کی ملزم سمجھی جانے لگی۔
یہ ڈگری یکطرفہ تھی، لیکن ثبوت صفائی کی عدم موجودگی کے باعث فیصلہ کی یہ کمزوری فی الفور محسوس نہ ہو سکی۔ اور گو مصطفےٰ کمال کے معجزانہ کارناموں کے مقابلہ میں اس سیاسی الزام کو کبھی کوئی خاص اھمیت حاصل نہ ہوئی پھر بھی ترکی جدید کے تذکرہ میں یہ ایک ہلکی سی تلخی ہے جو اب تک برابر محسوس ہوتی رہتی ہے۔
مصطفےٰ کمال کی ذات سے متعلق ان مذھبی اور سیاسی الزامات کی تحقیق کی ذمہ داری اصولاً ان کے سوانح نگار پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے کہ مصطفےٰ کمال کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی حقیقی قدر و قیمت کا صحیح

احساس ہی اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ان کی سیرت کے ہر پہلو اور ان کے انقلابی پروگرام کے ہر شعبہ پر پوری صفائی اور دیانتداری کے ساتھ روشنی ڈالی جائے لیکن ہمیں افسوس یہ ہے کہ مصطفٰے کمال کے انگریز، جرمن اور امریکن سوانح نگاروں کے ساتھ خود ترک واقع نگاروں نے بھی اپنی اس ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا۔

مصطفٰے کمال کے حالات اور واقعات جمع کرنے میں ان لوگوں نے بے شبہ بڑی محنت اور جانفشانی دکھائی اور معجزانہ کارناموں کے بیان کرنے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا لیکن مصطفٰے کمال کے سیاسی، مذہبی اور اصلاحی نظریوں اور ان کی زندگی کے مقدس مشن کی اصلی روح سے ان لوگوں نے مطلق سروکار نہ رکھا۔ حالانکہ ان ظاہری نقش و نگار میں اصلی چیز یہی تھی جو ہر قسم کی غلط فہمیوں کو دور اور مصطفٰے کمال کو صحیح طور پر سمجھنے میں مدد دیتی۔

مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ میں نے ان اوراق میں ان ساری فروگذاشتوں کا تمام و کمال احاطہ کر لیا ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ حوصلہ ہو بھی، تب بھی مجھ غریب کو تحقیق و تفتیش کی وہ سہولتیں کہاں حاصل ہو سکتی ہیں جو مصطفٰے کمال کے دوسرے سوانح نگاروں کو حاصل تھیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ان اوراق کی بھلی یا بری ترتیب اور ان کے نشر و اشاعت کا اصلی محرک یہی جذبہ ہے کہ بیسویں صدی کے اس سب سے بڑے انسان کے معجزانہ کارناموں کے ساتھ اس کی زندگی کے اس مقدس مشن پر بھی کچھ روشنی پڑ جائے جو ایک مردہ قوم کی حیاتِ نو کا باعث ہوئی۔ اس اعتبار سے جہاں تک مصطفٰے کمال کے

حالات اور اُن کے حربی اور سیاسی کارناموں کا تعلق ہے ان اوراق میں شاید آپ کو کوئی نئی بات نہ ملے ۔ یہ سارے واقعات کم وبیش وہی ہیں جو مصطفےٰ کمال کے انگریز، جرمن، امریکن اور ترک سوانح نگار پوری کاوش اور تحقیق کے ساتھ خود ان کی زندگی ہی میں قلمبند کر گئے ہیں ۔ البتہ جو بات آپ کو اوروں سے مختلف اور نئی نظر آئیگی وہ یہ ہے کہ حالات کے دوران میں جہاں کہیں کوئی اختلافی مسئلہ آ گیا ہے اس پر پوری طرح محاکمہ کرنیکی کوشش کی گئی ہے اور جہاں واقعات کو زیادہ صفائی سے پیش کرنیکی ضرورت ہوئی ہے وہاں مصطفےٰ کمال کے نقطہ نظر کی پوری شرح وبسط کے ساتھ وضاحت کر دی گئی ہے ۔ یہ کام یقیناً بہت ٹیڑھا اور بڑی ذمہ داری کا ہے ۔ لیکن اس کو کیا کیجیئے کہ اس کے بغیر مصطفےٰ کمال کی حقیقی سیرت پر روشنی ہی نہیں پڑ سکتی ۔ اور نہ وہ خاکہ سمجھ میں آتا ہے جس پر ترکی جدید کی تعمیر ہوئی ہے ۔

مثلاً اہم اختلافی مسائل ہیں :۔

ترکی جدید کی طرز حکومت یا کامیابی کے بعد اپنے بعض دوستوں کے ساتھ مصطفےٰ کمال کا طرز عمل یا ترکی سے آل عثمان کا اخراج یا پھر انقلابی اصلاحات کے متعلق جب تک حالات اور واقعات کی روشنی میں اختلافات کی نوعیت کا تعین اور مصطفےٰ کمال کے صحیح نقطہ نظر کی وضاحت نہ کی جائے اس وقت تک ان مسائل کی حیثیت نزاعی، حالات تشنہ اور واقعات غیر مکمل رہتے ۔ اسی طرح مصطفےٰ کمال کی آمریت، پیپلز پارٹی کی ترکی میں سیاسی

اجارہ داری، درویشوں اور مذہبی ملاؤں کے استیصال اور ترکی خواتین کی مغربی روش وغیرہ وغیرہ کے متعلق ضرورت تھی کہ حالات کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لیا جائے اور اس نزاع پر محاکمہ کیا جائے۔ جو ان مسائل سے متعلق پیدا ہو گئی تھی۔

غرض اس احساس کے باوجود کہ ان مسائل کو چھیڑنا اپنے سر بڑی نازک اور اہم ترین ذمہ داری لینا ہے۔ میں نے ان اوراق میں انھیں چھیڑ دیا۔ اور جہاں ضرورت نظر آئی وہاں بے تکلف محاکمہ بھی کیا ہے اور اس کیلئے میرے پاس صرف ایک عذر ہے۔

مصطفےٰ کمال زمانہ کی ان استثنائی نفوس میں ہیں جنھیں قومیں صدیوں کے مسلسل ریاض کے بعد پیدا کیا کرتی ہیں۔ ان کی شخصیت تاریخ کا سرمایہ اور ان کی تعلیمات پست قوموں کیلئے وسیلہ نجات ہیں۔ ان کے کارنامۂ حیات ان کے مخصوص نقطۂ نظر کی وضاحت کے بغیر محض افسانے رہ جاتے جن میں نہ کوئی سبق ہوتا اور نہ جن کا کوئی پیغام!

ناچیز

محمد مرزا

کمال آتاترک

تعارف

قوموں کی قسمتیں ہمیشہ سے افراد کے ہاتھوں میں رہی ہیں۔ افراد ہی انھیں سنوارتے ہیں اور افراد ہی بگاڑتے ہیں۔ عروج و کمال کی داستانیں انہی افراد کے کارناموں کا مرقع ہوتی ہیں۔ اور زوال کا تذکرہ انہی کی حماقتوں اور نالائقیوں کا نوحہ ہوتا ہے۔

ہم جسے کسی 'قوم' کی تاریخ کہتے ہیں وہ دراصل اس قوم کی صرف چند شخصیتوں کا بقید زماں تذکرہ ہے اور جن واقعات کو ہم کسی قوم کے عروج یا زوال کا سبب سمجھتے ہیں وہ انہی گنی چنی ہستیوں کی ذاتی کامیابی یا ناکامیوں کی تفصیل سے زیادہ کچھ نہیں ——— یونانیوں کے عروج و کمال کی تاریخ سے سکندر کی داستان محو کردو، کیا رہ جاتا ہے؟ رومیوں کی تاریخ سے، جولیس سیزر، شاہ اگستس اور قسطنطین کے نام غائب کردو، کیا باقی رہے گا؟ ہندوستان کی قدیم تاریخ، کورو پانڈو، رام اور کرشن کے تذکرے کے بغیر کیا چیز رہ جائیگی؟

یونانی سکندر سے پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں لیکن کیا ان کی وہ عظمت آج بھی باقی ہے جو سکندر کے زمانہ میں تھی۔ یا سکندر سے پہلے بھی وہ اس عروج سے مانوس تھے جس سے وہ سکندر کے زمانہ میں روشناس ہوئے؟

ایک یونانی ہی نہیں دُنیا کی کوئی سی قدیم یا جدید قوم لے لو، ناممکن ہے کہ اس کے عروج میں کسی سکندر، کسی جولیس سیزر، کسی عمرؓ، کسی صلاح الدین اور کسی نپولین بونا پارٹ کا ہاتھ نہ پاؤ!

تاریخ کی یہی اَن مٹ شہادتیں قوموں کے نشیب و فراز کی حقیقی آئینہ دار ہیں۔

اور انہی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ افراد ہوتے ہیں جو عروج بھی پاتے اور مٹ بھی جاتے ہیں۔ لیکن قومیں ترقی کی صحیح تڑپ کے ساتھ ہمیشہ زندہ اور اپنے رہنما کی آواز پر لبیک کہنے کو ہمیشہ تیار رہتی ہیں۔

وسط ایشیا کا ایک ترک قبیلہ "اوغوز" چنگیزی فتنہ سے گھبرا کر آرمینیہ کے میدانوں میں آبستا ہے۔ اور کچھ مدت بعد اپنے سردار ارطغرل کی ماتحتی میں قونیہ (ایشیائے کوچک) کے مسلمان بادشاہ ملک شاہ سلجوقی کی ملازمت اختیار کر لیتا ہے۔ ملک شاہ اس قبیلہ کو اناطولیہ کی سرحد "اسکی شہر" اور اس کا نواح بطور جاگیر دیتا ہے اور قونیہ کی مغربی سرحد کی حفاظت اس کے سپرد کرتا ہے۔ ارطغرل کے بعد اس کا بیٹا "عثمان" بھی اسی خدمت پر مامور ہوتا ہے۔ لیکن ۱۳۰۰ء میں قونیہ کی سلطنت جب تاتاریوں کے ہاتھوں ٹوٹ جاتی ہے اور سلجوقیوں کا آخری تاجدار علاؤالدین سلجوقی مارا جاتا ہے تو سلطنت قونیہ کے اور امیروں کے ساتھ "عثمان" بھی اپنے استقلال کا اعلان کر دیتا ہے۔ اور "اسکی شہر" کی بجائے انگورہ کو اپنا پایہ تخت قرار دیکر ایک ترک سلطنت کی بنیاد ڈال دیتا ہے۔ یہی شخص ترکی سلطنت کا بانی ہوا ہے اور اسی کی نسبت سے ترکی سلاطین آل عثمان کہلائے۔

عثمان کے بعد اس خاندان کے ۳۶ سلاطین نے ترکی پر حکومت کی جن میں دور اول کے دس سلاطین ایسے گذرے ہیں جو ایشیا اور یورپ میں برابر اپنی سلطنت کی حدیں بڑھاتے رہے۔ سلیمان اعظم کے زمانہ میں جو اس خاندان کا دسواں سلطان تھا ترکی کی سرحدیں (۱) یورپ میں "ویانا" تک جنوب میں مصر وسودان تک، اور ایشیا میں دریائے فرات تک قائم ہو گئی تھیں۔ یہ ترکی سلطنت کا شباب تھا اور یہ اتنی بڑی سلطنت

تھی کہ اس وقت یورپ اور ایشیا میں سوائے روس کے اس کے مقابلہ کی ایک سلطنت بھی نہ تھی۔ عالم اسلام کو اس ترکی سلطنت سے اس لئے زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ ۱۵۲۴ھ میں خلافت عباسیہ کے آخری نام لیوا متوکل علی اللہ ثالث نے منصب خلافت سے ترکی سلطان سلیم اوّل کے حق میں دست برداری کر لی تھی۔ اور اس وقت سے ترکی کا سلطان خلیفۃ المسلمین بھی سمجھا جانے لگا تھا[1]۔

سلیم اول کے بعد سلیمان اعظم اور سلیمان اعظم کے بعد آل عثمان کے سولہ بادشاہوں نے جو خلافت عباسیہ کے وارث ہونے کے باعث خلیفۃ المسلمین بھی تھے قسطنطنیہ پر حکومت کی۔ لیکن ترکی سلطنت کا عروج سلیمان اعظم کے بعد ختم ہو چکا تھا۔ ترک سلاطین مجاھد اور سپاہی باقی نہیں رہے تھے۔ اور نہ انکی نسل خالص ترکی رہی تھی۔ بازنطینی اور روسی عورتوں سے انھوں نے شادیاں کیں اور عیش پسند اور آرام طلب بادشاہ ہو گئے۔ ملک کا انتظام خوشامد پسند امیروں کے ہاتھ میں آ گیا۔ سلطنت میں قوت اور اقتدار حاصل کرنے کیلئے دربار اور حرم میں سازشوں کا جال بچھنے لگا۔ اور امرا کی آپس کی رنجشوں اور رخنہ اندازیوں سے رفتہ رفتہ سلطنت میں ضعف آتا گیا۔ پہلے ہر ترک سلطان کچھ نہ کچھ نیا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کرتا جاتا تھا اب

---

[1] بیگم خالدہ ادیب خانم اس کو نہیں مانتیں۔ جنوری ۱۹۳۵ء میں اپنی سیاحت ہند کے زمانہ میں انھوں نے جامعہ ملیہ دہلی میں ترکی پر آٹھ لیکچر دیئے تھے انہی میں سے ایک میں وہ کہتی ہیں کہ "ترکی تاریخ سے اسکا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ سلیم اول کے بعد سے ترک سلاطین خلیفۃ المسلمین بھی ہو گئے تھے بلکہ یہ چرچا سلطان عبدالحمید کے زمانہ سے ہوا۔" یہ پروپیگنڈا سلطان عبدالحمید کے متعلق یورپ نے کیا تھا۔ تعجب ہے کہ خالدہ ادیب بھی اس سے متاثر ہو گئیں۔ حالانکہ وہ اپنے اسی لیکچر میں چند سطروں کے بعد یہ اعتراف بھی کرتی ہیں کہ "سلطان سلیم اول کا نام مصر اور بغداد میں جمعہ کے خطبوں میں لیا جانے لگا تھا۔ اور سلطان اپنے آپ کو خادم الحرمین الشریفین لکھا کرتا تھا۔"

ہر سلطان کے عہد میں کوئی نہ کوئی مقبوضہ ہاتھ سے نکلنے لگا۔ یورپ اور ایشیا میں اس سلطنت کی ساکھ بگڑنے لگی۔ مقبوضہ علاقوں کے امیر سلطنت ترکی کو کمزور دیکھکر باغی ہونے لگے۔ پہلے آسٹریا اور ہنگری کے علاقے ہاتھ سے نکلے، پھر سربیا اور بلغاریہ نے سر اٹھایا، ادھر روس نے کچھ علاقے دبائے۔ البانیہ نے بغاوت کی۔ یونان میں ترکوں کے خلاف شورش پیدا ہوئی۔ مصر کا والی اپنے استقلال کا اعلان کر بیٹھا۔ غرض ۱۲۹۲ھ تک مراد خامس کی معزولی اور عبدالحمید کی تخت نشینی کے وقت ترکی قریب قریب تمام ہو چکی تھی۔ ایک طرف ملک میں افراتفری اور بدانتظامی اور دوسری طرف یورپین قرضوں کے بار نے سلطنت کا کچومر نکال دیا تھا۔ ترکی کے لئے مرد بیمار کا خطاب اسی زمانہ میں یورپ نے وضع کیا تھا۔ اور کھلم کھلا اس کے حصے بخرے کرنیکے منصوبے گانٹھے جا چکے تھے۔ زار نکولس، پرنس بسمارک اور مسٹر گلیڈ اسٹن نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب ترکی کو یورپ میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے اس کو ایشیا ہی میں دھکا دیدینا چاہیئے۔ اور اس کے یورپین علاقے آپس میں تقسیم کر لینے چاہئیں۔ لیکن سلطان عبد الحمید اپنے پیشرو سلاطین کی طرح نرم چارہ نہیں تھا جسے یورپ کی طاقتیں آسانی سے ہضم کر جاتیں۔ عبدالحمید نے تخت نشین ہوتے ہی پہلے تو ترکی معاملات میں دول یورپ کی مداخلت کے زور کو توڑا اور اس کے بعد سلطنت کی اندرونی اصلاح کیلئے دستوری حکومت کا اعلان کر دیا۔ گویا مرد بیمار نے سنبھالا لیا۔ لیکن یورپ کے مدبروں کو بھلا یہ ادا کیوں پسند آتی۔ زار نکولس جو مدت سے قسطنطنیہ کے خواب دیکھ رہا تھا ترکی کو ایک نئی کروٹ لیتے دیکھکر چونک پڑا۔ اور ۱۸۷۷ء میں بغیر کسی معقول سبب کے ترکی پر چڑھ دوڑا۔ جنگ پلونا اسی روسی حملہ کی یادگار ہے۔ جس میں ترکی کی رہی سہی طاقت بھی تمام ہوئی۔ اور روس کیلئے قسطنطنیہ تک کا راستہ صاف ہو گیا۔

لیکن عین اس وقت جب سلطنت ترکی کے خاتمہ میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ اور مدبرین یورپ کے برسوں کے منصوبے پورے ہونیکو تھے۔ خود دول یورپ میں ترکی مال غنیمت کی تقسیم پر اختلاف ہو گیا۔ اور قسطنطنیہ روس کے حصے میں آتا ہوا دیکھکر یورپ کی دوسری حکومتیں

گھبرائیں کہ بحیرۂ روم میں اگر روس کو ایک زبردست مرکز حاصل ہوگیا تو پھر اس کی طاقت بے پناہ ہوجائیگی۔ اور وہ سارے یورپ کیلئے ایک مصیبت بن جائیگا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ وہی حکومتیں جو ترکی کا بوریا بستر یورپ سے بندھوانے کیلئے مدت سے آستینیں چڑھا رہی تھیں ترکوں کے ساتھ ہوگئیں اس لئے نہیں کہ یکایک انھیں ترکوں سے ہمدردی پیدا ہوگئی تھی بلکہ اس لئے کہ اب انھیں خود اپنی عافیت اسی میں نظر آتی تھی کہ یورپ کا یہ "مرد بیمار" بدستور قسطنطنیہ میں اپنا بستر لگائے پڑا رہے۔

دول یورپ کی پالیسی میں اس یکایک انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ وحشی روسیوں کا وہ سیلاب جو بے تحاشا قسطنطنیہ کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا آستانہ سے صرف دس میل کے فاصلہ پر استفانو میں رک گیا۔ اپنی خوشی سے نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کی دھمکی کے زور سے اور اس لئے رکا کہ دوست بھی اس سے پھر گئے تھے۔ اور جو بڑھاوے دے رہے تھے خود انھوں نے بڑھکر اس کا راستہ روک لیا تھا

روس کیلئے یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ ایک طرف اس کے سامنے صرف چند قدم کے فاصلہ پر اس کا شکار نیم جان پڑا تھا اور دوسری طرف یورپ کے بھیڑیئے اسے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے نہ دیتے تھے ایک طرف شکار کا لالچ دوسری طرف ان کے متحدہ حملے کا خوف اگر اس وقت ذرا بھی روس سے لغزش ہوتی تو یورپین جنگ شروع ہوجانے میں کوئی کسر نہیں تھی۔ لیکن روس چونکہ دول یورپ کے اس حملے کیلئے بالکل تیار نہیں تھا اور نہ اس میں اتنا بوتہ تھا کہ سب سے ایک ساتھ بھگت سکتا۔ اس لئے اس نے مجبوراً ہتیار ڈال دئیے۔ اور اس معاہدہ پر قانع ہوگیا جو دول یورپ نے بیچ میں پڑکر کرادیا۔ اس معاہدہ کے بعد ترکی نے ایک اطمینان کا سانس لیا۔

"جان بچی لاکھوں پائے!"

کچھ دنوں بعد بعض حکومتوں کو اس معاہدہ پر بھی اعتراض ہوا۔ اس کے دور کرنے کیلئے پرنس بسمارک کی صدارت میں برلن میں ایک کانفرنس ہوئی اور وہاں ایک نیا معاہدہ لکھا گیا۔ جس میں اردہان، باطوم اور قلعہ قرص روس کے حصہ میں آیا۔ بلغاریہ کو ترکی کے ماتحت

ایک ریاست کی حیثیت دیدی گئی۔ رومانیہ اور سربیا آزاد ملک تسلیم کر لئے گئے۔ اور تسالیا یونان کے حوالے کر دیا گیا اس معاہدہ کے بعد سلطنت ترکی اگرچہ بہت کمزور ہو گئی تھی اور یورپ میں برائے نام اس کا اقتدار رہ گیا تھا لیکن چونکہ ایشیا میں اس کا اثر اور اقتدار کافی تھا اس لئے ابھی یہ امید باقی تھی کہ یورپ کا یہ مرد بیمار شاید صحت یاب ہو جائے لیکن بدقسمتی سے کچھ ایسی مسلسل بد پرہیزیاں ہوئیں کہ مریض کی حالت روز بروز بگڑتی ہی چلی گئی۔ تا آنکہ مرض کے ساتھ مریض کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

سلطان عبد الحمید نے برلن کے معاہدہ کے بعد دستوری حکومت کو توڑ ڈالا۔ اور سارا نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور ان لوگوں کو جو دستور کے حامی تھے ترکی حدود سے نکال دیا۔ سلطان نے یہ قدم اصلاح کے سلسلہ میں اٹھایا تھا لیکن ترکی کے حق میں بالکل الٹا پڑا۔ جو دستور کے حامی ترک قسطنطنیہ سے نکالے گئے تھے وہ نوجوان تھے۔ مغربی تعلیم نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں ان میں جوش تھا، اپنے وطن سے انھیں محبت بھی تھی شخصی حکومت کی لعنت اور دستوری حکومت کی برکتوں سے بھی وہ مانوس ہو چکے تھے اور چاہتے تھے کہ اپنے ملک کو اس شخصی حکومت کی لعنت سے پاک کر دیں اور ترکی کو دول یورپ کی صف میں لا بٹھائیں۔ سلطان اور ان کے مشیر انھیں اپنے ملک میں ایک بدنما داغ نظر آ رہے تھے۔ جن کے وجود ہی کو وہ حرف غلط کی طرح مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف سلطان اور ان کے متوسلین ان نوجوانوں کو حقارت سے دیکھتے تھے اور ان کی علمی اور سیاسی قابلیتوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی سے نکالے جانے کے بعد ان نوجوانوں نے برلن اور پیرس میں قدم جمائے اور وہیں بیٹھے بیٹھے انھوں نے سلطان اور اس کی حکومت کے خلاف خفیہ انجمنیں قائم کرنی شروع کر دیں۔

انجمن اتحاد ترقی کی بنیاد پیرس کے پناہ گزین ترکوں نے ڈالی اور لبرل پارٹی برلن کے ترکوں نے بنائی۔ اس میں انجمن اتحاد و ترقی بہت پھولی پھلی، اس کی شاخیں خفیہ خفیہ ترکی شہروں میں قائم ہونی شروع ہوگئیں۔ اور مرکز اس کا سالونیکا بنایا گیا۔

نوجوان ترک جو عبدالحمید کی حکومت سے نالاں تھے وہ چپکے چپکے اس انجمن کے ممبر ہوتے گئے اور خود سلطنت کے افسروں کی بھی اس انجمن سے ہمدردی بڑھتی گئی اور ۱۳۲۴ھ میں اس انجمن کو اتنی قوت حاصل ہوگئی کہ جب اس انجمن کے نوجوانوں نے علم بغاوت بلند کیا تو سلطان کو بچون چرا ان کا مطالبہ منظور کرکے دستوری حکومت پھر سے قائم کرنی پڑی۔ لیکن ۱۳۲۵ھ میں سلطان عبدالحمید نے اس دستوری حکومت کو توڑنے کی پھر ایک کوشش کی اور انجمن اتحاد و ترقی کے چند ممبروں کو بھی اس کوشش میں قتل کرادیا لیکن سلطان کو ناکامی ہوئی۔ نوجوانوں نے باب عالی کو گھیر لیا۔ اور سلطان عبدالحمید کو معزول کرکے سالونیکا میں نظر بند کردیا۔ اور محمد ارشاد کو انکی جگہ تخت نشین کردیا۔

محمد ارشاد کی تخت نشینی کے بعد بظاہر دستوری حکومت پوری طرح ترکی میں قائم ہوچکی تھی۔ اور اس طرح ایک حد تک ترکی کی اندرونی بیماری کا علاج بھی ہوگیا تھا۔ لیکن حقیقتاً یہ کوئی علاج نہیں تھا اس لئے کہ نہ صحیح دستوری حکومت عبدالحمید کے زمانہ میں قائم ہوسکی اور نہ محمد ارشاد کے زمانہ میں۔ عبدالحمید بذات خود حکومت کرنی چاہتا تھا اور اس میں اتنی جرأت بھی تھی کہ وہ علانیہ دستور کی تحقیر کرتا تھا لیکن محمد ارشاد کے زمانہ میں جن نوجوانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ وہ اعلان تو دستوری حکومت کا کرتے تھے لیکن حکومت کا انداز ان کا عبدالحمید سے بھی زیادہ شخصی اور مستبدانہ تھا۔ یہ نوجوان اتنے خودسر اور بددماغ ہوگئے تھے کہ ملکی معاملوں میں مشورہ تو رہا ایک طرف اگر کوئی ان کی رائے سے اختلاف کی جرأت بھی کرتا تھا تو یہ اسے عبدالحمید سے بھی زیادہ سخت سزا دیئے بغیر نہ چھوڑتے تھے کہنے کو تو پارلیمنٹ بھی تھی اور کابینہ وزارت بھی اور یہ دعوے بھی موجود تھا کہ یہ سب ملک کی نمائندہ ہیں۔ لیکن حقیقتاً پارلیمنٹ اور کابینہ انہی

نوجوانوں کی نمائندہ تھی اور انہی کے اشاروں پر رقص کیا کرتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں ایک عبد الحمید کے بجائے محمد ارشاد کے زمانہ میں کئی کئی عبد الحمید پیدا ہو گئے تھے۔ اور ترکی کا رہا سہا نظم و ضبط بھی ان خودسر اور ضدی نوجوانوں کے نذر ہونے لگا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۹ء میں اٹلی نے طرابلس میں جنگ چھیڑ دی اور ابھی اس جنگ کا فیصلہ نہ ہوا تھا کہ ۳۱ھ میں بلقان کی ریاستوں یعنی بلغاریہ، سربیا اور یونان نے اٹلی کے اشارے پر ترکی پر حملہ کر دیا اور یورپ میں پھر وہی نعرے لگنے لگے کہ ترکیوں کو یورپ سے نکال دو۔ بلقان کی جنگ نے زیادہ طول نہ کھینچا بہت جلد بیچ بچاؤ ہو گیا لیکن بہت نقصان کے ساتھ۔ ترکی ابھی اس نقصان سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ جنگ عظیم شروع ہو گئی اور نوجوان پارٹی جو قسطنطنیہ پر حکومت کر رہی تھی آثار و قرائن کا اندازہ کئے اور اونچ نیچ سوچے بغیر جنگ میں پھاند پڑی۔

ترکی فوجیں اگرچہ پہلے ہی سے خستہ حال ہو رہی تھیں پھر بھی انھوں نے میدان جنگ میں پوری پوری جی داری دکھائی۔ کہیں دشمنوں کو شکست دی کہیں خود شکست کھا گئیں لیکن یہ نابرابر کا مقابلہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ ۳۶ھ ہجری میں محمد ارشاد کا انتقال ہوا وحید الدین تخت پر آئے۔ لیکن یہ برائے نام کی تخت نشینی تھی۔ اب کے دول مخالف پوری طرح آپس میں ترکی کے حصے بخرے کر چکے تھے۔ اور قسطنطنیہ جس کی روس کو مدتوں سے ہوس تھی۔ اور جس کو ایک دفعہ خود انہی قوتوں نے مل کر اس کے منہ سے چھینا تھا اپنی طرف سے روس کو دے چکے تھے اور اس کے ساتھ ارمینیہ اور مشرقی اناطولیہ بھی اس کو بخش دیا تھا۔ شام، اسکندرونہ اور موصل فرانس کو پیش کر دیا گیا تھا۔ اور بغداد اور فلسطین تک کا سارا علاقہ خود برطانیہ نے قبول کر لیا تھا۔

۱۰۔ اگست ۱۹۱۸ء کو جنگ عظیم ختم ہوئی۔ ترکی کی نوجوان پارٹی جو اس جنگ کی ذمہ دار تھی قسطنطنیہ سے چھپ کر فرار ہو گئی۔ اور وحید الدین کی ماتحتی میں ایک برائے نام وزارت

بن گئی جس نے دول مخالف سے صلح کرنی چاہی لیکن جس کی موت کا فتویٰ صادر ہو چکا ہو اس سے صلح کون کرتا ہے۔ ترکی کے سارے علاقے پہلے ہی تقسیم ہو چکے تھے۔ اب یورپ میں ایک قسطنطنیہ رہ گیا تھا۔ اور یہ بھی اس لئے کہ جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی روس میں بغاوت ہو گئی۔ اور اسے قسطنطنیہ لینے کے بجائے خود اپنی پڑ گئی۔ اس نئی صورت کا حل دولِ مخالف نے یہ سوچا کہ فیصلہ تک قسطنطنیہ پر خود قبضہ کر لیا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۱۸ء میں برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی فوجیں قسطنطنیہ میں دَر آئیں۔ اور مارچ ۱۹۲۰ء میں انھوں نے ترکی کے جملہ شعبہ جات پر قبضہ کر لیا۔ اور ۶۶ ترکوں کو جن میں ترکی کے شیخ الاسلام بھی تھے قید کر کے مالٹا بھیجدیا۔ اور وحید الدین کو اپنی غرض کیلئے بطور نظر بند قسطنطنیہ میں رہنے دیا۔

اس طرح آل عثمان کی حکومت پورے ۶۴۰ برس تک ایشیا اور یورپ کے ایک بڑے حصہ پر قائم رہنے کے بعد ختم ہو گئی۔ اور اُس باجبروت سلطنت کے جس سے دولِ یورپ آنکھ ملاتے ہوئے گھبرایا کرتا تھا پرخچے اڑ گئے۔ بظاہر ترکی تمام ہوئی۔!

لیکن عین اس وقت جبکہ دوست اور دشمن ترکی پر فاتحہ پڑھ چکتے ہیں ایک عجیب کرشمہ ظاہر ہوتا ہے۔ ترکی قدیم کی خاک میں زندگی کی ہلکی سی تڑپ محسوس ہوتی ہے۔ اناطولیہ کے کھنڈر ترکی کی عظمتِ رفتہ کی یاد میں ایک جُھرجُھری سی لیتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے غیرت قومی اور حمیت دینی کا ایک بدوست طوفان اٹھتا ہے جو دشمنوں کی جڑیں تک ترکی کی سرزمین سے اکھیڑ پھینکتا ہے اور شہامت و شجاعت کا ایک سیلاب آتا ہے جو دشمنوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لیجاتا ہے اور ترکی کی مقدس سرزمین کو ایک مرتبہ پھر ان کے ناپاک قدموں کے نشان تک سے پاک کر دیتا ہے۔

ان معجزانہ واقعات سے دول عالم کا استعجاب جب کسی قدر کم ہوتا ہے تو دنیا کو یہ تماشہ دکھائی دیتا ہے کہ ساڑھے چھ سو برس پہلے کے ادعوز قبیلہ کے ترکی سردار عثمان کی بنائی ہوئی

عمارت کے کھنڈروں پر ایک نئی اور اس سے بہت زیادہ شاندار عمارت کی بنیاد بھری جاچکی ہے اور صرف ایک معمار حوادثِ عالم سے بے پروا، انتہائی جوش وانہماک، استقلال و اطمینان کے ساتھ شب و روز اس کی تعمیر میں مصروف ہے۔ ——————— یہ معمار بھی ترک ہے، سرکیشن قبیلہ سے اس کا تعلق ہے۔ اور اس کا نام "مصطفیٰ" ہے!

باب (١)

مصطفٰے کمال کے والدین اس کا خاندان اور بچپن

[illegible] جو ترکی سلطنت کا ایک بڑا فوجی مرکز، اہم بندرگاہ اور زبردست تجارتی مقام تھا، وہاں کے سلطانی جنگی خانہ کا ایک کلرک تھا "علی رضا"۔ یہ سرکیش ترک تھا اور ان ترکی خاندانوں میں سے ایک سے اس کا تعلق تھا جو سلیمان اعظم کے زمانہ میں سربیا اور البانیہ میں آ بسے تھے۔ اور جنھوں نے زمینداری کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ علی رضا کا والد بھی زمیندار تھا، اور خود علی رضا کی شادی بھی زمینداروں ہی میں ہوئی تھی۔۔ اس کی بیوی زبیدہ خانم جنوبی البانیہ کے ایک بڑے زمیندار کی بیٹی تھی۔ لیکن علی رضا کو زمینداری اور دیہاتی زندگی پسند نہ آئی۔ اور شادی کے بعد یہ اپنی بیوی کو لیکر تجارت کی غرض سے سالونیکا آ گیا۔ یہاں اس نے تجارت شروع کرنے سے پہلے جنگی کے دفتر میں ملازمت کر لی۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ سلطانی جنگی خانہ میں چھ چھ مہینے تنخواہ ہی نہیں ملتی اور گذارا مشکل سے ہوتا ہے تو اس نے ملازمت چھوڑ دی، اور لکڑی کی تجارت کرنے لگا۔ اسی سال یعنی ١٨٨١ء (١٢۔ مارچ کو) اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس سے پہلے علی رضا کے ہاں ایک اور لڑکا ہوا مگر وہ قضا کر چکا تھا۔ اس لڑکے کے بعد ایک لڑکی ہوئی جس کا نام اس نے مقبولہ رکھا اور اس لڑکی کے کئی برس بعد بڑی

منتوں اور آرزوؤں کے ساتھ یہ لڑکا ہوا۔ دُبلا۔ پتلا۔ کمزور۔ اُداس۔ نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والا۔ علی رضا نے اس کا نام مصطفےٰ رکھا۔

مصطفےٰ چونکہ علی رضا کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کی لکڑی کی تجارت بھی بُری نہیں تھی۔ اس لئے بڑے آرام سے اس کی پرورش ہوتی رہی۔ خاصکر مصطفےٰ کی بسم اللہ کی تقریب علی رضا نے بڑی دھوم دھام سے کی تھی۔

اپنے بچپن کے حالات میں یہ تقریب کمال اتاترک کو اب تک یاد ہے۔ ۱۹۳۲ء میں ایک امریکن اخبار نویس نے ان سے ان کے بچپن پر ایک انٹرویو کیا تھا اس میں انھوں نے کہا تھا کہ مجھے اپنی بسم اللہ اب تک یاد ہے۔ اس دن میری والدہ نے مجھے اچھے اچھے کپڑے پہنائے تھے۔ عصر کے وقت ایک مولوی صاحب نے مجھے بسم اللہ پڑھائی تھی اور بچوں کے ساتھ میرا جلوس بھی نکالا تھا۔

بسم اللہ کے بعد علی رضا اور زبیدہ خانم میں مصطفےٰ کی آئندہ تعلیم اور پیشہ کے متعلق کشمکش ہونے لگی۔ علی رضا کی مرضی تھی کہ قرآن شریف ختم کرا کے مصطفےٰ کو مدرسہ کی تعلیم دلوائیں۔ اور رفتہ رفتہ اس کو تجارت میں لگا دیں اور زبیدہ خانم ان کو "مولوی" بنانا چاہتی تھیں۔ لیکن اس کشمکش میں علی رضا کی فتح ہوئی۔ اور مصطفےٰ کو قرآن ختم کرنے کیلئے مسجد میں بٹھا دیا گیا۔ اور جب مصطفےٰ نے قرآن ختم کر لیا تو علی رضا نے اسے شمسی آفندی کے مدرسہ میں داخل کر دیا۔ یہاں مصطفےٰ کی ذہانت اور طباعی کا پہلا مظاہرہ ہوا اور دو سال ہی میں شمسی آفندی کے مدرسہ میں اس نے نمایاں درجہ حاصل کر لیا۔

لیکن یہاں اس کی تعلیم مسلسل جاری نہ رہ سکی۔ اس لئے کہ ۱۸۹۵ء میں علی رضا کا یکایک انتقال ہوگیا۔ اور یہ چھوٹا سا خاندان جو صرف ایک بیوہ ماں اور ایک بھائی بہن پر مشتمل تھا

بالکل بے سہارا رہ گیا۔ لکڑی کی تجارت صرف اسی قدر تھی کہ اس خاندان کا گذارا ہوتا رہا باقی پس انداز کچھ نہ ہو سکا تھا۔ مصطفےٰ ابھی بچّہ تھا، وہ باپ کی تجارت سنبھال نہ سکتا تھا۔ مجبور ہو کر بیوہ ماں نے اس کاروبار کو بند کیا اور اپنے دونوں بچوں کو لیکر اپنے بھائی کے ہاں جو سالونیکا سے کچھ فاصلہ پر لازاساں نامی ایک گاؤں میں زمیندار تھا اٹھ گئی۔

مصطفےٰ بچپن ہی سے نہایت ذہین اور طباع لیکن ساتھ ہی ضدی اور خود سر واقع ہوا تھا۔ شمسی آفندی کے اسکول میں یہ نہ صرف اپنی جماعت میں اوّل رہا کرتا تھا بلکہ سارے اسکول کے بچوں کا بھی لیڈر رہتا تھا۔ اور اس سے بڑی عمر کے بچوں کو بھی یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ اس سے لڑکر اس کی سرداری چھین لیتے۔ سالونیکا چھوڑ کر جب لازاساں پہونچے تو یہاں اسکول تو تھا نہیں بس دن بھر کھیل تھا یا اپنے ماموں کے کھیتوں کی رکھوالی تھی اور یہ رکھوالی بھی برائے نام تھی۔ اپنے ہم عمر بچوں کا گروہ اپنے ماموں کے کھیت میں جمع کرتا، کبھی خود ان کا سردار بنتا اور کبھی سلطان بن کر جھٹ مُٹ کے پکڑے ہوئے ملزموں کو کبھی سزا دیتا کبھی چھوڑ دیتا۔ دن دن بھر یہی کھیل ہوتا رہتا اور اس وقت ختم ہوتا جب شام کے قریب اس کا ماموں یا بھائی دور سے اسے ڈانٹ بتاتا اور اپنے جانوروں کو گھیر لانیکی ہدایت کرتا تھا۔

گاؤں کی آب و ہوا سے مصطفےٰ کی صحت تو بہت اچھی ہو گئی تھی۔ لیکن تعلیم اور دباؤ نہ ہونیکی وجہ سے اس کی خود سری اور ضد بڑھتی جاتی تھی۔ اور ایک قسم کا اکھڑ پن اس میں آتا جاتا تھا۔ زبیدہ خانم کو یہ دیکھ دیکھ کر بڑا رنج ہوتا۔ وہ اپنے بچے کو زمیندار یا کسان نہیں بنانا چاہتی تھی لیکن بے بس تھی نہ تعلیم اپنی مرضی کی دلوا سکتی تھی اور نہ پوری طرح مصطفےٰ پر دباؤ ڈال سکتی تھی۔ آخرکار زبیدہ خانم کی ایک بہن نے ہمّت کی اور مصطفےٰ کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنیکی حامی بھری اور مصطفےٰ پھر سالونیکا کے ایک مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۱ برس کی تھی۔ لیکن اتنے دنوں اسکول سے علیحدگی اور گاؤں میں آزاد زندگی بسر کرنیکے بعد وہ اسکول کی

کی پابندیوں اور سختیوں کو بُری طرح محسوس کرنے لگا۔ چنانچہ اکثر اوقات وہ ان پابندیوں کیخلاف بغاوت کرتا اور استاد اس کو سزا دیئے بغیر نہ چھوڑتے۔ خود سری اور ضد کے ساتھ ساتھ اب ایک بات اس میں اور پیدا ہو گئی تھی اور وہ یہ کہ مصطفےٰ اپنی جماعت کے لڑکوں سے الگ تھلگ رہنے لگا تھا۔ حتیٰ کہ کھیل کود میں بھی ان کے ساتھ شریک نہ ہوتا۔ اس کی وجہ سے وہ اسکول کے لڑکوں میں بہت غیر ہر دلعزیز ہو گیا۔ اور استاد بھی اس کی خود سری اور ضدی طبیعت کی وجہ سے اس سے خوش نہیں تھا۔ ایک دن امتحان کے زمانہ میں یہ واقعہ ہوا کہ قصور تھا کسی اور لڑکے کا مگر غلط فہمی میں پٹ گئے مصطفےٰ۔ استاد کی اس جہالت اور بے انصافی پر مصطفےٰ کو اس قدر غصہ آیا کہ دسویں جماعت کا امتحان چھوڑ چھاڑ، اسکول کو خیرباد کہہ کر پھر لازاساں آ گیا۔ اور اس کے بعد پھر کبھی اسکول کا رخ نہیں کیا۔

باب ۲

فوجی اسکول میں داخلہ اور اعلیٰ تعلیم کی تکمیل

مصطفیٰ کی تعلیم ادھوری رہ جانیکا زبیدہ خانم کو بڑا رنج تھا۔ ایک دن وہ مصطفیٰ کمال کو سمجھا رہی تھیں کہ ان کے بھائی آگئے۔ اور انھوں نے یہ رائے دی کہ مصطفیٰ کو فوجی اسکول میں داخل کر دو۔ اس اسکول کا خرچ بھی کچھ نہیں ہے۔ سلطان خود ہی سب خرچ اٹھاتے ہیں۔ اگر یہ اسکول میں کامیاب ہو گیا تو کیڈٹ ہو جائیگا ورنہ سپاہی تو بہرحال بن ہی جائے گا۔ زبیدہ خانم اس تجویز کو سننے کی بھی روادار نہ ہوئیں۔ وہ پہلے تو مصطفیٰ کو مولوی بنانا چاہتی تھیں۔ اور بدرجۂ مجبوری تاجر۔ لیکن مصطفیٰ پر اپنے ماموں کی تجویز کا فوری اثر ہوا۔ اسی گاؤں میں وہ ایک شخص احمد کو کیڈٹ کی بھڑکیلی وردی میں پھرتا ہوا دیکھ چکا تھا۔ اور بار بار اس کے دل میں بھی یہ آرزو پیدا ہوئی تھی کہ وہ خود بھی ایسی وردی پہنے۔ اب جو اس کے ماموں نے یہ

تجویز پیش کی تو بے اختیار ہو گیا۔ اور ماں کو یا ماموں کو اطلاع کئے بغیر یہ اپنے والد کے ایک پُرانے دوست فوج کے ایک پنشن یافتہ کپتان کے پاس گیا۔ اور انھیں منت سماجت سے کالج کے افسروں سے اپنی سفارش کرنے پر رضامند کر لیا۔ اور انہی کے توسط سے سالونیکا کے کیڈٹ اسکول کے داخلہ کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت حاصل کر لی۔ زبیدہ خانم کو جب اطلاع ملی تو بیچاری بہت گھبرائیں۔ لیکن آخر صبر کر کے بیٹھ رہیں۔ داخلہ کا امتحان مصطفیٰ نے بڑے اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ اور کیڈٹ اسکول میں اسے داخلہ مل گیا۔ ابتدائی تعلیم اگرچہ ان کی برائے نام تھی۔ لیکن ذہانت انھوں نے اس بلا کی پائی تھی کہ اس فوجی اسکول کو نصاب پر حاوی ہونے میں انھیں ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔ وہ بہت جلد اسکول کے ذہین اور اوّل نمبر کے لڑکوں میں شمار ہونے لگے۔ لیکن یہاں پہونچ کر مصطفیٰ میں ایک خصوصیت اور ظاہر ہوئی۔ یعنی یہ بلا کے حساس اور زود رنج ہو گئے تھے۔ ساتھیوں کی ذرا سی بات بھی ان کی طبیعت کے خلاف ہوتی تو بے تکلف ان سے الجھ پڑتے۔ اور کبھی کسی کی پرواہ نہ کرتے۔ ساتھی بھی اُن کی اس غصیل پن اور زود رنجی سے گھبرانے لگے تھے۔ اور ان سے زیادہ سروکار نہ رکھتے تھے۔ مدرسہ میں یہ ہمیشہ اوّل نمبر پر ہوتے۔ حساب میں یہ غیر معمولی تیز تھے۔ اور فوجی قوانین اور دوسری ہدایتیں انھیں ازبر یاد تھیں۔ اور قواعد اور پریڈ میں بھی یہ بہت چست اور چالاک رہتے۔ اسی مدرسہ میں ایک استاد تھے کپتان مصطفیٰ وہ ان کی ذہانتوں اور قابلیتوں سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔ اور انھیں بہت چاہتے تھے۔ انھوں نے ان کو چھوٹی کلاسوں کے بچوں کے پڑھانے کی اجازت بھی دیدی تھی۔ اور چونکہ خود ان کا نام بھی مصطفیٰ ہی تھا وہ انھیں مصطفیٰ کمال پکارا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی وقت سے یہ مصطفیٰ کمال ہو گئے۔

× × × ×

سترہ برس کی عمر میں انھوں نے سالونیکا کے جونیر فوجی اسکول کا امتحان بڑے امتیاز سے پاس کیا۔ اور حساب میں سارے اسکول میں اوّل آئے۔ مصطفیٰ کمال کیڈٹ ہو گئے۔

اور سینیئر گریڈ کی تعلیم کیلئے مُناستر کے فوجی کالج میں بھیج دیئے گئے۔ یہاں ان کی طبیعت کی خصوصیات زیادہ صفائی سے ظاہر ہوئیں۔ حساس اور زود رنج تو یہ بچپن ہی سے تھے۔ کالج کے زمانہ میں ان میں خود داری، خود اعتمادی اور کسی قدر اکھڑپن پیدا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے یہ اپنے ساتھیوں سے اور ساتھی ان سے بے تکلف نہ ہو سکے۔ البتہ اسکول کی طرح کالج کے استاد بھی ان سے خوش رہنے لگے۔ اس لئے کہ یہ اپنا کام اس قدر عمدگی سے کرتے تھے کہ ان کو کسی استاد کو ان کی شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا۔ کھیل سے البتہ انھیں کوئی رغبت نہیں تھی اس وقت جب کالج کے لڑکے کھیلا کرتے تھے یہ اپنا کمرہ بند کئے کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ اور کتابیں بھی وہ جن کا پڑھنا اس زمانہ میں ترکی میں منع تھا۔ یعنی۔ انقلابی!

اصل میں جس زمانہ میں یہ مُناستر کالج میں داخل ہوئے ہیں اسی زمانہ میں یونان نے ترکی کے جزیرہ کریٹ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اور ترکی نے یونان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اور مُناستر چونکہ بڑی فوجی چھاونی اور یونان کی سرحد پر واقع تھی اس لئے یہاں کی فوج کو تیاری کا حکم ملا۔ اور فوجیں یہاں سے محاذ پر جانی شروع ہوئیں۔ کالج کے لڑکوں کو بحث اور گفتگو کیلئے ایک موضوع ہاتھ آیا۔ دنوں اسی کے چرچے اور جنگ کے اسباب اور نتائج پر پیشگوئیاں ہیں۔ اور لڑکے تو کچھ دنوں بعد کھیل کود میں اسے بھول بھال گئے۔ لیکن مصطفےٰ کمال اس واقعہ سے ایک نئی اُدھیڑ بن میں پڑ گئے۔ ان کی بے چین فطرت اور متلاشی طبیعت نے انھیں جنگ اور اس کے نتائج انقلاب اور اس کے اسباب کی تلاش کے چکر میں لا ڈالا۔ اسی دُھن میں انھوں نے ہابس، اسٹوارٹ مل، والٹیر اور روسو کے انقلابی لٹریچر کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس زمانہ میں ترکی میں ان کتابوں کا پڑھنا جُرم تھا۔ اور مجرم کو جیل خانہ سے کم کی سزا نہ ملتی تھی لیکن اس ممانعت نے مصطفےٰ کمال کے اشتیاق کو اور بھڑکایا۔ اور انھوں نے کالج کے کمرہ میں چھپ چھپ کر یہ کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ اس چھپے چوری مطالعہ میں کالج کا ایک لڑکا

فتحی بھی ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ اور سارے کالج میں بس ایک یہی ان کا دوست اور راز داں بھی تھا۔ یہ وہی فتحی ہے جو بعد کو فتحی بے کے نام سے ترکی سیاست میں کافی مشہور ہو چکا ہے۔) اس انقلابی لٹریچر کا مصطفےٰ کمال پر یہ اثر پڑا کہ انھیں ترکی حکومت میں ہزاروں بُرائیاں نظر آنے لگیں۔ سلطان خود سر مطلق العنان۔ ترکی افسر راشی سب بے غیرت اور بے حمیت اور ترکی نظم و نسق نہایت فرسودہ اور بیکار محسوس ہونے لگا۔ غرض انقلابی لٹریچر نوجوان مصطفےٰ کمال کی تازہ خون میں جوش اور ناتجربہ کار دل اور دماغ میں ہیجان سا پیدا کر دیا۔ جب یہ زیادہ جوش میں آتے تو فتحی کے سامنے خلیفہ اور انکی خوشامدی اور راشی افسروں کیخلاف ایک زبردست جوشیلی تقریر کر ڈالتے۔ اسی زمانہ میں انھیں شعر و شاعری اور مضمون نگاری سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ فرصت کے وقت شعر بھی کہنے لگے لیکن ان اشعار میں بھی وہی انقلابی روح ہوا کرتی تھی۔ اور مضمون بھی لکھنے لگے تھے لیکن یہ مضمون روسو کی تعلیم کا ادھورا اور کچھ غیر مکمل سا نقش ہوا کرتے تھے۔

تین برس بعد مصطفےٰ کمال مُناستر کالج میں بھی بڑے اچھے نمبروں میں کامیاب ہو گئے۔ اور قسطنطنیہ کے جنرل اسٹاف کالج کے انتخاب میں آ گئے۔

مصطفےٰ کمال اب سب لفٹننٹ تھے اور مُناستر سے قسطنطنیہ کے حربیہ کالج میں آ گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر بیس برس کی تھی۔ حربیہ کالج میں ان کے انتخاب کے وقت مُناستر کالج کے پرنسپل نے ان کے متعلق یہ لکھا تھا "نہایت ذہین اور قابل نوجوان۔ لیکن سخت ضدی اور اکھڑ"

قسطنطنیہ مصطفےٰ کمال کیلئے نئی جگہ تھی۔ اور سالونیکا اور مُناستر کو اس سے کسی حیثیت سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ یہاں آ کر گویا مصطفےٰ کمال کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور انھیں ایسا معلوم ہوا کہ وہ اب دُنیا میں آئے ہیں۔ حربیہ کالج میں ان کی طرح کے ہر صوبہ کے منتخب اور قابل لڑکوں کا مجمع تھا۔ اور سب کے سب انہی کی طرح جوشیلی اور انقلابی طبیعت

کے نوجوان معلوم ہوتے تھے۔ اس ماحول میں مصطفٰے کمال کے اُن خیالات کو بڑی تقویت حاصل ہوئی جو مُناستر میں روسو اور والٹیر کے انقلابی لٹریچر کے پڑھنے سے پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ دنوں بعد انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ کالج میں "وطن" کے نام سے ایک خفیہ انجمن بھی بنی ہوئی ہے اور ہر ہفتہ چُھپوا اس کے اجلاس بھی ہوتے ہیں۔ اور ان اجلاسوں میں سلطان پر ان کے نظم ونسق پر، ملّاؤں، پیروں اور فقیروں پر گرماگرم بحثیں رہتی ہیں اور ان خرابیوں کو ملک سے دور کرنیکی تدابیر سوچی جاتی ہیں۔ اس انجمن کے ممبروں کو یہ حلف لینا ہوتا تھا کہ وہ سلطان کی خود مختاری اور مطلق العنانی کے خلاف جہاد کریگا۔ ملک میں ایک دستوری حکومت قائم کرنے میں مدد دیگا۔ ملّاؤں، پیروں اور فقیروں کے پنجے سے ملک اور اسلام کو چھڑائیگا اور ترکی خواتین کو صدیوں کی غلامی سے آزاد کرائیگا۔

مصطفٰے کمال اس انجمن کے ممبر ہو گئے۔ اس کے ہر اجلاس میں یہ نہایت جوشیلی تقریریں کرتے اور اپنی جوشیلی نظمیں سُناتے۔ ان کے شریک ہونیکے بعد "وطن" میں گویا جان سی پڑ گئی۔

لیکن "وطن" کی سرگرمیوں میں پڑ کر وہ اپنے حربیہ کالج میں آنیکا اصلی مقصد نہیں بھولے تعلیم میں ان کی محنت بدستور جاری رہی۔ اور سالونیکا اور مُناستر میں جو امتیاز انھیں اور لڑکوں پر حاصل تھا وہی یہاں بھی حاصل ہو گیا۔ اور دو برس میں انھوں نے جنرل اسٹاف کے سارے امتحان نہایت اعزاز و امتیاز سے پاس کر لئے اور اسپیشل جنرل اسٹاف گریڈ کی تعلیم کے لئے منتخب کر لئے گئے۔ اسپیشل جنرل اسٹاف کے گریڈ میں پہنچکر مصطفٰے کمال نے "وطن" کی تنظیم میں خوب سرگرمی دکھائی۔ اور اس کے سیکریٹری بن گئے۔ ان کی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان عبدالحمید کی خفیہ پولیس کو اس انجمن کا پتہ چل گیا۔ اور اس نے باب عالی میں اس کی رپورٹ کر دی۔ "وطن" حربیہ کالج کے اندر قائم تھی۔ اور کالج کے افسر بھی اس سے

اس سے واقف تھے۔ لیکن یہ چشم پوشی کرتے تھے۔ اس لئے کہ اس انجمن کے اصولوں سے دراصل انھیں بھی ہمدردی تھی۔ لیکن علانیہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ سلطان عبدالحمید کو جب اس انقلابی انجمن کا پرچہ لگا تو وہ بہت برافروختہ ہوئے اور انھوں نے اسماعیل حقی پاشا ملٹری ٹریننگ کالج کے ڈائریکٹر جنرل کو یہ حکم دیا کہ اس انجمن کو توڑ دو اور اس کے سارے ممبروں کو گرفتار کرلو۔ اسماعیل حقی پاشا نے رسمی تحقیقات کے بعد سلطان کو لکھ دیا کہ مدرسہ حربیہ میں ایسی کوئی انجمن نہیں ہے۔ اور ان نوجوانوں کو گرفتاری سے بچا لیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے مدرسہ حربیہ کے پرنسپل کو سختی کے ساتھ یہ حکم دے دیا کہ آئندہ اس انجمن کا کوئی جلسہ مدرسہ حربیہ میں نہ ہونے پائے۔ اتنے میں جنرل اسٹاف کا آخری امتحان بھی ہوگیا اور مصطفےٰ کمال اس آخری امتحان میں بھی بڑے اعزاز سے پاس ہوگئے۔ اور ۱۹۰۵ء میں انھیں کپتان بنا دیا گیا۔

باب (۳)

گرفتاری رہائی اور فوجی خدمات کی ابتدا

مصطفےٰ کمال نے حربیہ کالج کی تعلیم ختم کرلی تھی۔ لیکن ابھی کسی رجمنٹ میں ان کا تقرر نہیں ہوا تھا۔ تقرر سے پہلے چند ہفتے انھیں قسطنطنیہ میں گذارنے تھے۔ انھوں نے قسطنطنیہ میں ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ اور "وطن" کی طرف سرگرمی سے متوجہ ہو گئے۔ جس کمرہ میں یہ رہتے تھے وہی کمرہ "وطن" کا دفتر تھا۔ اور وہاں رات کو ان جیسے فوجی نوجوانوں کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ پولیس بھی اس خفیہ انجمن کی تاک میں تھی۔ اور ان نوجوانوں پر برابر اس کی نگرانی تھی۔ اور انھیں گرفتار کرنا بھی کچھ مشکل نہ تھا۔ اس لئے کہ یہ انتہائی جوشیلے نوجوان تھے۔ اور رازداری کی بہت کم پرواہ کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک رات جب "وطن" کا جلسہ ہو رہا تھا پولیس نے کمرہ کو گھیر لیا۔ اور سب ممبروں کو گرفتار کرلیا۔ ان ہی میں مصطفےٰ کمال بھی تھے۔

ان سب نوجوانوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ اور ان کے خلاف ثبوت فراہم ہونے لگا۔ مصطفےٰ کمال چونکہ اس خفیہ انجمن کے سکریٹری تھے۔ اس لئے ان کو سب سے الگ کر کے بند کیا گیا۔ ثبوت ان کے خلاف بہت کافی تھا اور سزا سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ان کی والدہ اور ہمشیرہ کو جب ان کے قید ہونے کا علم ہوا تو وہ سالونیکا سے قسطنطنیہ پہونچیں اور زبیدہ خانم نے جیل خانہ میں اپنے بچے سے ملنے کی لاکھ کوشش کی۔ لیکن ان کو اجازت نہ ملی۔

کئی ہفتے اسی رنگ میں گذر گئے۔ اور زبیدہ خانم کی ساری سعی سفارشیں بظاہر بیکار ہوگئیں اور انھیں یقین ہوگیا کہ مصطفےٰ کمال اور ان کے ساتھیوں کو سُلطان بجنت سزا دئیے بغیر نہ چھوڑے گا۔ لیکن عین اس مایوسی کے عالم میں ایک دن مصطفےٰ کمال کو جیل سے نکالا گیا۔ اور ترکی کے وزیر جنگ اسماعیل حقی پاشا کے حضور میں پیش کیا گیا۔ اسماعیل حقی نے ان کو مخاطب کرکے ایک چھوٹی سی نصیحت آمیز تقریر کی اور کہا کہ تم نے حربیہ کالج میں چونکہ غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کا اظہار کیا تھا اسی وجہ سے اس دفعہ تمھیں معاف کیا جاتا ہے اور دمشق میں تمھاری تعیناتی کی جاتی ہے۔ یاد رکھو تمھارا مستقبل خود تمھارے ہاتھ ہے۔ اگر اب کے تم کسی بیہودگی میں پکڑے گئے تو تمھارے ساتھ مطلق رعایت نہ ہوگی" اسی رات ایک جہاز . . . . پر مصطفےٰ کمال شام کی طرف روانہ ہوگئے۔ اور ان کی والدہ اور بہن کو بھی ان سے نہ ملنے دیا گیا۔

اپنی رجمنٹ میں شامل ہوتے ہی مصطفےٰ کمال کو دروزیوں کے خلاف اپنا دستہ لیجانے کا حکم ملا۔ یہ سرحدی قبیلے ترکی فوجوں کو بہت تکلیف دیا کرتے تھے۔ جم کے مقابلہ تو کرتے نہیں تھے۔ پہاڑوں میں چھپ چھپ کر حملے کیا کرتے تھے۔ مصطفےٰ کمال کے دستہ سے ان کا دوبدو مقابلہ نہ ہوسکا لیکن انھوں نے دروزیوں کو پہاڑوں میں بھگا دیا۔ میدانِ جنگ کا مصطفےٰ کمال کیلئے یہ پہلا تجربہ تھا۔ دروزیوں کی مہم سے واپس آکر کئی مہینے مصطفےٰ کمال نہایت خاموشی اور انہماک سے اپنی رجمنٹ میں کام کرتے رہے اور اسی دوران میں فوج کے سارے اعلیٰ افسروں اور ماتحت افسروں کا بھی جائزہ لیتے رہے۔ انھیں جلد ہی معلوم ہوگیا کہ یہاں بھی قسطنطنیہ کی طرح سارے افسر نوجوان اور انقلابی خیالات کے مالک ہیں۔ اس دریافت سے مطمئن ہوکر مصطفےٰ کمال نے یہاں بھی " وطن" کی ایک شاخ قائم کرنی چاہی۔ اور سالونیکا کے فوجی اسکول کے ایک ساتھی "مفید لطفی" کی مدد سے جو اسی فوج میں مقرر تھے

انھوں نے وطن کی داغ بیل ڈال دی۔ اور پوری سرگرمی سے فوج کو دستوری حکومت کے لئے تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد انھیں معلوم ہوا کہ سالونیکا میں انقلابی مرکز قائم ہو چکا ہے اور بہت جلد وہاں کے نوجوان افسر کوئی اقدام کرنیوالے ہیں۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی مصطفےٰ کمال نے سالونیکا تبادلہ کرانیکا تہیّہ کرلیا۔ اور تبادلہ کی کوشش سے پہلے چند دنوں کی چھٹی لی۔ اور بھیس بدل کر یہ پہلے مصر اور مصر سے یونان ہوتے ہوئے سالونیکا پہونچے اور وہاں یہ چند دنوں اپنی والدہ زبیدہ خانم کے ہاں چھپے رہے۔ اور ان ہی کی مدد سے انھوں نے سالونیکا کے اسٹاف میں تبادلہ کی کوشش شروع کردی۔ لیکن ابھی اس کوشش کا کوئی نتیجہ برامد نہ ہوا تھا کہ خفیہ پولیس کو ان کی موجودگی کا شبہ ہو گیا! اس کی رپورٹ قسطنطنیہ ہوئی۔ وہاں سے ان کی گرفتاری کا حکم آگیا۔ جیسے ہی مصطفےٰ کمال کو اس کی اطلاع ملی یہ فوراً سالونیکا سے یونان اور یونان سے جافہ پہونچ گئے۔ جافہ ان کے پہنچنے سے پہلے ان کی گرفتاری کا حکم پہونچ چکا تھا۔ لیکن وہاں کا کمانڈنٹ احمد بے جسے مصطفےٰ کمال کی گرفتاری کا حکم ملا تھا خود بھی "وطن" کا ممبر تھا اس نے ان کو جہاز سے اتار کر فوراً غازا بھیج دیا۔ جہاں دریوت کے سرحدی قبائل سے ترکی فوج دست وگریبان تھی۔ اور قسطنطنیہ کو لکھ بھیجا کہ خفیہ پولیس کو دھوکہ ہوا ہے۔ مصطفےٰ کمال تو غازا میں ہے اور شام کی سرحد سے باہر انھوں نے قدم بھی نہیں دھرا۔ معاملہ رفت گزشت ہوا۔ اس کے بعد ایک برس تک مصطفےٰ کمال نہایت خاموشی سے اپنی خدمات انجام دیتے رہے اور "وطن" کے متعلق ساری سرگرمیوں کو خیرباد کہہ دیا۔ ایک سال بعد انھوں نے پھر سالونیکا کے تبادلہ کی کوشش کی۔ اور اس دفعہ ان کا تبادلہ سالونیکا ہو گیا۔ اور حکم ملتے ہی یہ فوراً شام سے سالونیکا آ گئے۔

باب (۴)

اتحاد و ترقی سے اختلاف، انقلاب اور دستوری حکومت کا قیام

سالونیکا میں مصطفٰے کمال تھرڈ آرمی میں متعین کئے گئے۔ یہاں یہ اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ان کے گھر ہی میں دوست احباب کا مجمع ہوا کرتا تھا۔ اور انقلاب کے موضوع پر بے تکلف تبادلہ خیال رہتا تھا۔ زبیدہ خانم کو جب ان باتوں کی سُن گُن لگی تو وہ بہت گھبرائیں۔ اور مصطفٰے کمال کو سمجھانا چاہا۔ لیکن انھوں نے اس معاملہ میں والدہ کی مداخلت پسند نہ کی اور انھیں دھمکی دی کہ اگر آپ مجھے اس طرح ستائیں گی تو میں آپ سے الگ ہو جاؤں گا۔ ماںتا کی ماری بچاری زبیدہ خانم اپنے خودسر بیٹے کے اس جواب پر چپکی ہو گئیں۔ لیکن دل ہی دل میں اس کی سلامتی کی برابر دُعائیں مانگتی رہیں۔ ابتدا میں سالونیکا کے فوجی نوجوانوں نے مصطفٰے کمال کو شبہ کی نظروں سے دیکھا اس لئے کہ ان نوجوانوں کی سرگرمیوں کی اطلاع سلطان کو ہو چکی تھی۔ اور سلطان کے جاسوس بُری طرح ان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ اس لئے یہ شبہ تھا کہ کہیں مصطفٰے کمال بھی سلطانی جاسوس نہ ہوں۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کا یہ شبہ دور ہو گیا۔ اور "اتحاد و ترقی" کی خفیہ جماعت نے جس میں سالونیکا کے سارے جونیر فوجی افسر شامل تھے انھیں اپنی جماعت میں شامل ہونے کی دعوت دیدی۔

"اتحاد و ترقی" کی جماعت میں شامل ہو کر مصطفٰے کمال نے معلوم کیا کہ یہ جماعت صرف ترکوں کی نہیں ہے بلکہ اس میں یہودی اور یونانی بھی برابر کے شریک ہیں۔ اور اس جماعت

کا خرچ یہودی اٹھا رہے ہیں۔ اور ان کا مقصد یہ ہے کہ ترکی میں انقلاب پیدا کر کے اپنی مٹھی گرم کریں۔ یہ بات مصطفےٰ کمال کو پسند نہ آئی اور انھوں نے کچھ دنوں بعد "اتحاد و ترقی" کے مقصد میں اصلاح کرنی چاہی۔ وہ "اتحاد و ترقی" کو خالص ترکی جماعت بنانی چاہتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ ترکی کی اندرونی اصلاح اور دستوری حکومت سے زیادہ اس کا کوئی اور مقصد نہ ہو۔ اور اس میں غیر ترک شامل نہ کئے جائیں۔ لیکن یہ بات انور، نیازی، جمال اور جاوید کو پسند نہ آئی۔ یہی اس جماعت کے لیڈر بھی تھے اس لئے کہ انھیں اب مصطفےٰ کمال کی شخصیت سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر ہم نے ذرا بھی اس شخص کے خیالات کو جماعت میں راہ دی تو ہماری لیڈری خطرہ میں پڑ جائیگی اور ہم کمزور پڑ جائیں گے یہیں سے انور بے، نیازی بے، جمال پاشا، اور جاوید بے کو مصطفےٰ کمال سے ذاتی طور پر اختلاف ہوا۔ اور انھوں نے ان کو اتحاد و ترقی کی ایگزیکٹیو کمیٹی تک میں نہ آنے دیا۔ مصطفےٰ کمال نے بھی اس کو محسوس کیا کہ یہ لوگ انھیں اتحاد و ترقی کا معمولی ممبر رکھنا چاہتے ہیں جس کا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ جماعت کا کام متعیّن کرنا نہیں۔ ان کے جذبات کو ٹھیس لگی اور گو وہ انجمن اتحاد و ترقی کے برائے نام ممبر رہے لیکن ان کی دلچسپیاں اس سے کم ہو گئیں۔ بلکہ جب وہ کسی جلسے میں شریک ہوتے تو اس جماعت کے لیڈروں پر نہایت آزادی سے اور بڑی سختی سے نکتہ چینی کرتے۔ چنانچہ مصطفےٰ کمال کے اس طرز عمل سے آپکے اور اتحاد و ترقی کے لیڈروں کے درمیان مخالفت کی خلیج اور زیادہ وسیع ہو گئی۔

یکم جولائی ۱۹۰۸ء کو اس انجمن "اتحاد و ترقی" کے ممبروں نے یکایک سلطان کیخلاف بغاوت کر دی اور دستوری حکومت کا اعلان کر دیا۔ اس بغاوت میں انور۔ نیازی۔ جمال اور جاوید شریک تھے مصطفےٰ کمال نے اس میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن انھوں نے انقلابیوں کی مخالفت بھی نہیں کی۔ اگرچہ اس بغاوت کی اچھی طرح تیاریاں نہیں کی گئی

تھیں۔ لیکن سلطان کے خلاف چونکہ سارے ملک میں بد اعتمادی اور بے اطمینانی سی پیدا ہو گئی تھی۔ اور خود فوج کے سپاہیوں کو موجودہ دور حکومت سے شکایت تھی ان عزیبوں کو نہ وقت پر تنخواہ ملتی تھی اور نہ ان کے راشن کا معقول انتظام تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو فوجیں باغیوں سے مقابلہ کرنیکو بھیجی گئیں وہ خود ان کے ساتھ ہوتی گئیں۔ یہ حال دیکھکر سلطان عبدالحمید نے ۲۳۔ جولائی ۱۹۰۸ء کو نوجوانوں کے آگے ہتیار ڈال دیئے۔ اور دستوری حکومت کا اعلان کر دیا۔ باغی فوجیں فاتحانہ انداز میں سالونیکا واپس ہوئیں۔ اور انور بے نے سالونیکا میں سلطان کی طرف سے دستوری حکومت کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ اس موقع پر اور فوجی افسروں کے ساتھ جنھوں نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا تھا مصطفےٰ کمال بھی شامل تھے۔

دستوری حکومت کے اعلان کے ساتھ ہی برلن اور پیرس کے پناہ گزیں ترک قسطنطنیہ واپس آگئے۔ اور دولِ یورپ کے سفیر بھی جنھیں سلطان عبدالحمید نے قسطنطنیہ سے نکالا تھا۔ واپس آگئے۔ اور نئے سرے سے پھر باقاعدہ ترکی حکومت قائم ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد مصطفےٰ کمال طرابلس کی فوج میں میجر بنا کر بھیج دیئے گئے۔ انور بے کو برلن کا سفیر بنا دیا گیا۔ نیازی البانیہ بھیجے گئے۔ جہاں وہ قتل ہو گئے۔ دستوری حکومت کے بحران سے ابھی اچھی طرح نجات نہ ملی تھی کہ آسٹریا نے ترکی کی مغربی سرحد پر چھاپہ مارا۔ اور بوسینا اور ہرزگوینا چھین لیا۔ یونان نے جزیرہ کریٹ پر قبضہ کر لیا۔ اور بلغاریہ نے اٹلی کی شہ پا کر اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ان پے در پے واقعات سے سلطان عبدالحمید کو پھر ہاتھ پیر مارنے کا موقع مل گیا۔ اور سلطان کے حمایتیوں نے دستوری حکومت کے خلاف یہ پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ دستور کے حمایتی یہودی اور یونانی ہیں جو ترکی مسلمانوں اور ترکی سلطنت کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس پروپیگنڈے نے جو مذہب کے نام پر اور مذہبی رنگ میں کیا گیا تھا عوام

پر بہت اثر کیا۔ اور عام لوگ دستوری حکومت کے خلاف ہو گئے۔ بلکہ فوجوں نے بھی اپنے افسران کے خلاف بغاوت کر دی۔ افسروں کو یا تو قید کر دیا یا نظر بند کر دیا۔ "اتحاد و ترقی" کے ممبروں کو گھیر لیا۔ بہت سے تو بھاگ گئے اور کئی ان کے ہاتھ سے مارے گئے۔ بظاہر دستوری حکومت اور دستور کے حمایتی دونوں ختم ہو گئے۔

انجمن اتحاد و ترقی کے ممبر قسطنطنیہ سے بھاگ کر مقدونیہ پہونچے اور انھوں نے تھرڈ آرمی کے کمانڈنگ افسر محمود شوکت پاشا سے امداد کی درخواست کی۔ محمود شوکت پاشا ادھیڑ عمر کے عربی النسل جنرل تھے۔ مگر تھے انجمن اتحاد و ترقی ہی کے ممبر۔ انھوں نے کچھ تھوڑے سے پس و پیش کے بعد قسطنطنیہ پر چڑھائی کرنے کی حامی بھر لی۔ اسی اثنا میں مصطفےٰ کمال طرابلس سے اور انور برلن سے آ گئے۔ محمود شوکت پاشا نے سکنڈ اور تھرڈ آرمی سے قسطنطنیہ پر چڑھائی کر دی۔ ہراول کے دستہ کے فوجی کمانڈر مصطفےٰ کمال تھے۔ اور اسی فوج کے ایک دستہ کی کمان انور بے کے ہاتھ میں تھی۔ اس فوج نے قسطنطنیہ پہونچتے ہی مخالفین دستور کو چند دنوں میں کاٹ کر رکھ دیا۔ اور عبدالحمید کو نظر بند کر کے سالونیکا بھیجدیا۔ اور ان کی جگہ محمد ارشاد کو تخت نشین کر دیا انور پاشا کا عروج اسی واقعہ سے شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ اس فوج میں جس نے مخالفین دستور کا خاتمہ کیا مصطفےٰ کمال کی حیثیت چیف آف دی اسٹاف کی تھی لیکن چونکہ نمود و نمائش کے یہ کبھی خواہاں نہیں رہے۔ اور نہ اس موقع پر انھوں نے پبلک میں ظاہر ہو کر اپنے کارناموں کا اظہار کیا۔ اس لئے پبلک کی نظر اُن پر نہ پڑی۔ اور انور بے اور ان کے ساتھی جمال اور جاوید نے محمود شوکت پاشا کے ساتھ حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اور مصطفےٰ کمال پھر اپنی جگہ مقدونیہ میں آ گئے۔

فوج میں واپس آنیکے بعد مصطفےٰ کمال کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ اپنی فوجی ذمہ داریوں کو

پورا کر کے اپنی فرصت کا سارا وقت نپولین کے مطالعہ میں صرف کیا کرتے اور بظاہر سب قسم کی تحریکوں سے الگ ہو گئے تھے۔ لیکن ترکی کے نظم ونسق سے وہ اب تک مطمئن نہیں تھے۔ انھیں اس دستوری حکومت میں بھی بہت کچھ کمی نظر آ رہی تھی۔ وہ انور اور ان کے ساتھیوں کو حکومت کے ناقابل سمجھتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں جنرل علی رضا کے اسٹاف میں ایک فوجی مشن کے سلسلہ میں یہ فرانس گئے۔ اور وہاں Pecordy میں فوجی نمائش میں حصّہ لیا۔ جنرل علی رضا نے ترکی واپس آنیکے بعد ان کے متعلق یہ رپورٹ کی تھی: "مصطفےٰ کمال نے فوجی مظاہروں میں بڑی قابلیت کا ثبوت دیا۔ اور یہ نہایت دور اندیش اور اچھے جرنل ثابت ہوں گے۔"

فرانس سے واپس آ کر مصطفےٰ کمال کی وہ خاموشی جاتی رہی جو دستوری حکومت کے قیام کے بعد انھوں نے اختیار کر رکھی تھی۔ اور مقدونیہ میں انھوں نے پھر "وطن" کی داغ بیل ڈال دی۔ اب یہ سینئر افسر یعنی کرنل تھے۔ فوج میں ان کا اثر بھی بڑھ .... گیا تھا۔ اور ان کی فوجی قابلیت کا شہرہ بھی ہونے لگا تھا۔ اس لئے لوگ اب زیادہ تعداد میں ان کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ انھوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر موجودہ دستوری حکومت کی بُرائیوں پر آزادی سے تنقید شروع کر دی۔ اور آہستہ آہستہ اپنے ہمدردوں کا گروہ بڑھانے لگے۔ قسطنطنیہ میں جب مصطفےٰ کمال کے طرز عمل کی اطلاع پہونچی تو محمود شوکت پاشا نے جو اس وقت وزیر اعظم تھے اور مصطفےٰ کمال کو اچھی طرح جانتے تھے ان کا تبادلہ سالونیکا کر دیا۔ یہاں پہونچنے کے بعد بھی ان کے طرز عمل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ موجودہ حکومت کی مخالفت میں اور شدّت پیدا ہو گئی۔ خفیہ جلسے زیادہ تیزی سے ہونے لگے۔ اور فوج میں بے اطمینانی بڑھتی شروع ہو گئی۔ محمود شوکت پاشا کو جب یہ اطلاع ملی کہ مصطفےٰ کمال یہاں بھی نچلے نہ بیٹھے تو انھوں نے ان کو فوراً قسطنطنیہ طلب کیا۔ انجمن اتحاد و ترقی نے مطالبہ کیا تھا

کہ مصطفےٰ کمال کو سزا ملنی چاہیئے۔ لیکن مصطفےٰ کمال کی فوجی خدمات نقص سے پاک تھیں۔ اور اپنی فوج میں ان کا اثر بھی خاصا بڑھ گیا تھا۔ اس لئے ان کی سزا کا کوئی موقع نہیں تھا محمود شوکت پاشا نے ان کو سزا تو نہیں دی البتہ فوج کی کمان ان سے لے لی۔ اور قسطنطنیہ میں دفتر جنگ میں ان کو مقرر کر دیا۔ کیونکہ یہی ایک صورت ایسی تھی جس سے مصطفےٰ کمال کو حکومت کے خلاف سرگرمیوں سے روکا جا سکتا تھا۔ دفتر جنگ میں انھیں ذمہ داری کا کام تو دیا نہیں گیا۔ برائے نام کچھ یونہی سا کام ان کے سپرد کیا۔ لیکن حاضری ان کی کڑی رکھی۔ مطلب صرف یہ تھا کہ اپنے دوستوں سے جدا کر کے ان پر سخت نگرانی رکھی جائے۔

قسطنطنیہ پہونچ کر مصطفےٰ کمال کو سیاست میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ اس وقت وہاں وزارت کیلئے ریشہ دوانیاں ہو رہی تھیں۔ مختلف پارٹیاں اپنے اپنے مفاد کیلئے کام کر رہی تھیں۔ جرمن دار السلطنت پر چھائے ہوئے تھے۔ خاصکر فوج میں ان کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ یہ ترکی فوج کے مشیر تھے۔ قسطنطنیہ کا جرمن سفیر واگن ہائم انور پاشا کا بے تکلف دوست اور ان پر بہت حاوی تھا۔ انور کے مخالفوں نے بھی ایک پارٹی بنائی تھی اور یہ پارٹی جرمنوں کے سخت خلاف تھی۔ وہ ترکی میں جرمنی اقتدار دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی مصطفےٰ کمال کا رجحان اس دوسری پارٹی کی طرف ہو گیا۔ اور اس پارٹی نے بھی انھیں کام کا آدمی سمجھ کر اپنے میں شامل کر لیا۔ لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ مصطفےٰ کمال معمولی سیاستداں کی طرح اس پارٹی میں شامل نہیں ہوئے بلکہ ان کا طرز عمل سیاستدانوں سے قطعی مختلف بے لوث اور اکھڑ قسم کا تھا۔ وہ بے انتہا حساس اور بلا کے خود دار واقع ہوئے تھے۔ نکتہ چینی اور اعتراض کے وقت تسمہ نہ لگا رکھتے تھے۔ اور سازش کا ان میں مادہ مطلق نہ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اس پارٹی میں پہونچ تو گئے لیکن اپنی جگہ اس میں نہ بنا سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سالونیکا میں تو مصطفےٰ کمال کو جاننے والے کئی تھے لیکن قسطنطنیہ میں

ان کا کوئی دوست نہ تھا۔ اور پارٹی کے ممبران کی طبیعت سے ناواقفیت کے باعث اُن سے بے تکلف نہ ہو سکے۔

بہرحال اس پارٹی میں پہونچ کر مصطفےٰ کمال کو ترکی سیاست کے مطالعہ کا موقع ضرور ملا۔ اور انھوں نے اس سے فائدہ بھی اٹھایا۔ لیکن خود ہمیشہ ایک سیاست داں کے بجائے سپاہی ہی بنے رہے۔ اکھڑ، سخت ضدّی اور ہٹیلے۔

ابھی مصطفےٰ کمال کو قسطنطنیہ آئے ہوئے مشکل سے ایک برس گذرا تھا کہ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے بغیر کسی اطلاع کے طرابلس میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ اور چند شہر اور بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔

باب (۵)

جنگ طرابلس اور بلقان

طرابلس میں جنگ چھڑتے ہی قسطنطنیہ میں بے چینی پیدا ہوگئی۔ اور ترکی افسر اور سپاہی طرابلس پہونچنے کے لئے بے چین ہونے لگے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ترکی کا کوئی بحری بیڑہ باقی نہ رہا تھا اور مصر پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ جہاں سے وہ ترکوں کو گذرنے نہیں دیتے تھے۔ مصطفےٰ کمال نے سیاست کا خیال چھوڑ دیا اور اپنے دو دوستوں کے ساتھ شام ہوتے ہوئے بھیس بدل کر اسکندریہ پہونچے۔ یہاں انگریزوں نے ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ اور اسکندریہ کی سرحد کو پار کرکے طرابلس پہونچنا مشکل ہوگیا تھا۔ مصطفےٰ کمال نے عربوں کا بھیس بدلا اور اپنے دونوں دوستوں کو علیحدہ علیحدہ راستوں سے سرحد کی طرف بھیجا اور خود ریل میں سرحد کی طرف چلے لیکن سرحد پر جو افسر تعینات تھے انھیں اسکندریہ کے برطانوی کمانڈر نے پہلے ہی مصطفےٰ کمال کے وہاں پہونچنے کا حال بتا دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ انھیں طرابلس میں نہ جانے دو بلکہ گرفتار کرکے اسکندریہ واپس کر دو۔ مصطفےٰ کمال نے بھیس تو عربوں کا سا بدلا تھا لیکن انکی بھوری آنکھیں اور ترکوں جیسے خط وخال صاف نمایاں تھے۔ عربی بھی نہ بول سکتے تھے لیکن خوش قسمتی سے جو افسر سرحد کی نگرانی پر مقرر تھا وہ مصری مسلمان تھا اگرچہ اس نے ایک ہی نظر میں مصطفےٰ کمال کو پہچان لیا۔ لیکن اس نے مصطفےٰ کمال کی بجائے ایک اور بھوری آنکھوں والے مسافر کو اپنے کمانڈر کے حکم کی تعمیل میں گرفتار کرلیا۔ اور مصطفےٰ کمال کو سرحد پار کرنے کی اجازت دے دی۔

سرحد پار کر کے مصطفےٰ کمال فور آترکی چھاؤنی میں پہونچے۔ انور پاشا یہاں پہلے ہی سے موجود تھے۔ انھوں نے مصطفےٰ کمال کو اپنی ماتحتی میں ایک حصہ فوج کی کمان دیدی اطالوی فوجوں نے اپنے جنگی بیڑوں کی مدد سے بندرگاہ اور اس کے قریب کے شہر فتح کرلئے تھے۔ لیکن آگے وہ قدم نہ بڑھا سکے۔ ترکی فوجیں ان کے مقابلہ کو تیار کھڑی تھیں۔ اور ان کے پیچھے مراقشی عربوں کے جھنڈ کے جھنڈ جہاد کے نشہ میں سرشار اطالوی فوجوں پر جا پڑنے کو بیتاب پھر رہے تھے۔ یہ حال دیکھکر اٹلی کے سارے منصوبے ختم ہو گئے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر اندر طرابلس کو فتح کرلے گا۔ لیکن اب ایک برس میں بھی کامیابی کی امید نظر نہ آتی تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں طرابلس کی فوجوں کے سپہ سالار انور تھے اور مصطفےٰ کمال ان کی ماتحتی میں کام کر رہے تھے۔ لیکن انور اور مصطفیٰ کمال میں اختلاف یہاں بھی باقی تھا انور پاشا کی بہت کم اسکیمیں ایسی ہوتی تھیں جن پر مصطفیٰ کمال اعتراض اور نکتہ چینی نہ کرتے ہوں لیکن فوجی نظم وضبط کو انھوں نے کبھی اپنے ذاتی اختلاف کی نذر نہیں کیا۔ انھوں نے انور پاشا کے احکام کی برابر تعمیل کی لیکن اختلاف دکھا کر اعتراض کرکے۔ اور یہ بات ایسی نہ تھی کہ ان دونوں کے تعلقات اچھے رہ سکتے۔ چنانچہ سالونیکا میں جو تعلقات میں کشیدگی کی ابتدا ہوئی وہ طرابلس کے میدان میں انتہا کو پہونچ گئی۔ اور اس نے ایک مستقل رنجش کی صورت اختیار کرلی۔ طرابلس ہی کے میدان میں ان دونوں کی طبیعتوں کا فرق بھی ظاہر ہو گیا۔ حساس دونوں بلا کے تھے۔ ارادہ کے پکّے بھی تھے۔ نڈر اور بیخوف بھی تھے۔ لیکن ان مشترک صفات کے ساتھ اختلاف یہ تھا کہ انور جاہ طلب، جلد باز اور متلون قسم کے جنرل تھے اور چاہتے تھے کہ ہر وقت اُن کے آگے دربار لگا رہے۔ اور وہ حکم احکام نافذ کرتے رہیں۔ اور مصطفےٰ کمال خاموش طبع سنجیدہ اور مستقل مزاج واقع ہوئے تھے۔ وہ کوئی کام بے سوچے سمجھے کرنا پسند نہ کرتے تھے اور عالی شان خیمہ میں دربار لگانے کے بجائے وہ سپاہیوں کے خیمہ میں نہایت سادگی سے

رہتے اور دن بھر اور رات کا بڑا حصہ دشمن کی جنگی چالوں پر غور کرنے پر صرف کر دیا کرتے تھے۔

طرابلس کے میدان میں اطالوی، ترکی اور افریقی فوجوں کو ایک دوسرے کے مقابل پڑے ہوئے ایک ہفتہ کی بجائے ایک سال ہو گیا۔ نہ ترکی فوجیں اطالوی فوجوں کو بندر گاہ سے سمندر میں دھکیل سکیں اور نہ اطالوی ترکوں کو اپنے راستہ سے ہٹا سکے۔ صورتِ حال اب اٹلی کیلئے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ جس زعم میں اس نے طرابلس پر فوج کشی کی تھی وہ باطل ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے یہ خیال بھی نہ تھا کہ ترک اس قدر استقامت دکھائیں گے۔ لیکن اب جبکہ وہ جنگ میں پھنس ہی چکا تھا وہ ہر ممکن ذریعہ سے اسے فتح کرنے کی چالیں سوچنے لگا۔ بالآخر اس نے ترکی کو دبانے کی ایک تجویز سوچ لی۔ اور وہ یہ کہ بلغاریہ، سرویا، مانٹی نگرو اور یونان کو ترکی پر حملہ کروا دیا۔ اور اس طرح ترکی کو بے بس کر کے ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو ترکی سے طرابلس کے بارے میں صلح کر لی۔ اس صلحنامہ کی رُو سے طرابلس کی خود مختاری کا اعلان کر دیا گیا۔ اور اٹلی نے وہاں اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ ترکی فوجیں طرابلس سے ہٹالی گئیں۔ سلطان کا مذہبی اقتدار بظاہر وہاں برقرار رہا۔ اور ایک ترک سفیر طرابلس کے مستقر حکومت میں ترکی مفاد کی حفاظت کیلئے مقرر کر دیا گیا۔

بلقانی ریاستوں میں سب سے پہلے مانٹی نگرو نے ۸۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ اور اس کے دو دن بعد سرویا، بلغاریہ اور یونان نے اعلانِ جنگ کر دیا۔ ترکی کیلئے یہ بہت نازک موقع تھا۔ طرابلس کے سارے ترکی افسر قسطنطنیہ واپس ہو رہے تھے۔ مصطفےٰ کمال بھی اپنی طرابلس کی فوجی کمان عربوں کو دیکر فرانس کے راستے قسطنطنیہ

کی راہ لی۔ لیکن یہ راستہ ان کے لئے بند تھا۔ اس لئے انھیں آسٹریا جانا پڑا۔ اور آسٹریا سے وہ رومانیہ آئے اور رومانیہ سے دسمبر ۱۹۱۲ء کے پہلے ہفتہ میں قسطنطنیہ پہونچ گئے۔

یہاں انھوں نے بڑی ابتری دیکھی۔ بلقانی فوجیں ہر محاذ پر ترکوں کو دبا رہی تھیں۔ سرویہ والے بے تحاشا شمال میں بڑھے چلے آرہے تھے۔ یونانیوں نے سالونیکا فتح کرلیا تھا۔ بلغاریہ کی فوجیں یلغار کرتی ہوئی قسطنطنیہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ایڈریانوپل کے ناقابلِ تسخیر قلعہ کو انھوں نے محصور کر رکھا تھا۔ غرض یوربین ترکی ہر طرف سے نرغہ میں تھی اور اس کے بچنے کی امید نہیں رہی تھی۔

مصطفٰے کمال جیسے ہی قسطنطنیہ پہونچے اور دفترِ جنگ میں اپنی اطلاع کرائی انھیں فوراً گیلی پولی کی فوج کا چیف آف دی اسٹاف بنا کر بھیجدیا گیا۔ یہ بڑا اہم مقام تھا۔ اگر بلغاری اس مقام کو لے لیتے تو قسطنطنیہ ایشیا سے جُدا ہو جاتا۔ اور اس طرف سے کوئی امداد نہ مل سکتی۔ مصطفٰے کمال ابھی اپنی فوج میں پہونچے ہی تھے کہ بلغاری فوجوں نے جنرل ساوا کی کی ماتحتی میں گیلی پولی پر حملہ کردیا۔ مصطفٰے کمال نے شب و روز کی سرگرمی اور مستعدی سے گیلی پولی کی فوج کو مدافعت کیلئے تیار کیا۔ اور بلغاری فوج کے متواتر حملوں کو نہایت کامیابی سے روکے رکھا اور باوجود سخت اور شدید لڑائی کے بلغاریوں کو ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔

اس وقت قسطنطنیہ میں کامل پاشا کی وزارت تھی۔ یہ پاشا پُرانے طرز کے مُدبّر و میں تھا اور انگلستان پر اس کو بڑا اعتماد تھا۔ اس کو یقین تھا کہ انگریز بلقان میں جنگ نہ ہونے دینگے۔ لیکن جب اس کے باوجود جنگ چھڑ گئی ادھر ہر طرف سے ترکی نرغہ میں آگئی جب بھی اس کی آنکھیں نہ کھلیں۔ یہ اس وقت بھی یہی آس لگائے بیٹھا تھا کہ انگریز ترکی کے لئے مسیحائی کریں گے۔

چنانچہ فروری ۱۹۱۳ء میں جب دولِ یورپ نے ایک کانفرنس کے ذریعہ ترکی اور بلقان

کے جھگڑے کو طے کرانا چاہا۔ تو بلقانی ریاستوں نے اس کانفرنس میں یہ مطالبہ کیا کہ سوائے قسطنطنیہ کے سارا یورپین ترکی ہمیں دیدیا جائے۔ چنانچہ نام نہاد صلح کانفرنس نے بھی یہی تجویز منظور کردی۔ اس پر ترکی مدبّروں میں پھوٹ پڑی۔ کامل پاشا وزیر اعظم اس شرط پر صلح کرنے کو تیار ہوگیا۔ لیکن نوجوان پارٹی بگڑ بیٹھی۔ انور جو اسی دوران میں طرابلس سے واپس آگئے تھے انھوں نے انجمن اتحاد و ترقی کو پھر سے جگایا۔ اور چند نوجوانوں کو اکٹھا کر کے عین اس وقت جبکہ کامل پاشا کی وزارت اس صلحنامہ پر دستخط کرنیوالی تھی۔ اجلاس میں گھس پڑے۔ ناظم پاشا وزیر جنگ نے انھیں روکنا چاہا۔ انور نے ریوالور سے انھیں وہیں ٹھنڈا کر دیا۔ کامل پاشا اور ان کے حمایتی یہ رنگ دیکھکر اجلاس سے بھاگ گئے۔ انور نے فوراً وزارت پر قبضہ کر لیا۔ اور محمود شوکت پاشا کو وزیر اعظم بنا کر خود، طلعت، جمال اور جاوید کے ساتھ وزارت کے مختلف شعبوں کو سنبھال لیا۔ اور بلقان کے صلحنامہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

اب ایڈریانوپل کو بلغاریہ کی فوجوں سے بچانا بہت ضروری تھا۔ انور فوراً سَتلجہ پہونچے اور وہاں انھوں نے گیلی پولی کی فوج کے کماندار مصطفٰے کمال اور دوسرے افسروں سے بلغاری فوج پر حملہ کرنیکا مشورہ کیا۔ مصطفٰے کمال نے اس حملہ کی سختی سے مخالفت کی۔ ان کی رائے میں یہ حملہ ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ اور ناکامی کی صورت میں ترکی کو انہی شرطوں پر دستخط کرنیکے سوا چارہ نہ تھا جو بلقان والوں نے کامل پاشا کے آگے پیش کی تھیں۔ اور جن کو انور نے رَد کر دیا تھا۔ لیکن مصطفٰے کمال کی مخالفت پر انور بگڑ بیٹھے۔ وہ ان کے افسر تھے۔ اور مصطفٰے کمال کو ان کی تجویز پر اعتراض کرنیکا کوئی حق نہ تھا۔ مصطفٰے کمال نے مجبور ہو کر انور کی سکیم کے مطابق ایڈریانوپل کی بلغاری لائن پر حملہ کیا۔ لیکن بلغاریوں نے ۔ ۔ ۔ ۔ ترکوں

کو جوابی حملے میں پسپا کر رکھدیا۔ اور ایڈریانوپل جو اب تک محصور تھا بلغاریوں کے قبضہ میں آگیا۔ اور انور کی حکومت کو اسی معاہدہ پر دستخط کرنے پڑے جسکو اس نے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا تھا۔

مصطفےٰ کمال دل برداشتہ قسطنطنیہ واپس آگئے۔ اور ابھی ترکی اپنی شکست کے بعد سنبھالا ہی لے رہی تھی کہ خود بلقانی ریاستوں میں ترکی مالِ غنیمت کی تقسیم پر جھگڑا ہوگیا۔ اور بلغاریہ سروبہ اور یونان پر چڑھ دوڑا۔ دشمنوں کو آپس میں ہی لڑتا دیکھکر انور پاشا نے بڑی پھرتی سے کام لیا۔ اور مصطفےٰ کمال کے فوجی دستہ کو فوراً ایڈریانوپل فتح کرنیکا حکم دیدیا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۱۳ء میں ایڈریانوپل پر پھر ترکوں کا قبضہ ہوگیا۔ اور اگست ۱۹۱۳ء میں ایک اور معاہدہ ہوا جس کے بعد جنگ بلقان ختم ہوگئی۔ اور ترکی کے پاس یورپین علاقوں میں ایڈریانوپل اور گیلی پولی باقی رہ گئے۔ اور باقی حصوں کی تکہ بوٹی ہوگئی۔

باب (۶)

نوجوان ترکوں کی حکومت سے اختلاف اور بلغاریہ کی سفارت

ایڈریانوپل کو دوبارہ فتح کر لینے کے بعد نوجوان ترکوں کا اثر قسطنطنیہ میں بہت بڑھ گیا۔ اس وقت محمود شوکت پاشا وزیر اعظم تھے۔ عزت پاشا وزیر حرب اور انور پاشا حاکم قسطنطنیہ۔ اور طلعت، جاوید اور جمال بھی وزارت میں شامل تھے لیکن مصطفیٰ کمال فتح ایڈریانوپل کے بعد کسی اسٹیج پر نہیں ظاہر ہوئے۔ ایڈریانوپل سے واپسی کے بعد مصطفیٰ کمال کو زبیدہ خانم اور اپنی بہن "مقبولہ" کی تلاش ہوئی۔ جو یونانیوں کے ہاتھوں سالونیکا فتح ہو جانے کے بعد قسطنطنیہ آگئی تھیں۔ اور انہی کے ساتھ یہ قسطنطنیہ میں بظاہر بیکار زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن حقیقتاً یہ بیکاری کی زندگی نہیں تھی۔ بلکہ اس زمانہ میں یہ ترکی سیاست کا گہرا مطالعہ کرتے رہے۔ انھوں نے موجودہ حکومت کی بے انتظامی کا بڑی دقت نظری سے جائزہ لینا شروع کیا اور بڑی آزادی سے اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کر دیئے۔ ۱۹۱۴ء کے شروع میں محمود شوکت پاشا ایک شخص کی گولی سے ہلاک ہو گئے۔ عزت پاشا نے وزارت حرب سے استعفیٰ دیدیا۔ طلعت بے وزیر اعظم، انور وزیر حرب، جاوید وزیر فنانس اور جمال بے وزیر داخلہ مقرر ہو گئے۔ گویا پوری حکومت نوجوان پارٹی کے ہاتھوں میں آگئی۔ مگر اس موقع پر بھی مصطفیٰ کمال کا نام کہیں نظر نہ آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مصطفیٰ کمال صحیح معنوں میں اتحاد و ترقی کے ممبر نہیں تھے۔ اور انور پاشا کو ان سے ایک قسم کا عناد سا ہو گیا تھا۔ اس لئے نئی حکومت میں نہ صرف یہ کہ انھیں کوئی عہدہ نہیں دیا گیا

بلکہ ان کو کسی فوج کی کمان پر بھی مقرر نہیں کیا گیا۔ انور پاشا نے وزیر حرب ہوتے ہی فوج کی نئے سرے سے تنظیم شروع کر دی۔ اور جرمنوں کو فوجی مشیر کی حیثیت سے طلب کرنا شروع کر دیا۔ اور جنرل لیمان فان سنڈرس کو طلب کر کے ترکی سپاہیوں کی تربیت اس کے سپرد کر دی۔ انور پاشا کی اس حرکت پر مصطفےٰ کمال سے ضبط نہ ہو سکا اور انھوں نے علانیہ انور پاشا اور ان کی جرمن نوازی کی مذمت شروع کر دی۔ یہ بات انور پاشا کو ناگوار گذری۔ اور انھوں نے مصطفےٰ کمال کو قسطنطنیہ سے نکال باہر کرنیکا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ چند دنوں بعد فتحی بے سفیر رومانیہ کے نائب کی حیثیت سے مصطفےٰ کمال کو صوفیہ بھیج دیا۔

مصطفےٰ کمال بیکاری سے گھبرا رہے تھے۔ فوراً صوفیہ روانہ ہو گئے۔ فتحی بے ان کے دوست تھے اس لئے دونوں میں آرام سے گذرنے لگی۔ صوفیہ میں مصطفےٰ کمال اور بلغاریہ کے کمانڈر انچیف سے بہت جلد دوستی ہو گئی۔ اور جنرل ساوادسی بھی دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے۔ یہ وہی جنرل ساوادتھے جن سے گیلی پولی کی جنگ میں مصطفےٰ کمال کا مقابلہ ہو چکا تھا۔ یہ مصطفےٰ کمال کی فطرت تھی کہ وہ اپنے بہادر دشمن کی قدر کرتے تھے لیکن صوفیہ میں مصطفےٰ کمال کو مصروف رکھنے والا کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ اور یہ ان کی طبیعت کے خلاف تھا کہ وہ نچلے بیٹھتے۔ مگر مجبور تھے۔ انور پاشا کی حکومت انھیں پسند نہ کرتی تھی اور اس کی بھی روادار نہ تھی۔ کہ وہ قسطنطنیہ میں رہیں۔ مجبوراً انھیں صوفیہ میں رہنا پڑا۔ یہاں یہ باقاعدہ فوجوں کی پریڈ اور ترتیب دیکھتے یا کتابیں پڑھتے۔ ان کا مشغلہ کتب بینی بہت بڑھ گیا۔ اور وہ رات اور دن اسی میں مصروف رہنے لگے۔

باب (۷)

جنگ عظیم اور گیلی پولی کا معرکہ

اگست ۱۹۱۴ء میں سرجیو میں آسٹریا کے ولی عہد آرچ ڈیوک قتل کر دیئے گئے اسی کو وجہ بنا کر آسٹریا اور آسٹریا کے ساتھ جرمنی نے سردیا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ فرانس، برطانیہ، روس اور اٹلی بھی آہستہ آہستہ میدان میں آتے گئے۔ ابتدا میں ترکی اور بلغاریہ دونوں غیر جانب دار رہے۔ ترکی اس وقت جنگ بلقان سے فارغ ہو کر سستا رہی تھی۔ ریاستہائے بلقان سے شکست کھا جانے کی وجہ سے دول یورپ میں اس کی ساکھ بھی بگڑ گئی تھی۔ اور برطانیہ اور فرانس کی نظر میں ترکی کی فوجی قوت کی اہمیت ختم ہو گئی تھی۔ اس لئے جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو برطانیہ نے ترکی سے صرف یہ درخواست کی کہ وہ غیر جانب دار رہے۔ لیکن جرمنی نے جس کا اثر انور پاشا کی وزارت حرب کے زمانہ سے بہت بڑھ گیا تھا اور ترکی فوج میں بکثرت جرمن افسر نظر آنے لگے تھے ترکی پر زور ڈالنا شروع کیا کہ وہ جرمنی کے ساتھ ہو جائے۔ ایک طرف برطانیہ اور فرانس کی سرد مہری اور دوسری طرف جرمنی کی اس گرم جوشی کو دیکھکر نوجوان ترکوں کا دل جرمنی کیطرف پسیج گیا۔ اگرچہ ترکی کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھکر فرانس اور برطانیہ نے بعد میں رسمی طور پر لہسے اپنے ساتھ شریک ہونیکی دعوت بھی دی تھی۔ لیکن یہ محض اوپری دل کی دعوت تھی۔ انھیں ترکی فوج پر زیادہ اعتماد نہیں رہا تھا۔ برخلاف اس کے جرمنی ترکی کو اپنے ساتھ ملا کر ایشیا میں برطانیہ کو زک دینا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے ترکی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور چونکہ جرمنی سے بظاہر سودا اچھا پٹ رہا تھا اس لئے ساری مصلحتوں کو بالائے

طاق رکھکر نوجوان ترکوں نے جرمنی کے ساتھ جنگ میں چھلانگ لگادی۔

نوجوان ترکوں کے اس فیصلہ کے خلاف قسطنطینیہ میں خود ایک جماعت بن گئی جو جرمن اتحاد کی مخالف تھی۔ اور برطانیہ اور فرانس کے ساتھ اتحاد کی حامی۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک جماعت اور تھی جو ترکی کو بالکل غیر جانب دار رکھنا چاہتی تھی۔ اور جنگ بلقان کے بعد خواہ مخواہ کے خطرات میں گھرنا پسند نہ کرتی تھی۔ مصطفےٰ کمال اسی خیال کے آدمی تھے انھوں نے جب صوفیہ میں سُنا کہ نوجوان ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا تو وہ غصہ سے بدحواس ہوگئے۔ اور انھیں ترکی کی تباہی کا یقین ہوگیا۔ اس لئے کہ اتحادیوں کی فوج سے ٹکر لینا ترکی جیسی نیم جان سلطنت کے بس کا روگ نہیں تھا۔ مصطفےٰ کمال انور پاشا کی اس جلد بازی اور غلط فیصلہ سے سخت ناراض تھے۔ لیکن ایسے وقت میں جبکہ ترکی فوجیں جنگ میں جارہی تھیں وہ صوفیہ میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ انھوں نے فوراً تار کے ذریعہ انور پاشا سے کسی فوج کی کمان مانگی۔ انور پاشا نے اس کے جواب میں انھیں لکھا کہ "وہ صوفیہ ہی میں رہیں۔ میدانِ جنگ میں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اسی مخالفت کا اثر تھا جو مصطفےٰ کمال اور انور پاشا میں پیدا ہوگئی تھی انھوں نے پھر تار کے ذریعہ درخواست کی۔ لیکن اس درخواست کا انھیں کوئی جواب نہ ملا۔ انھوں نے قسطنطنیہ میں اپنے دوستوں کو لکھا لیکن بے سُود۔ آخر تنگ آکر فروری ۱۹۱۵ء میں مصطفےٰ کمال نے یہ طے کرلیا کہ چاہے انھیں بلایا جائے یا نہ بُلایا جائے وہ بغیر چھٹی لئے صوفیہ سے روانہ ہوجائیں گے۔ اور جنگ میں شریک ہوجائیں گے۔ عین اس وقت جبکہ مصطفےٰ کمال صوفیہ سے روانہ ہونیکی تیاریاں کررہے تھے قسطنطنیہ سے ان کا بلاوا آیا۔

انور پاشا روس کے خلاف ترکی فوجوں کی قیادت کرنے کاکیشیا گئے ہوئے تھے۔ اور ان کی جگہ اسماعیل حقی پاشا کام کر رہے تھے۔ انھیں اس کی مطلق پرواہ نہیں تھی کہ انور پاشا کس افسر سے خوش ہیں اور کس سے ناخوش ہیں۔ انھیں تو صرف اچھے فوجی افسروں کی ضرورت تھی۔ اور فی الفور۔ چنانچہ مصطفےٰ کمال اور ان کی فوجی قابلیت سے یہ ذاتی طور پر واقف تھے۔ اس لئے انھوں نے فوراً تار کے ذریعہ مصطفےٰ کمال کو قسطنطنیہ بلایا۔ اور گیلی پولی کے محاذ پر جہاں انگریزی فوجیں برابر ترکوں کو دبا رہی تھیں۔ جرمن سپہ سالار لیمان فان سنڈرس کی ماتحتی میں بھیجدیا۔ فان سنڈرس نے مصطفےٰ کمال کو گیلی پولی کی جنوبی فوج کی کمان دیدی۔ ترکی افسروں کے متعلق فان سنڈرس کی رائے کچھ اچھی نہ تھی۔ لیکن اسے جلد معلوم ہو گیا کہ مصطفےٰ کمال غیر معمولی فوجی قابلیت کے ترکی افسر ہیں۔ دوسری طرف گو مصطفےٰ کمال جرمنوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے لیکن فان سنڈرس سے وہ بہت جلد مانوس ہو گئے۔ اس آپس کی دوستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ فان سنڈرس اور مصطفےٰ کمال میں اکثر و بیشتر اختلاف ہوا۔ لیکن اس اختلاف نے کبھی لڑائی یا رنجش کی صورت اختیار نہ کی فان سنڈرس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مصطفےٰ کمال اپنے اصول اور اپنی رائے میں بہت سخت اکھڑ اور ضدی واقع ہوئے ہیں۔ لیکن نہایت اعلیٰ درجہ کے سپاہی ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ فان سنڈرس نے کہا "مصطفےٰ کمال بڑا زبردست جنرل بلکہ لیڈر ہے۔ اور میں اس پر پوری طرح اعتماد کرتا ہوں" اور مصطفےٰ کمال نے ایک دفعہ فان سنڈرس کے متعلق کہا تھا کہ "اس میں وہ سب صفات موجود ہیں جو ایک جرنل میں ہونی چاہئیں ہم میں آپس میں اختلاف اکثر رہتا ہے۔ لیکن وہ مجھے کبھی اپنی رائے پر عمل کرنے سے نہیں روکتا"

ایتھنز اور قاہرہ سے برابر یہ اطلاعیں آرہی تھیں کہ انگریز بس اب گیلی پولی پر حملہ کرنیوالے ہیں۔ ان کی اسّی ہزار فوج مصر میں تیار کھڑی ہے اور ایک زبردست جنگی بیڑا اس فوج کو گیلی پولی پہنچانے کے لئے مستعد ہے۔ یہاں فان سنڈرس کے آگے اب یہ مشکل پیش آئی کہ اس کے پاس صرف ساٹھ ہزار فوج ہے۔ اور گیلی پولی کا جزیرہ نما پچاس میل طویل واقع ہوا ہے۔ انگریز اپنی اسّی ہزار فوج کو نہ معلوم کس طرف آتاریں اور کس جانب ترکی فوج کو ان سے مقابلہ کرنا پڑے۔ ابھی وہ اس مخمصے ہی میں گرفتار تھا کہ انور پاشا کاکیشیا سے واپس آگئے اور انھوں نے آتے ہی مصطفےٰ کمال کو گیلی پولی کی آزاد جنوبی کمان سے الگ کر دیا۔ اور فان سنڈرس کو حکم دیا کہ ان کو کسی محفوظ فوج پر لگا یا جائے۔ وزیر حرب کے اس فیصلے سے مصطفےٰ کمال کو سخت غصہ آیا اور لیمان فان سنڈرس کو بہت افسوس ہوا۔ جس کا اس نے علانیہ اظہار کیا۔ لیمان فان سنڈرس خود بھی انور پاشا کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ انھیں صرف نمائشی اور جذباتی آدمی سمجھتا تھا جس میں دور اندیشی اور مصلحت بینی مطلق نہ ہو۔ اور یہی وجہ تھی کہ محض ذاتی عناد کے باعث اس موقع پر مصطفےٰ کمال کو گیلی پولی کی اہم کمان سے الگ کرنا اس کو بُرا معلوم ہوا۔ لیکن انور پاشا بہرحال وزیر جنگ تھے اور ان کی ہدایت کی تعمیل بھی ضروری تھی۔ اس لئے فان سنڈرس نے مصطفےٰ کمال کو سمجھا بجھا کر ان کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ اور انھیں میڈوس کی انیسویں محفوظ ڈویژن کی کمان پر مقرر کر دیا۔ یہ ڈویژن ایک ترکی اور دو ٹوٹی پھوٹی عرب فوجوں کا مجموعہ تھی جس کو مصطفےٰ کمال نے دن رات کی سرگرمی اور انہماک سے اوّل درجہ کا ڈویژن بنا دیا۔

بالآخر ۲۵۔ اپریل ۱۹۱۵ء کو انگریزوں نے جزیرہ نما گیلی پولی پر حملہ کر دیا۔ حملہ

تین طرف سے ہوا تھا۔ شمال میں بلیر پر۔ جنوب میں الیمس پر اور قلب میں شونک بائر کی پہاڑیوں پر۔ اس میں شمال اور جنوب کے حملے محض دکھاوے کے تھے۔ اصلی حملہ انگریزوں نے آسٹریلیا کی فوج سے قلب میں کیا تھا۔ اور قسمت دیکھیے۔ انہی شونک بائر کی پہاڑیوں کے عین عقب میں مصطفےٰ کمال کی ڈویژن کا کیمپ تھا۔ لیکن خود مصطفےٰ کمال کو اس کی کچھ خبر نہیں تھی کہ انگریزی فوجیں اس پہاڑی تک آ گئی ہیں۔ صبح کے ساڑھے پانچ بجے وہ اپنی ایک رجمنٹ کی ان پہاڑیوں کے نیچے پریڈ لے رہے تھے کہ چند ترک چوکیدار بھاگے ہوئے آئے اور انھوں نے مصطفےٰ کمال کو انگریزی فوج کے آنے کی اطلاع دی۔ اور یہ بھی بتایا کہ ان کی فوج اری لیبرنو پر پڑی ہوئی ہے۔ اب لطف دیکھیے ترکی۔ فوج کے سپہ سالار فان سنڈرس کو یہ مغالطہ تھا کہ انگریزوں کا اصلی حملہ بلیر پر ہوگا۔ اس لئے اس نے اپنی مضبوطی وہاں رکھی۔ اور مصطفےٰ کمال کو تیاری یا دشمن سے مقابلہ کی کوئی ھدایت نہیں بھیجی۔ لیکن جیسے ہی مصطفےٰ کمال کو یہ اطلاع ملی کہ انگریزی فوجیں اری لیبرنو پر پڑی ہوئی ہیں انکو یقین ہوگیا کہ اصلی حملہ انگریزوں کا یہیں ہو رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے برق کی سی تیزی سے اپنی ایک رجمنٹ کو تیار کیا۔ اور پہاڑی کو عبور کر کے دشمنوں پر جا پڑے لیکن جب دیکھا کہ یہ فوج کافی نہیں ہے تو دوسری اور پھر تیسری رجمنٹ کو بھی جنگ میں دھکیل دیا۔ اور اب ان کے پاس محفوظ فوج کوئی نہیں رہی۔ انھیں یقین تھا کہ اصلی لڑائی انگریزوں سے اسی جگہ ہو رہی ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنی ذمہ داری پر تینوں رجمنٹوں کو لڑائی میں جھونک دیا۔ دن بھر لڑائی ہوتی رہی انگریزی فوجیں دو تہائی پہاڑی چڑھ چکی تھیں۔ لیکن اس سے آگے وہ ایک قدم بھی نہ بڑھا سکیں۔ اور ترکی فوجیں اگرچہ تعداد میں بہت کم اور انگریزی فوج کے مقابلہ میں کم مسلح تھیں لیکن بڑی پامردی سے انھیں روکے رہیں۔ رات ہوئی۔

لڑائی رک گئی۔ لیکن مصطفےٰ کمال رات بھر اپنی تھکی ہوئی فوج کا دل بڑھاتے رہے۔ اور ان کی صفیں ٹھیک کرتے پھرتے رہے۔ دوسرے دن اندھیرے سے پھر لڑائی شروع ہوئی اور دن بھر جاری رہی۔ لیکن پھر بھی نہ ترک انگریزی فوج کو دھکیل سکے اور نہ انگریزی فوجیں ترکوں کو ہٹا کر اپنا راستہ بنا سکیں۔ دو دن کے متواتر حملوں سے دونوں طرف کی فوجیں تھک کر بیدم ہو رہی تھیں۔ اس لئے تیسرے دن ایک دوسرے کے مقابل انھوں نے خندقیں کھودنی شروع کر دیں تاکہ اطمینان سے اپنے اپنے موقع کا انتظار کریں۔

مصطفےٰ کمال نے انگریزوں کے اس حملہ کو جس خوبصورتی سے روکا اور ہدایت کا انتظار کئے بغیر اپنی ذمہ داری پر اپنی تین ٹوٹی پھوٹی رجمنٹوں کو لیکر جس انداز سے انگریزوں کی تازہ دم فوج کے دانت کھٹے کر دئیے اس نے جرمن جنرلوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اور انھیں معلوم ہو گیا کہ کس قابلیت کا ترکی جنرل ان کے ساتھ دشمن سے نبرد آزما ہے۔ نویں ڈویژن کا جرمن جنرل کننگسر تو مصطفےٰ کمال کی جنگی قابلیت سے اس درجہ مرعوب ہوا کہ اس نے یہ علانیہ اعتراف کیا کہ "مصطفےٰ کمال کی سوجھ غضب کی ہوتی ہے۔ اور عمل اس سے بھی زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس کے فیصلے فوری اور صائب ہوتے ہیں"

اب یہ بھی سن لیجئے کہ وہ مورچہ کیسا تھا جس پر مصطفےٰ کمال اپنی ٹوٹی پھوٹی رجمنٹوں سے محض اپنی شخصیت کے بل پر قدم جمائے کھڑے تھے۔ "شونک بائر" اصل میں دردانیال اور قسطنطنیہ کی کنجی تھی۔ اگر شونک بائر فتح ہو جاتا تو دردانیال اور قسطنطنیہ کو فتح کر لینا انگریزوں کیلئے کچھ بھی مشکل نہ ہوتا۔ اور جب یہ دونوں مقام فتح ہو جاتے تو جرمنی اور آسٹریا کی امداد ترکی کو نہ مل سکتی۔ اور اس کیلئے سوائے ہتھیار

ڈالنے کے اور کوئی چارہ نہ رہتا۔ اب اس اہم مقام کو دیکھئے اور تین بوسیدہ جنبٹوں کو دیکھئے اور مصطفےٰ کمال کو دیکھئے!!

کئی مہینے تک گیلی پولی میں ترکی اور انگریزی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں۔ کبھی کبھی اکا دکا حملہ بھی ہو جاتا۔ شل اور مشین گن کی گولیاں بھی چل جاتیں لیکن جمی ہوئی لڑائی ابھی شروع نہیں ہوئی۔ دونوں طرف کی فوجیں مزید کمک کا انتظار کر رہی تھیں۔ مصطفےٰ کمال شب روز سرگرمی سے فوجی ترتیب کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ بے تکلف خندقوں کے آگے پھرتے اور سپاہیوں سے خود گفتگو کر کے دل بڑھاتے۔ گولے اور گولیاں ان کے دائیں بائیں سن سناتیں لیکن انکو پرواہ بھی نہ ہوتی۔ ان ہی گولیوں اور گولوں کی بوچھار میں وہ اپنے سپاہیوں کی ترتیب درست کرتے پھرتے۔ اور سپاہی ان کی اس بے جگری اور بہادری کو دیکھکر خود اپنے آپ میں ایک نئے قسم کا جوش پاتے تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مصطفےٰ کمال ایک نئی خندق کے باہر کرسی ڈالے بیٹھے تھے کہ انگریزی توپ خانہ سے ایک گولہ ان کے قریب آکر پھٹا۔ اور ساتھ ہی دوسرا اور پھر تیسرا۔ مصطفےٰ کمال کے ماتحتوں نے منت کی کہ آپ اس جگہ سے ہٹ جائیں۔ لیکن انھوں نے کہا کہ اس وقت میرا ہلنا فوج پر برا اثر کریگا۔ اور جیب سے ایک سگریٹ نکال کر وہیں اطمینان سے بیٹھے پیتے رہے۔ خود بخود گولوں کا رخ بدل گیا۔ مصطفےٰ کمال کا بال بھی بیکا نہ ہوا ایک اور موقع پر مصطفےٰ کمال گیلی پولی کی طرف موٹر میں واپس آرہے تھے۔ راستہ میں ایک انگریزی ہوائی جہاز نے موٹر پر کئی بم برسائے۔ بم دائیں بائیں گرے اور ایک بم سے مصطفےٰ کمال کا شوفر بھی ہلاک ہو گیا۔ لیکن خود مصطفےٰ کمال پر آنچ تک نہ آئی۔ ان اتفاقی واقعات کے علاوہ وہ اپنے سپاہیوں کا دل بڑھانے

کیلئے خود بندوق ہاتھ میں لیکر دبے پاؤں انگریزی خندقوں تک جاتے اور ان کی کمزور خندقوں پر فائر کرتے۔ جواب میں انگریزی فوج اگرچہ بہت پاس سے گولیاں چلاتی۔ لیکن اس اللہ کے بندے کو کبھی نشانہ نہ بنا سکی تھی۔ مصطفیٰ کمال کے دوست جب انھیں ان باتوں سے روکتے تو وہ نپولین کی طرح ہنس کر کہتے "کہ ابھی وہ گولی نہیں ڈھلی جس کی قسمت میں مجھے ہلاک کرنا لکھا ہے۔" حقیقت یہ ہے کہ مصطفیٰ کمال کو یہ یقین تھا کہ انھیں کوئی گزند نہیں پہونچ سکتا۔ اور یہ اسی یقین کے کرشمے تھے کہ وہ ہر جگہ بے دھڑک پہونچ جایا کرتے تھے۔

جون میں مصطفیٰ کمال نے دشمنوں کی لائن میں ایک کمزور مقام دریافت کرلیا اور ۲۸۔جون کو اس مقام پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ۲۶ کو اتفاق سے انور پاشا اس محاذ کے معائنہ کیلئے آئے۔ انھیں جب بتایا گیا کہ ۲۸۔کو انگریزی لائن کی اس کمزور مقام پر حملہ کیا جائیگا تو انھوں نے اس کی مخالفت کی اور مصطفیٰ کمال کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار کیا کہ مصطفیٰ کمال اس کو برداشت نہ کرسکے۔ اور فوراً اپنی کمان سے استعفٰی دیدیا۔ لیکن فان سنڈرس فوراً درمیان میں آگیا۔ اس موقع پر وہ اپنے بہترین ڈویژنل کمانڈر کو ہاتھ سے دینا پسند نہ کرتا تھا۔ اس نے خود مصطفیٰ کمال کی رائے کی تائید کی۔ انور پاشا نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ اور مصطفیٰ کمال کو حملہ کی اجازت دیدی۔ لیکن چونکہ انور پاشا کی بیجا مداخلت سے فوج کی ترتیب ٹھیک طور پر نہ ہوسکی تھی۔ حملہ ناکام رہا۔ مصطفیٰ کمال نے اس کا الزام علانیہ انور پاشا پر رکھا اور انور پاشا نے اس کی ذمہ داری مصطفیٰ کمال پر ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصطفیٰ کمال نے پھر استعفٰی دیدیا۔ اور اب کے فان سنڈرس کی خوشامد درآمد پر بھی نہ مانے۔ لیکن اس واقعہ کے دوسرے ہی روز انور پاشا قسطنطنیہ واپس ہوگئے۔ اور فان سنڈرس

نے سمجھا بجھا کر مصطفیٰ کمال کو پھر راضی کر لیا۔ لیمان فان سنڈرس کو مصطفیٰ کمال پر پورا بھروسہ تھا۔ اور اس زبردست مہم میں وہ ان کو اپنے سے جُدا نہ کرنا چاہتا تھا۔ اور خود مصطفیٰ کمال بھی فان سنڈرس سے مانوس ہو چکے تھے۔ اسی لئے یہ بار بار اس کی منّت خوشامد پر اپنا استعفیٰ واپس لینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

انور پاشا کے قسطنطنیہ واپس جانے کے بعد مصطفیٰ کمال نے شب وروز کی اَن تھک محنت اور سرگرمی کے ساتھ پھر اپنی فوجوں کو درست کرنا شروع کر دیا۔ جولائی میں اطلاع ملی کہ انگریز ایک بڑا حملہ کرنے والے ہیں۔ لیکن یہ پتہ نہ چلا کہ یہ حملہ کب اور کہاں ہوگا۔ دفعتہً ۶۔ اگست کو انگریزوں نے رات کی تاریکی میں شونک بائر کے شمال میں چڑھائی شروع کر دی۔ فان سنڈرس نے جرمن جنرل کننگسر کو انھیں روکنے کا حکم دیا۔ اور خود دو محفوظ رجمنٹوں کے ساتھ "میودوس" سے اس کی مدد کو چلا۔ ۷۔ اگست کو کننگسر کی فوج سے انگریزوں کا دن بھر مقابلہ ہوتا رہا۔ کنن گسر زخمی ہو گیا۔ اور ترکی فوجوں میں ضعف کے آثار نظر آنے لگے۔ ۸۔ اگست کو انگریزوں نے اپنی فوج کے دو حصّے کئے۔ ایک حصہ سے مصطفیٰ کمال کی فوج کو دبانا شروع کیا اور دوسرے حصّہ سے کنن گسر کی فوج پر حملہ کر دیا۔ حملہ بہت سخت تھا۔ اور ترکوں کی مدافعت کے باوجود انگریزی فوج کے ایک حصّہ نے شونک بائر کی ایک پہاڑی پر قدم جما لئے۔ اس سے مصطفیٰ کمال کی فوج میں ایک ہل چل پڑ گئی۔ اور مصطفیٰ کمال کے اسٹاف کو شکست کا یقین ہو گیا۔ لیکن خود مصطفیٰ کمال نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ فوجی صفوں میں سپاہیوں کا دل بڑھا رہے تھے۔ اور ان پر ذرا بھی اس کا اثر نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مصطفیٰ کمال کے عزم و استقلال نے سپاہیوں کی بددلی بھی دُور کر دی اور انگریزی فوج

باوجود سخت کوشش کے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ شام کو لیمان فان سنڈرس نے مصطفےٰ کمال کو طلب کیا۔ اس وقت اس کا غصہ اور مایوسی سے بُرا حال تھا۔ بلیئر سے جو فوجیں اس نے منگوائی تھیں وہ اب تک نہ آسکی تھیں اور اسے شکست کا یقین ہو چکا تھا۔ مصطفےٰ کمال کے پہونچتے ہی اس نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ ساری فوجوں کو اسی محاذ پر جمع کرلوں اور تم ان سب . . . کی کمان کرو" مصطفےٰ کمال نے بلا لیت و پیش حامی بھرلی۔ ذمہ داری کے احساس نے ان کی سرگرمی کو دوگنا کردیا۔ رات گئے بلیئر کی فوجیں بھی آگئیں۔ اور راتوں رات مصطفےٰ کمال نے انکو ترتیب دینا شروع کردیا۔ اسی طرح انگریزی فوجیں بھی تیاری میں مصروف تھیں صبح ہوتے ہونے ان دونوں فوجوں میں پھر مقابلہ ہوا۔ ٹکر بڑی زبردست تھی لیکن مصطفےٰ کمال اپنی فوج کو سنبھالنے کے لئے ہر جگہ برق صفت تیزی سے جا موجود ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی حملہ ناکام رہا اور ترکی فوج نے اپنے قدم جما لئے۔

دوسرے دن پھر لڑائی ہوئی۔ اور یہ اتنی شدت کے ساتھ ہوئی کہ انیسویں ترکی ڈویژن کے اسٹاف افسر ایک دفعہ پھر مایوس ہوگئے۔ اور انھوں نے مصطفےٰ کمال سے مدد مانگی۔ مصطفےٰ کمال نہایت تیزی سے ان تک پہونچے اور بیدھڑک اپنے آپ کو آگ اور گولوں کے . . مینہ میں جھونک دیا۔ رات ہوگئی۔ دونوں طرف کی فوجیں سستانے لگیں لیکن مصطفےٰ کمال صبح ایک جوابی حملہ کی اسکیم بنا رہے تھے۔ جب سکیم مکمل ہوگئی تو ایک لمحہ کیلئے آرام کئے بغیر یہ رات ہی کو ترکی خندقوں میں فوج کی ترتیب کیلئے پہونچ گئے۔ اور سپاہیوں کو جوش دلاکر اس پر آمادہ کرلیا کہ علی الصبح خندقوں کے آگے جیسے ہی مصطفےٰ کمال ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھیں ترکی فوجیں بیدھڑک دشمنوں پر حملہ کردیں۔ اور انھیں سنگینوں پر رکھ لیں۔

سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ صبح کے تین بجے مصطفےٰ کمال ترکی خندقوں کے آگے پہونچے۔ اور اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر دشمنوں کی طرف بڑھے۔ ترکی فوجیں جوش سے بدحواس ہوگئیں۔ نعرے مار مار کر بے تحاشا انگریزوں پر جا پڑیں۔ انگریزوں کا توپ خانہ اور مشین گنیں حرکت میں آگئیں۔ اور دھواں دھار گولیوں کا مینھ برسنے لگا۔ ایک گولی مصطفےٰ کمال کی گھڑی پر بھی لگی۔ گھڑی چور چور ہوگئی لیکن ان پر آنچ تک نہ آئی۔ ترکوں کے اس زبردست حملہ سے انگریزوں کی نارتھ لنکا شائر رجمنٹ تو بالکل ختم ہوگئی۔ اور ولٹ شائر رجمنٹ کا ایک ایک سپاہی چن چن کر ترکوں نے اپنی سنگینوں پر رکھ لیا۔ انگریزوں کو شکست فاش ہوئی۔ شونک بائر کی پہاڑی سے انگریزی فوجیں پسپا ہوگئیں اور دارانیال محفوظ ہوگیا۔ یہ پہلا معرکہ تھا جس میں مصطفےٰ کمال کا نام پہلی مرتبہ اخباروں میں آیا۔ اور باوجود انور پاشا کی سخت مخالفت کے ترکی حکومت کو ان کی کارگذاری کا اعتراف کرنا پڑا۔ چنانچہ اس فتح کے صلہ میں ترکی حکومت نے مصطفےٰ کمال کو پاشا کا اعزاز عطا کیا۔

اس معرکہ کے تین ہفتہ بعد تک انگریزی فوجیں یہاں پڑی رہیں۔ لیکن دوبارہ حملہ کا حوصلہ نہ ہو سکا۔ بالآخر دسمبر ۱۹۱۵ء کو انگریزی فوجوں نے گیلی پولی چھوڑ کر جہازوں کے ذریعہ مصر کی راہ لی۔ ترکوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ خطرہ ٹل گیا۔

باب (۸)

کاکیشیا کی مہم

دردانیال کا معرکہ کامیابی سے سر کرنے کے بعد مصطفےٰ کمال قسطنطنیہ پہونچے۔ یہاں ان کی تعریف ان سے پہلے پہونچ چکی تھی۔ اور اخبار ان کو "محافظ دردانیال" کے نام سے خطاب کر رہے تھے۔ ترکوں میں اس فتح کی وجہ سے یہ بڑے مشہور ہو رہے تھے۔ اور اب رائے عامہ بھی ان کی طرف کو جھک گئی تھی۔ جرمنوں سے عام بے دلی سی پائی جارہی تھی۔ اور انور پاشا کو جو جرمنوں کی قوت کے بل پر ڈکٹیٹر بنے بیٹھے تھے اب لوگ بُری نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ مصطفےٰ کمال پاشا کے قسطنطنیہ واپس آتے ہی انور کے مخالفوں کو ایک تقویت سی ہو گئی۔ اور خود مصطفےٰ کمال پاشا بھی وزارتِ حرب کے غلط فیصلوں اور غلط چالوں کا مذاق اڑانے لگے تھے۔ انور پاشا کیلئے یہ باتیں ناقابلِ برداشت تھیں مگر مجبور تھے۔ مصطفےٰ کمال پاشا سے اب وہ علانیہ نہیں بھڑ سکتے تھے۔ انھوں نے انکو قسطنطنیہ سے پھر کہیں دور دراز علاقہ میں پھینکنے کا تہیہ کر لیا۔ اور اس مطلب کیلئے انھوں نے کاکیشیا کا محاذ سوچا۔ جہاں انور پاشا خود ایک سال پہلے ایک لاکھ ترکی فوج کو تباہ کر چکے تھے۔ اور شکست کھا کر قسطنطنیہ واپس آئے تھے۔ چنانچہ مصطفےٰ کمال پاشا کے قسطنطنیہ پہونچنے کے دو ہی ہفتہ بعد انھیں حکم ملا کہ وہ کاکیشیا جائیں۔ کمال پاشا بلا تامل کاکیشیا کے محاذ پر روانہ ہو گئے۔ یہاں پہونچکر انھوں نے

فوج کی عجیب حالت دیکھی ۔ نہ ترتیب ہی درست ، نہ کپڑے ڈھنگ کے ۔ نہ سامانِ جنگ پوری طرح کا ۔ انور پاشا کی شکست کے بعد یہ فوج یوں ہی پڑی ہوئی تھی نہ کسی نے اس کی طرف توجہ کی اور نہ اس کو درست کرنیکا خیال کیا ۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے پہلے تو یہاں کی حالت کی رپورٹیں دفر مینگ کو بھیجیں اور سامانِ حرب مانگا لیکن جب انور پاشا نے ان کی کسی رپورٹ کا جواب تک نہ دیا تو پھر انھوں نے کوئی رپورٹ وزارتِ حرب کو نہیں بھیجی ۔ اور خود ہی اپنی فطری سرگرمی سے فوج کی اصلاح اور ترتیب میں مصروف ہو گئے ۔ یہاں مصطفےٰ کمال پاشا کے اسٹاف میں دو افسر بڑے کام کے تھے ۔ ایک کاظم قرہ بکر پاشا ۔ دوسرے کرنل عصمت بے ۔ ان ہی دونوں کی اعانت سے مصطفےٰ کمال پاشا نے دیار بکر کی فوجوں کو درست کرنا شروع کر دیا ۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ اس قابل ہو گئی کہ روس کا جم کر مقابلہ کر سکے ۔

۱۹۱۶ء کے موسم بہار میں روس نے اس محاذ پر حملہ کی ٹھانی ۔ گرانڈ ڈیوک نکولاس خود روس کی فوجوں کی ترتیب دیکھنے ماسکو سے آیا ۔ اور ساری تیاریاں اس نے خود اپنے مواجہ میں مکمل کرائیں ۔ لیکن عین اس وقت جبکہ وہ ترکی فوجوں پر حملہ کرنے والا تھا روس میں بغاوت ہو گئی ۔ اور گرانڈ ڈیوک کو فوراً ماسکو واپس جانا پڑا ۔ اور روسی تیاریاں غیر مکمل رہ گئیں ۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے فوراً ہی اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور روسی مورچہ پر حملہ کر دیا ۔ اور بڑی آسانی سے بٹلس وان اور مشک فتح کر لیا یہ شہر پہلے ترکی ہی کے تھے ۔ لیکن روسیوں نے انور پاشا کے مقابلہ میں ان کو فتح کر لیا تھا ۔ ان تینوں شہروں کو واپس لیکر ترکی فوج نے باطوم کا رخ کیا ۔ اور اس علاقہ سے بھی دشمنوں کو مار بھگایا ۔ محاذ محفوظ ہو گیا ۔ روسیوں کی قوت ٹوٹ گئی ۔ اور اب دوبارہ اس محاذ سے ان کے حملہ کرنیکا امکان ختم ہو گیا ۔

لیکن مصطفےٰ کمال پاشا ابھی روسیوں سے اچھی طرح نمٹ نہ چکے تھے کہ انگریزوں نے ایک طرف شام پر حملہ کردیا اور دوسری طرف بغداد پر قبضہ کرلیا۔ اور موصل کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ اس اچانک وار کو روکنے کے لئے انور پاشا نے اناطولیہ اور دیار بکر کی فوجوں کو جن کی کمان مصطفےٰ کمال پاشا کے پاس تھی فوراً شام کے محاذ پر بھیجنے کا حکم دیدیا۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا کی تعیناتی بھی شام کی ساتویں ڈویژن پر کردی۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے دیار بکر کی کمان کاظم قرہ بکر کو سپرد کردی۔ اور خود قسطنطنیہ آگئے۔ کیونکہ شام کی صورت حال یہ تھی کہ انور پاشا نے جرمن ہائی کمانڈ کو لکھکر جنرل فاکن ہائین کو شام میں بُلا لیا تھا۔ اور شام کی ترکی فوجوں کا سپہ سالار بنادیا تھا۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا کو اسی جنرل کی ماتحتی میں تعینات کیا تھا مصطفےٰ کمال پاشا کو اس پر اعتراض تھا کہ وہ کسی جرمن جنرل کی ماتحتی میں کام کریں۔ فان سنڈرس سے تو ان کی نبھ گئی تھی۔ لیکن اس نئے جنرل سے ان کی نہیں بن سکتی تھی۔ اس لئے کہ اس جنرل کو ترکی افسروں پر بہت کم اعتماد تھا۔ اور وہ برابر ان کے کاموں میں مداخلت کیا کرتا تھا۔ چنانچہ مصطفےٰ کمال پاشا اور جنرل فاکن ہائین کی پہلی ہی ملاقات میں جو حلب میں انور پاشا اور چوتھی فوج کے کمانڈر جمال پاشا کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ اچھی خاصی جھڑپ ہوگئی۔

جنرل فاکن ہائین نے جو جنگی تجویزیں اس کانفرنس میں پیش کیں۔ ان سے مصطفےٰ کمال پاشا نے اختلاف کیا۔ اور یہ اختلاف اس قدر بڑھا کہ فوراً مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنی فوج کی کمان سے استعفےٰ دیدیا۔ اگرچہ انور پاشا اور خود جنرل فاکن ہائین نے بہت کوشش کی کہ یہ اپنا استعفےٰ واپس لے لیں۔ لیکن مصطفےٰ کمال پاشا کسی طرح جرمن جنرل کی ماتحتی میں کام کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ انور پاشا نے یہ صورت دیکھی تو مصطفےٰ کمال پاشا کو واپس دیار بکر بھیجنا چاہا۔ لیکن یہ بھی انھوں نے منظور نہ

کیا۔ آخر انور پاشا انھیں بیماری کی رخصت دینے پر مجبور ہو گئے۔

اس وقت مصطفےٰ کمال پاشا کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ جمال پاشا سے کچھ رقم قرض لی۔ اور وہ قسطنطنیہ واپس آ گئے۔

باب (۹)

جرمنی کا سفر اور جرمن سپہ سالار سے دو دو باتیں

جنرل فان کن ہائین مصطفےٰ کمال پاشا کی اس ضد اور جسارت پر کہ یہ مُنہ پر جرمن افسروں کو بُرا کہتے ہیں اور علانیہ ان کی تجویزوں کا مذاق اڑاتے ہیں یہ چاہتا تھا کہ ان پر عدول حکمی کا الزام لگا کر انھیں سزا دے۔ لیکن وزیر حرب انور پاشا اس کو خوب سمجھتے تھے کہ اس وقت مصطفےٰ کمال پاشا کا پلّہ بہت بھاری ہے۔ اور قسطنطنیہ میں ہر شخص ان کو کامیاب اور قابل ترین جنرل سمجھتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ عوام میں جرمنوں کے خلاف ہیجان بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اور خود انور پاشا کا اقتدار خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ اس لئے اگر اس موقع پر مصطفےٰ کمال پاشا کو ذرا بھی چھیڑا گیا تو قسطنطنیہ میں ایک قومی ہنگامہ بر پا ہو جائیگا۔ اور انور پاشا کا رہا سہا اقتدار بھی ختم ہو جائیگا۔ اس لئے انھوں نے مصطفےٰ کمال پاشا کو اپنے حال پر چھوڑ دیا لیکن مشکل یہ تھی کہ مصطفےٰ کمال پاشا کے قسطنطنیہ آتے ہی انور اور جرمنوں کا مخالف گروہ پھر ان کے گرد جمع ہونا شروع ہو گیا۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنی عادت کے مطابق علانیہ انور پاشا اور ان کے طریقہ کار پر اعتراض کرنے شروع کر دیئے جسکی وجہ سے قسطنطنیہ میں انور پاشا کیخلاف ایک ناگوار سی فضا پیدا ہونے لگی۔ انھوں نے جب دیکھا کہ کمال پاشا کا وجود قسطنطنیہ میں ان کے لئے خطرناک ہوتا جارہا ہے تو انھوں نے یہ ترکیب کی کہ شروع ۱۹۱۸ء میں ترکی کے ولی عہد وحید الدین کے ساتھ

جو سرکاری مہمان کی حیثیت سے برلن جا رہے تھے مصطفےٰ کمال پاشا کو تعینات کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ قسطنطنیہ سے دور بھی رہیں اور جرمنی کی فوجی طاقت خود بھی اپنی آنکھوں سے جرمنی جا کر دیکھ لیں۔ تاکہ جرمن افسروں سے جو انھیں نفرت ہے وہ جاتی رہے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے بھی اس مشن کو قبول کر لیا۔ اس لئے کہ ایک تو بیکاری سے وہ اکتا گئے تھے دوسرے وہ خود بھی جرمنوں کی اصلی پوزیشن سمجھنا چاہتے تھے۔

راستہ میں ابتداءً تو پرنس وحید الدین اور مصطفےٰ کمال پاشا میں رسمی تکلف قائم رہا۔ لیکن پرنس وحید الدین چونکہ خود بھی انور پاشا اور ان کے احباب کی حکومت کو پسند نہ کرتے تھے اور انجمن اتحاد و ترقی کے مخالف تھے اس لئے بہت جلد مصطفےٰ کمال پاشا اور پرنس وحید الدین میں بے تکلفی ہوگئی اور برلن پہونچتے پہونچتے ان میں آپس میں اچھا خاصا یارانہ ہوگیا۔ راستہ بھر مصطفےٰ کمال پاشا پرنس وحید الدین کو جرمنوں کے خلاف اکساتے رہے۔ اور برلن پہونچنے کے بعد بھی وہ تنہا گھوم پھر کر جرمن فوج کے متعلق جو کچھ دیکھتے اس کا تاریک پہلو وحید الدین کے آگے رکھدیتے۔ پرنس وحید الدین اور مصطفےٰ کمال پاشا برلن کی سیر کے بعد فرانس کے محاذ پر پہونچے۔ فیلڈ مارشل ہنڈنبرگ نے ان کا استقبال کیا۔ اور لڑائی کا بڑا اچھا نقشہ پرنس وحید الدین کے آگے پیش کیا۔ اور خوب سبز باغ دکھائے۔ مصطفےٰ کمال خاموشی سے یہ سب کچھ سنتے رہے رات کو قیصر نے پرنس وحید الدین کے اعزاز میں ڈنر دیا۔ اس ڈنر کے بعد مصطفےٰ کمال ٹہلتے ہوئے ہینڈنبرگ کے پاس پہونچے۔ اور بے تکلفی کے ساتھ اس بڈھے فیلڈ مارشل کے کندھے پر ہاتھ رکھکر کہا کہ "آپ نے شام کے محاذ کے متعلق جو باتیں پرنس وحید الدین سے بیان کیں وہ بالکل غلط تھیں۔ میں ان کو خوب جانتا ہوں۔ اس لئے کہ میں خود وہاں ہو آیا ہوں۔ خاصکر کیولیری ڈویژن جس کا آپ نے ذکر کیا تھا وہ صرف کاغذوں

میں پائی جاتی ہے اور حقیقت میں اس کا کہیں وجود نہیں ہے۔ کیا آپ مجھے بالکل از میں یہ بتا سکتے ہیں کہ ایک بڑے حملہ کی جو تیاریاں آپ کر رہے ہیں اس سے آپ کا مقصد کیا ہے؟"

بڈھا ہیڈنبرگ اس بے تکلف جسارت سے چونک پڑا۔ اور اس نے پہلے تو ترکی کے اس نوجوان گستاخ جنرل کو بڑے غور سے دیکھا اور اس کے بعد مصطفےٰ کمال پاشا کو ایک سگریٹ اپنے کیس سے نکال کر دیا۔ اور اُسے جلا بھی دیا۔ اور اس طرح ان کے سوال کو ٹال گیا۔ ایک اور موقع پر کچھ جرمن افسر ترکی کی برائیاں کر رہے تھے۔ مصطفےٰ کمال پاشا کے کان میں جیسے ہی اس کی بھنک پڑی انھوں نے بھرے مجمع ہی میں جرمن افسروں کو ڈانٹ دیا۔ اصل میں وہ ترکی اور ترکوں کی مذمت ایک منٹ کیلئے بھی کسی سے سُننا پسند نہ کرتے تھے۔ اور برلن کے دورے کے بعد تو انھیں اور یقین ہو گیا تھا کہ ترک جرمنوں سے لاکھ درجہ بہتر ہیں۔ جرمنوں سے انھیں ابتدا ہی سے نفرت تھی اور اس دَورے کے بعد تو ان سے کچھ عداوت سی ہو گئی۔ چنانچہ ایک اور ڈنر کے موقع پر جس میں قیصر بھی شریک تھا اسیس کا جرمن گورنر آرمینیہ والوں پر ترکی افسروں کے مظالم کی داستان چپکے چپکے پرنس وحید الدین کو سُنا رہا تھا۔ پرنس نے وہیں اس کا ذکر مصطفےٰ کمال پاشا سے کر دیا۔ یہ سُننا تھا کہ مصطفےٰ کمال پاشا کے غصہ کی انتہا نہ رہی۔ سب کے سامنے آپ نے اس گورنر کو مخاطب کر کے کہا کہ "آپ نے ترکی کے ہونیو الے سلطان سے ایسی بے سروپا باتیں کرنے کی کیسے جرأت کی! آپ آخر آرمینیہ والوں کو متعلق جانتے کیا ہیں؟ ترکی نے اپنے ذاتی مفاد کو قربان کر کے اس جنگ میں جرمنی کا ساتھ دیا ہے۔ اور آرمینیہ والے ترکی کو تباہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ ایک جرمن صوبہ کے گورنر کو اس قدر جرأت کیسے ہوئی کہ جرمنی کے حلیف کے مقابلہ میں آرمینیہ کی حمایت کرے۔؟" مصطفےٰ کمال پاشا نے اس قدر غضبناک

انداز میں یہ تقریر کی کہ الیسس کا گورنر بوکھلا گیا اور اس نے فوراً ہی عاجزی سی معذرت کرنی شروع کر دی۔ لیکن مصطفےٰ کمال پاشا کا اس سے اطمینان نہ ہوا۔ اور انھوں نے نہایت گہرے طنزیہ انداز میں کہا کہ "ہم یہاں آرمینیہ کے متعلق گفتگو کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ یہ دیکھنے آئے ہیں کہ اس جنگ میں حقیقتاً جرمنی کی صحیح پوزیشن کیا ہے اور یہاں ہم نے جو کچھ دیکھا اس سے مستقبل کے متعلق ہمارے شبہے یقین سے بدل گئے۔"

پرنس وحید الدین جب تک برلن میں رہے مصطفےٰ کمال پاشا انھیں جرمنی کی کمزوریوں سے برابر آگاہ کرتے اور واپسی میں بھی سارے راستے وہ انور پاشا کی حماقتوں اور جرمنی کی کمزوریوں کو گناتے رہے۔ اور پرنس وحید الدین کو اس پر آمادہ کر لیا کہ سلطان ہوتے ہی انور پاشا اور طلعت پاشا کی حکومت کو ختم کر دیں گے اور مصطفےٰ کمال پاشا کو وزیر جنگ بنا دیں گے۔ وحید الدین نے یہ وعدہ کرنیکو تو کر لیا لیکن حقیقتاً اس سارے سفر میں ان پر مصطفےٰ کمال پاشا کی زبردست شخصیت کا ایسا اثر پڑا تھا کہ وہ ان کی ذہانت اور قابلیتوں سے ڈرنے لگے تھے۔ اور اسی وقت سے انھیں یہ خیال ہو گیا تھا کہ مصطفےٰ کمال پاشا کو بڑے سے بڑا عہدہ دیکر بھی وہ قابو میں نہیں رکھ سکیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا بھی۔ اس وعدہ کے چند ہی مہینے بعد محمد ارشاد کا انتقال ہو گیا۔ اور وحید الدین سلطان ہو گئے۔ لیکن انھوں نے نہ صرف اپنا وعدہ پورا نہیں کیا بلکہ کمال پاشا کو قسطنطنیہ سے دور رکھنے کیلئے شام کے محاذ پر بھیجدیا۔

باب (۱۰)

مصطفیٰ کمال پاشا کی شام کے محاذ پر تعیناتی

پرنس وحید الدین کے ساتھ برلن کے سفر سے واپس آتے ہی مصطفےٰ کمال پاشا گردے کے درد میں مبتلا ہو گئے۔ اور اس مرض نے اس قدر شدت پکڑی کہ انھیں مہینہ بھر صاحب فراش رہکر علاج کیلئے فوراً آسٹریا جانا پڑا۔ یہاں تقریباً دو مہینے تک مصطفےٰ کمال پاشا موت اور زیست کی کش مکش میں مبتلا رہے۔ جب کسی قدر حالت سنبھلی تو انھیں معلوم ہوا کہ محمد ارشاد کا انتقال ہو گیا اور وحید الدین سلطان ہو گئے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے اسی عالم میں انھیں مبارکباد کا خط بھیجا لیکن قسطنطنیہ واپس نہ ہوئے۔ کچھ دنوں بعد عزت پاشا اور انور پاشا کے مخالفوں کے خط پہ خط مصطفےٰ کمال پاشا کے پاس آنے شروع ہوئے جن میں شدید تقاضہ تھا کہ وہ فوراً قسطنطنیہ آئیں مرض نے مصطفےٰ کمال پاشا کو انتہائی کمزور اور نڈھال کر رکھا تھا۔ لیکن ان خطوں کے جواب میں وہ اسی حال میں جولائی ۱۹۱۸ء کی آخری تاریخوں میں قسطنطنیہ پہونچے۔ سلطان وحید الدین ان سے بڑے تپاک سے ملے۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا کا سگریٹ خود اپنے ہاتھ سے سلگایا۔ لیکن گفتگو میں بہت محتاط رہے۔ اصل میں سلطان وحید الدین بے انتہا ڈرپوک اور خود غرض قسم کے آدمی تھے۔ وہ انور پاشا اور انجمن اتحاد و ترقی کے دشمن ضرور تھے۔ لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ علانیہ انور پاشا یا انجمن اتحاد و ترقی کا مقابلہ کرتے دوسرے

مصطفیٰ کمال پاشا کی شخصیت سے وہ بہت ہی گھبرائے ہوئے سے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ انور پاشا سے زیادہ ضدی اور ہٹیلے ثابت ہوں گے۔ اور انھیں قابو میں رکھنا انور پاشا سے بھی زیادہ مشکل ہو جائیگا۔ اس لئے انھوں نے اپنی بقا اسی میں سمجھی کہ انور پاشا سے صفائی کر لیں اور مصطفیٰ کمال پاشا کو نظر انداز کر دیں۔ چنانچہ دوسری ہی ملاقات میں سلطان وحید الدین نے مصطفیٰ کمال پاشا کو جرمن افسروں سے ملایا۔ اور ان کی جنگی قابلیت کی بڑی تعریفیں کیں۔ اور اسی دوران میں مصطفیٰ کمال پاشا سے مخاطب ہو کر کہا کہ "شام کے محاذ کی حالت آجکل بہت نازک ہو رہی ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ کو وہاں کی کمان پر بھیجوں۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ دشمنوں کو ترکی سرحد میں قدم نہ جمانے دیں گے"

مصطفیٰ کمال پاشا خوب جانتے تھے کہ اس حکم کی تہ میں کس کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ جب وہ سلطان سے رخصت ہو کر باہر آئے تو برابر کے کمرہ میں انھیں انور پاشا کھڑے ہوئے نظر آئے۔ مصطفیٰ کمال پاشا سیدھے ان کے پاس پہنچے اور تھوڑی دیر تک انور پاشا کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "انور میں تمھیں مبارکباد دیتا ہوں اس دفعہ بھی تم جیتے اور میں ہارا۔ میں جانتا ہوں کہ شام میں جس قدر فوج ہے۔ وہ صرف کاغذ پر ہے اور اس طرح تم نے مجھ سے بڑی خوبصورتی سے بدلا لیا ہے" یہ انور پاشا اور مصطفیٰ کمال پاشا کی آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد یہ دونوں آپس میں کبھی نہیں ملے۔ عین اسی وقت اس کمرہ کے ایک کونہ میں چند جرمن افسر جو آپس میں باتیں کر رہے تھے ان میں سے ایک نے کسی قدر آواز سے کہا "ان ترکی سپاہیوں پر ذرا بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو صرف بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح بھاگنا ہی جانتے ہیں" مصطفیٰ کمال پاشا یہ سنتے ہی اس جرمن

افسر کی طرف بپھرے ہوئے شیر کی طرح پلٹ پڑے اور نہایت صاف اور اونچی آواز میں کہا: "میں خود بھی ایک سپاہی ہوں اور میں خوب جانتا ہوں کہ ترکی سپاہی بھاگنے کا لفظ بھی نہیں جانتے۔ لیکن جنرل اگر تم نے ترکی سپاہیوں کی پیٹھ دیکھی ہے تو ایسے وقت میں دیکھی ہوگی جب تم خود بھاگ رہے تھے۔ ایسی صورت میں تمھیں اپنی نامردی اور بزدلی کا الزام ترکی سپاہیوں پر رکھنے کی کیسے جرأت ہوئی؟"

مصطفےٰ کمال پاشا کی اس جوشیلی تقریر سے .... کمرہ میں سناٹا چھا گیا اور مصطفےٰ کمال پاشا حقارت سے جرمن افسروں کو دیکھتے ہوئے گذر گئے۔

باب (۱۱)

شام کے محاذ پر آخری معرکہ اور جنگ عظیم کا خاتمہ

اگست کی آخری تاریخوں میں مصطفےٰ کمال پاشا شام کے محاذ پر پہونچے۔ اسوقت یہاں فان سنڈرس اس محاذ کا سپہ سالار تھا۔ اور فاکن ہائین جرمنی واپس جا چکا تھا فان سنڈرس اور مصطفےٰ کمال پاشا میں ابتدا ہی سے اتحاد پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے محاذ پر پہونچتے ہی اپنی فطری سرگرمی سے فوجوں کی ترتیب کا کام شروع کر دیا۔ کاکیشیا میں ان کو ترکی فوجیں بُری حالت میں ملی تھیں۔ اور یہاں انھوں نے فوجوں کی بدترین حالت دیکھی۔ نہ غریبوں کو پیٹ بھر کھانا ملتا تھا۔ اور نہ پہننے کو اُن کے پاس پھٹی ہوئی وردیوں کے سوا کچھ اور تھا۔ اس حالت میں ترکی فوجوں کا حوصلہ قائم رہنا بہت مشکل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کی فوجیں تھکی ہوئی اور حوصلہ ہارے ہوئے معلوم ہو رہی تھیں۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے یہ رنگ دیکھکر اپنی شخصیت کے اثر سے کام لینا شروع کیا۔ اور علی فواد پاشا اور عصمت پاشا کو جو مصطفےٰ کمال پاشا کی ماتحتی میں کام کر رہے تھے ساتھ لیکر ان تھکی ہوئی ترکی فوجوں کو درست کرنے میں دن رات ایک کر دیا مصطفےٰ کمال پاشا ابھی بیماری سے اٹھے تھے۔ اور اٹھتے ہی جو اس قدر سخت محنت کی تو گردے میں پھر درد شروع ہو گیا۔۔ اور اس قدر شدت کے ساتھ بڑھا کہ وہ پھر صاحب فراش ہو گئے ایسے وقت میں فوج کی ساری ترتیب علی فواد اور عصمت پاشا کے ہاتھوں میں رہی۔

۱۷ ستمبر کو ایک مخبر نے مصطفےٰ کمال پاشا کو یہ خبر دی کہ ۱۹ ستمبر کو انگریز ساحل کی طرف سے ترکی فوج پر حملہ کرنیوالے ہیں۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے اس اطلاع کے سارے امکانات پر غور کر کے اس کو صحیح طور پر تسلیم کر لیا۔ لیکن فان سنڈرس کو یقین نہ آیا۔ اور وہ یہ سمجھا کہ یہ مخبر انگریزوں ہی کا بھیجا ہوا ہے۔ جو گمراہ کرنے آیا ہے۔ اور اسی خیال کی ماتحت اس نے اپنی بہترین فوج حجاز ریلوے کی طرف بھیجدی۔ لیکن مصطفےٰ کمال پاشا کو یقین تھا کہ یہ اطلاع صحیح ہے۔ اس لئے بیماری کے باوجود وہ ہمت کر کے اٹھے اور انھوں نے اپنے سارے ماتحت کمانڈروں کو حکم بھیجدیا کہ وہ انگریزی حملہ کو روکنے کیلئے تیار رہیں۔

۱۹ ستمبر کو جیسی کہ اطلاع تھی حملہ ہوا۔ ساحل کی طرف سے انگریزی فوجوں نے دبایا۔ اور شرق اردن کی سرحد سے امیر فیصل کی عرب فوج نے حملہ کر دیا۔ اس دو طرفہ حملہ سے ترکی فوج سنبھل نہ سکی۔ اور بچاؤ کی لائن ٹوٹ گئی۔ مصطفےٰ کمال پاشا یہاں بھی اپنے ذاتی اثر سے کام لیتے ہوئے فوجوں کی بے ترتیبی روکتے ہوئے اپنی فوج کو دمشق تک ہٹا لائے۔ اور ریاق پر انھوں نے اپنے بچاؤ کی ایک اور لائن بنانی چاہی۔ لیکن اطلاع ملی کہ یہاں کے لوگ بھی دشمنوں سے مل گئے ہیں۔ اور بچاؤ کی نئی لائن کامیاب ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس اطلاع کے ملتے ہی مصطفےٰ کمال پاشا نے یہ تصفیہ کر لیا کہ شام کے کسی حصہ میں بچاؤ کی نئی لائن قائم کرنے سے یہ بہتر ہے کہ فوراً ترکی سرحد میں ہٹ جائیں اور وہاں ایک نہایت مضبوط لائن قائم کریں۔ اس ترکیب سے دشمن کا دباؤ بھی ترکی فوج پر سے فی الفور کم ہو جائیگا۔ اور فوجوں کو دوبارہ تازہ دم دشمن کے مقابلہ میں لایا جاسکے گا۔ اور پھر ترکی سرحد میں اس کا بھی اندیشہ نہیں رہیگا۔ کہ وہاں کے لوگ دشمن سے مل جائیں۔ جس وقت مصطفےٰ کمال پاشا نے اپنی یہ اسکیم فان سنڈرس کے آگے پیش کی اس نے فوراً کہا کہ تجویز نہایت معقول ہے لیکن میں یہ حکم نہیں دے سکتا کہ سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ بھی بغیر لڑائی کئے دشمنوں کی حوالے

کر دیا جائے۔ یہ تم ترکوں کا کام ہے۔ اس کو آپس میں طے کر لو۔" اس کے جواب میں مصطفےٰ کمال پاشا نے فان سنڈرس سے کہا کہ "آپ اس بات سے بالکل نہ گھبرائیں۔ میں اس کی پوری پوری ذمہ داری لیتا ہوں۔" چنانچہ مصطفےٰ کمال پاشا نے ساری فوجوں کو فوراً حلب کی جانب پسپا ہونیکا حکم دیدیا۔ اور خود پہلے پہونچ کر حلب سے دس میل کے فاصلہ پر ترکی فوج کی خندقیں کھدوادیں۔ اور ضروری انتظام میں مصروف ہو گئے۔

فوج کی اس عام پسپائی کے متعلق مصطفےٰ کمال پاشا کی دلیل یہ تھی کہ عرب شام اور فلسطین ترکی علاقے نہیں ہیں بلکہ عرب ہیں۔ ترکی سلطنت کو جنگ میں چونکہ شکست ہوئی اور خود ان علاقوں نے ترکی سے غداری کی۔ ایسی صورت میں ان غدار علاقوں پر ترکی فوج کو ضائع کرنا مناسب نہیں۔ یہ علاقے خود ہی اپنے لئے جو راہ مناسب سمجھیں اختیار کریں۔ ترکی فوجیں خالص ترکی علاقہ کی حفاظت کرینگی۔ اور ترکی کی ایک انچ زمین بھی دشمنوں کو نہ دیں گی۔ چنانچہ جیسے ہی تھکی ماندی ترکی فوجیں حلب پہونچیں۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے ان کو دوبارہ رجمنٹوں میں تقسیم کیا۔ اور اپنی فطری سرگرمی سے ان میں نیا جوش پیدا کر کے بچاؤ کی ایک مضبوط لائن قائم کر دی۔ ان انتظاموں سے فارغ ہو کر مصطفےٰ کمال پاشا نے سلطان کو تار بھیجا جس میں مطالبہ کیا کہ انور پاشا کو فوراً وزارتِ حرب کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے اور موجودہ حکومت توڑ کر نئی اور مضبوط حکومت قائم کی جائے۔ اس تار کا فوراً ہی کوئی جواب نہیں آیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد اطلاع ملی گئی کہ انور، طلعت اور جمال تینوں ترکی سے فرار ہو گئے۔ اور نئی کیبنٹ بھی بن گئی جس میں عزت پاشا وزیر اعظم ہوئے اور رفیقی اور کپتان رؤف بھی وزارت میں شامل کر لئے گئے۔ مصطفےٰ کمال پاشا کو اس کا بڑا رنج ہوا کہ سلطان نے اس دفعہ بھی ان کی حق تلفی کی۔ اور وزارتِ حرب انھیں نہیں دی۔ یہ واقعہ ہے کہ ساری ترکی میں

اس وقت مصطفیٰ کمال پاشا سے زیادہ سینیئر اور ان سے زیادہ کامیاب جنرل کوئی دوسرا نہ تھا۔ لیکن اس رنج کو مصطفیٰ کمال پاشا نے بالکل ظاہر نہ ہونے دیا۔ اور اسی مستعدی سے فوج کو سنبھالے رہے۔ جب انور، طلعت اور جمال کے فرار ہونیکی خبر عام ہوگئی تو انگریزوں کے مشہور جاسوس کرنل لارنس نے مصطفیٰ کمال پاشا کو یہ پیغام بھجوایا کہ ترکی کی شکست مکمل ہوگئی۔ بہتر ہے کہ آپ بھی علیحدہ صلح کرلیں۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے اس پیغام کو حقارت سے ٹھکرادیا اور جواب میں کہلا بھیجا کہ جب تک میرے دم میں دم ہے ترکی کی ایک انچ زمین بھی تم نہ لے سکو گے۔

۲۶۔ اکتوبر کو انگریزی فوج نے ترکی لائن پر حملہ کردیا۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی فوج کی خود ہی کمان کی۔ ترکوں کی تھکن دور اور حوصلے بڑھ چکے تھے۔ مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں انھوں نے انگریزی فوج کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ اور حملہ آور فوج انتہائی بے ترتیبی سے پسپا ہوگئی۔ ترکی فوج نے دس میل اور آگے بڑھکر مورچے قائم کرلئے۔ انگریزی فوج دوسرے حملہ کیلئے کمک کا انتظار کررہی تھی۔ اور ترکی فوجیں اپنے مورچہ کو مضبوط کررہی تھی کہ قسطنطنیہ سے خبر آئی ترکوں اور انگریزوں میں صلح ہوگئی۔ ترکی میں جس قدر جرمن افسر تھے سب کو فوراً جرمنی واپس ہونیکا حکم دے دیا گیا۔ فان سنڈرس نے بھی اپنی کمان مصطفیٰ کمال پاشا کے حوالہ کردی۔ اپنی کمان کا چارج دیتے ہوئے لیمان فان سنڈرس کے الفاظ یہ تھے " میں یور ایکسیلنسی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب آپ نے انافرتا میں فوجوں کی کمان کی تھی۔ اور مجھے فخر ہے کہ میں آپکی فوجی قابلیت کو اسی وقت جان گیا تھا۔ ہم میں آپس میں اکثر اختلاف خیال ہوا لیکن ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے سچے دوست بنے رہے۔ اس وقت سب سے بڑی ڈھارس مجھے یہ ہے کہ میں اپنی کمان آپکے مضبوط اور قابل ترین ہاتھوں

ہیں دے رہا ہوں۔"

جنگ اگرچہ ختم ہو گئی تھی۔ لیکن مصطفٰے کمال پاشا نے اپنی فوجوں کی ترتیب نہیں توڑی۔ بلکہ فوجیں جہاں پڑی ہوئی تھیں وہیں انھیں پڑا رکھا۔ اور شب و روز انھیں اور زیادہ مضبوط کرنے میں مصروف رہے۔ کچھ دنوں بعد انگریزوں نے اسکندرونہ پر قبضہ کرنا چاہا۔ مصطفٰے کمال پاشا نے فوراً انھیں متنبہ کیا کہ اسکندرونہ کی طرف قدم بڑھانے کے معنی لڑائی کے ہوں گے۔ انگریزوں نے باب عالی میں شکایت کی۔ قسطنطنیہ سے عزت پاشا وزیر اعظم کا تار آیا کہ اسکندرونہ پر انگریزوں کو قبضہ دیدو۔ مصطفٰے کمال پاشا نے جواب دیا۔ اس وقت ہمیں دبنا نہیں چاہیئے اگر ہم ذرا بھی دبے تو تباہ ہو جائیں گے۔

مصطفٰے کمال پاشا بدستور اپنی فوجوں کو مضبوط اور لڑائی کیلئے تیار کرتے رہے۔ لیکن انگریزوں نے اسکندرونہ پر قبضہ نہیں کیا۔ کچھ دنوں بعد عزت پاشا کا پیغام آیا کہ فوراً قسطنطنیہ پہونچو۔ عزت پاشا اور سلطان میں انور، طلعت اور جمال کی فراری کے سلسلہ میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ اور عزت پاشا نے استعفیٰ دیدیا تھا۔ اور ان کی جگہ توفیق پاشا وزیر اعظم بن گئے تھے۔ یہ توفیق پاشا عبد الحمید کے زمانہ کی نہایت کمزور قسم کے وزیر اور انگریزوں کے دوست تھے۔ مصطفٰے کمال پاشا اس خبر کے ملتے ہی اپنی کمان علی فواد کو سونپ کر قسطنطنیہ روانہ ہو گئے۔

باب (۱۲)

قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ اور سلطان کی بے بسی

مصطفےٰ کمال پاشا نے قسطنطنیہ پہونچکر یہ دیکھا کہ انگریزوں کے جنگی جہاز باسفورس میں اور انگریزی فوجیں دردانیال کے قلعہ اور پایہ تخت کے اطراف کی اہم چوکیوں پر قابض ہیں۔ فرانسیسی فوجیں استنبول اور غلط میں پڑی ہوئی ہیں۔ اور اطالوی فوجوں نے ترکی ریلوے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ شہر میں اتحادیوں کی پولیس انتظام کرتی ہے۔ اور ترکی فوجیں اور پولیس دونوں کو منتشر کیا جاچکا ہے۔ سلطنت عثمانیہ توختم ہو ہی چکی تھی۔ شام، فلسطین اور عرب اس کے ہاتھ سے نکل ہی چکے تھے۔ یورپین ترکی کا جو حصّہ جنگ بلقان کے بعد ترکوں کے ہاتھ میں رہ گیا تھا اس جنگ میں اس کی بھی تکّہ بوٹی ہوچکی تھی۔ ایک قسطنطنیہ رہ گیا تھا۔ جہاں ترکی کا سلطان اور مسلمانوں کا خلیفہ تو برائے نام موجود تھا۔ لیکن محض بے دست و پا۔ عملاً وہاں پر بھی اتحادیوں کا قبضہ اور انہی کی حکومت تھی۔ انور، طلعت اور جمال ترکی سے فرار ہوچکے تھے۔ انجمن اتحاد و ترقی کے ممبر ادھر ادھر شہروں میں چھپے بیٹھے تھے اور عزت پاشا کی حکومت جو انور پاشا کی فراری کے بعد قائم ہوئی تھی کسی قدر آزاد خیال تھی اس لئے اتحادیوں کے اشارے سے ایک مہینے بعد توڑ دی گئی۔ اور عزت پاشا کی جگہ انگریزوں کے مشہور اور دیرینہ رفیق توفیق پاشا نے وزارت سنبھال لی تھی۔ اگرچہ اس وزارت میں جنرل فیفی کرنل عصمت اور کپتان رؤف کو بھی شامل کر لیا

گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بے انتہا کمزور وزارت تھی جو اتحادیوں کے اشارے پر رقص کرتی اور سلطان وحید الدین کی طرح اپنی قسمت پر شاکر معلوم ہوتی تھی۔

پایہ تخت کا یہ حال دیکھکر مصطفےٰ کمال پاشا کو بڑا رنج ہوا۔ لیکن ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ سب سے پہلے وہ عزت پاشا سے ملے۔ اور وزارت چھوڑ دینے پر انھیں خوب ملامت کی۔ عزت پاشا نے عذر کیا کہ " انور، طلعت اور جمال کو چونکہ میں نے ترکی سے نکل جانے دیا۔ اس لئے سلطان اور اتحادی دونوں میرے دشمن ہو گئے۔ مجھے چاہے انور اور انکی پارٹی سے کتنا ہی اختلاف ہو لیکن تھے وہ ترک۔ اور میری عزت کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ میں ان تینوں کو پکڑ کر اتحادیوں کے حوالے کر دیتا۔"
مصطفےٰ کمال پاشا نے عزت پاشا کے اس جذبہ کی تو قدر کی لیکن ساتھ ہی توفیق جیسے ناکارہ آدمی کیلئے وزارت خالی کرنیکی انھوں نے سختی سے مذمت کی۔ اور کہا" آپ کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں تھا کہ آپ وزارت کی امانت ایک خائن کے سپرد کرتے" غرض عزت پاشا کو مصطفےٰ کمال پاشا نے آمادہ کر لیا کہ وہ اپنی ایک پارٹی بنائیں اور توفیق پاشا سے وزارت چھین لیں۔ چنانچہ اس پارٹی کی داغ بیل ڈال دی گئی اور زور شور سے کام ہونے لگا۔ اس وقت قسطنطنیہ میں کئی سیاسی پارٹیاں تھیں۔ ایک انگریزوں کے زیر سایہ ترکی پر حکومت کرنی چاہتی تھی، ایک فرانسیسوں اور اطالویوں کو ترجیح دیتی تھی۔ تو ایک امریکہ کو۔ مصطفےٰ کمال پاشا کو ان میں سے کسی پر اعتماد نہ تھا۔ وہ اس کے قائل ہی نہ تھے کہ باہر کی امداد سے ترکی کو سنبھالا جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایسی سیاسی پارٹی بنے جو صرف ترکوں پر مشتمل ہو اور جسے باہر کی امداد کی بجائے خود اپنی امداد پر بھروسہ ہو۔ رات اور دن ایک کر کے مصطفےٰ کمال پاشا نے اس مقصد کے لئے کام کیا۔ لیکن کسی سیاسی پارٹی کو وہ توڑ نہ سکے۔ ہر شخص پر اس وقت

یاس و حسرت کا عالم طاری تھا اور کسی دماغ میں یہ غور کرنے کی صلاحیت نہ رہی تھی کہ خود ترکی میں بھی اپنے آپ کو سنبھالنے کی ہمت ابھی باقی ہے ۔ مصطفےٰ کمال پاشا کی ناکامی کی یہی وجہ ہوئی ۔ اگرچہ انھوں نے بڑی کوشش سے توفیق پاشا کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پارلیمنٹ میں پیش کرائی اور مختلف سیاسی پارٹیوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اس تجویز کی حمایت میں ووٹ دیں ۔ لیکن جب ووٹ دینے کا وقت آیا تو مصطفےٰ کمال پاشا نے خود گیلری میں سے یہ تماشا دیکھا کہ ترکی پارلیمنٹ کے کسی ممبر کو توفیق پاشا کے خلاف ووٹ دینے کی جرأت نہ ہوئی ۔ اس حقیقت کے بے نقاب ہونے پر مصطفےٰ کمال پاشا کو بڑا غصہ آیا اور ان کو یقین ہو گیا کہ ایسی ناکارہ پارلیمنٹ اور اس قدر بودے کیبنٹ کے ساتھ ترکی سلطنت کو کسی طرح نہیں بچایا جا سکتا ۔ جمعہ کو مصطفےٰ کمال پاشا سلطان وحید الدین سے ملے اور انھیں باتوں باتوں میں وزارت اور پارلیمنٹ کی کمزوری کی طرف توجہ دلائی ۔ اور سلطان پر زور دیا کہ اس پارلیمنٹ کو برخاست کر دیں اور وزارت کو توڑ دیں ۔ اور ایسی مضبوط وزارت بنائیں جو اس موقع پر ترکی کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو سنبھال لے ۔ سلطان نے بہت توجہ سے مصطفےٰ کمال پاشا کی باتیں سُنیں اور دوسرے دن توفیق پاشا کی وزارت کو انھوں نے توڑ بھی دیا ۔ اور نئی وزارت داماد فرید کی صدارت میں بنائی ۔ جو اگرچہ سلطان کے برادر نسبتی تھے لیکن پالیسی کے اعتبار سے توفیق سے بھی گئے گذرے تھے ۔ وزارت کی اس تبدیلی کا الزام عام طور پر مصطفےٰ کمال پاشا پر لگایا جا رہا تھا ۔ لیکن خود مصطفےٰ کمال پاشا کو اس وزارت میں بھی کوئی جگہ نہیں ملی تھی ۔ اور نہ ایسی عجیب تبدیلی مصطفےٰ کمال پاشا کی رائے سے ہوئی تھی ۔ وہ عزت پاشا کو دوبارہ وزیر اعظم بنانا چاہتے تھے ۔ اور خود وزیر حرب ہونا چاہتے تھے ۔ یہ دونوں باتیں ان کی پوری نہیں ہوئیں اور بدنام مفت میں ہو گئے ۔ سیاسی پارٹیاں بھی ان سے بدکنے لگیں اور ترکی افسروں

یں بھی سلطانی تقرب کی وجہ سے یہ بے تکلف نہ ہو سکے۔

قسطنطنیہ اور سلطان کا یہ رنگ دیکھکر مصطفےٰ کمال گوشہ نشین سے ہو گئے۔ اور اپنی والدہ اور بہن مقبولہ سے علیحدہ ایک مکان کرایہ پر لیکر رہنے لگے۔ وہ اگرچہ روز اپنی والدہ اور بہن سے ملنے جایا کرتے تھے۔ لیکن ان کے ساتھ رہنا انھیں پسند نہ تھا۔ اس گوشہ نشینی کے زمانہ میں ان کے دوست بہت کم ہو گئے تھے۔ صرف ایک کرنل عارف ایسے تھے جنھیں مصطفےٰ کمال پاشا سے شدید محبت تھی۔ اور وہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا انہی سے بے تکلف بھی تھے۔ وہ کرنل عارف سے اپنے دل کا حال نہیں چھپاتے تھے۔ پایہ تخت میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کو اس طرح حکومت کرتے دیکھکر ان کا خون کھولنے لگتا۔ اور یہ سُن کر کہ خاص قسطنطنیہ میں دیسی عیسائی ترکی عورتوں کو چھیڑا کرتے ہیں وہ اپنی بوٹیاں غصہ سے نوچنے لگتے۔ لیکن مجبور تھے۔ کوئی صورت ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ کس طرح ترکی کی کھوئی ہوئی عزت کو دوبارہ حاصل کریں۔ سلطان اس قدر بزدل اور ڈرپوک تھے کہ ترکی کو بچانیکی معمولی سے معمولی تجویز بھی سُننا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ صرف اپنے تخت کی خیر منائے جارہے تھے۔ اور بیوقوفی سے یہ سمجھے ہوئے تھے کہ تخت کی خیر اسی میں ہے کہ کان دبا کر اتحادیوں کے احکام مانے جاتے رہیں۔ رہی حکومت وہ سلطان کی مرضی اور اتحادیوں کے اشاروں پر رقص کرنے میں اپنی زندگی اور سلامتی سمجھ رہی تھی۔ اور جو سیاسی پارٹیاں تھیں وہ بھی اتحادیوں میں سے کسی نہ کسی قوت کا توسل لیکر برسر اقتدار آنا چاہتی تھیں۔ اور ترکی اور اس کی عظمت رفتہ کا نہ کسی کو احساس تھا نہ خیال۔ مصطفےٰ کمال پاشا اگرچہ گوشہ نشینوں کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور اپنے خیالات بھی عام طور پر ظاہر کرنے سے پرہیز کرنے لگے تھے۔ لیکن اتحادیوں کو ان کے اصلی خیالات

کی بھنک پہونچ چکی تھی۔ اور اسی وجہ سے انھوں نے مصطفےٰ کمال پاشا کی نگرانی شروع کردی تھی۔ اور اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں اور لوگوں کے ساتھ مصطفےٰ کمال پاشا کو گرفتار کرکے نظر بند نہ کردیں۔

جنوری ۱۹۱۹ء میں اتحادیوں کی فوجیں ترکی میدانِ جنگ سے واپس ہونی شروع ہوئیں۔ اور خود اٹلی، انگلستان اور فرانس میں اندرونی جھگڑے جو جنگ کی رجعت تھے پیدا ہونے شروع ہوگئے۔ پیرس میں پریسیڈنٹ ولسن کی صدارت میں جو صلح کی کانفرنس ہو رہی تھی اسے جرمنی ہی سے اتنی فرصت نہیں تھی کہ ترکی کی طرف توجہ کرتی۔ اور قسطنطنیہ میں یہ صورت پیدا ہوگئی تھی کہ اتحادی افسر ایک دوسرے سے اپنے اپنے تجارتی مفاد کی خاطر لڑے مرتے تھے۔ اس حالت کو دیکھکر مصطفےٰ کمال پاشا کو ایک ہلکی سی امید کی کرن نظر آئی۔ اس وقت وزارت میں جنرل فیضی۔ کرنل عصمت اور کپتان رؤف بھی شامل تھے۔ اور یہ تینوں مصطفےٰ کمال پاشا کے دوست تھے۔ اور یہ لوگ مصطفےٰ کمال پاشا کی خفیہ خفیہ مدد کرسکتے تھے۔ مگر قسطنطنیہ میں بیٹھکر کوئی کام نہیں ہوسکتا تھا البتہ اناطولیہ اس کیلئے بہترین میدان تھا۔ چنانچہ مصطفےٰ کمال پاشا کے اشارے سے اناطولیہ میں مختلف جماعتیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جنھوں نے اتحادیوں کے قبضہ کے خلاف عوام میں پروپیگنڈا شروع کردیا۔ اور کاظم قرہ بکر کی چھ ڈویژنوں نے ہتیار ڈالنے سے انکار کردیا۔ اتحادی اس نئی صورت حال کا انسداد کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کیلئے انھوں نے سلطان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اپنی فوجوں کے ہتیار کسی افسر کو بھیجکر رکھوالیں اور سپاہیوں کو چھٹی دے دیں۔ قسمت دیکھئے یا تو مصطفےٰ کمال پاشا کی گرفتاری اور نظر بندی کی افواہ تھی۔ یا سلطان نے انھیں اناطولیہ کی فوجوں پر انسپکٹر جنرل مقرر کردیا اور انھیں ہدایت

کی کہ وہ فوراً اناطولیہ پہونچکر ترکی فوجوں کو منتشر کر دیں۔ انگریزوں کو مصطفےٰ کمال پاشا کے تقرر پر اعتراض ہوا۔ اور انھوں نے اپنی خفیہ اطلاعات کی بنا پر مصطفےٰ کمال پاشا کو اس منصب پر مقرر کرنے سے روکا۔ لیکن داماد فرید پاشا نے یہ کہہ کر انگریزوں کا اطمینان کر دیا کہ مصطفےٰ کمال پاشا کے متعلق ساری اطلاعات بے بنیاد ہیں۔ اور وہ کوئی کام سلطان کی مرضی کے خلاف نہ کریں گے۔ جیسے ہی مصطفےٰ کمال پاشا کے پاس اناطولیہ کی فوجوں کے انسپکٹر جنرل اور مشرقی صوبوں کے گورنر جنرل مقرر کئے جانیکا سلطانی فرمان پہونچا۔ یہ اسی وقت جانے کیلئے تیار ہو گئے۔ اپنی والدہ اور بہن سے ملے۔ اپنے سارے دوستوں سے خفیہ ملاقاتیں کیں اور ایک معمولی جہاز پر شام ہونے سے پہلے قسطنطنیہ سے روانہ ہو گئے۔ کپتان رؤف انھیں جہاز پر پہونچانے آئے تھے۔ جہاں انھوں نے مصطفےٰ کمال پاشا کو یہ اطلاع دی کہ یونانیوں نے سمرنا پر حملہ کر دیا ہے۔ اس جہاز پر مصطفےٰ کمال پاشا کے ساتھ کرنل عارف اور کرنل رفعت بھی تھے۔

اس سفر میں مصطفےٰ کمال پاشا نے ساری احتیاط برطرف کر دی۔ اور خوب کھل کر باتیں کیں۔ اور اپنی ساری اسکیم جس پر وہ اناطولیہ میں عمل کرنا چاہتے تھے ان دونوں پر ظاہر کر دی۔ اِدھر قسطنطنیہ کا حال سنئے۔ مصطفےٰ کمال پاشا کے چلے جانیکے بعد داماد فرید پاشا کو معتبر ذریعہ سے یہ علم ہوا کہ اناطولیہ کی قومی تحریک کے بانی مبانی یہی مصطفےٰ کمال پاشا تھے۔ اور انہی کے اشارے پر وہاں یہ گڑبڑ شروع ہوئی تھی اب یہی وہاں سلطان کے نمایندہ خاص کی حیثیت سے بھیجدیئے گئے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی داماد فرید اس قدر گھبرائے کہ اسی وقت بھاگے ہوئے سلطان وحیدالدین کو اطلاع دینے گئے۔ اور ان کے حکم اور مشورہ سے رات کے بارہ بجے برطانوی

چیف کمشنر کے گھر پہونچے اور انھیں بچھونے پر سے اٹھا کر مصطفےٰ کمال پاشا کے متعلق جو اطلاع انھیں ملی تھی وہ سنائی۔ اور اس سے درخواست کی کہ اناطولیہ پہونچنے سے پہلے پہلے ان کے جہاز کو روک لینے کی تدبیر کی جائے۔ برطانوی چیف کمشنر نے بھی گھبرا کر راتوں رات مصطفےٰ کمال پاشا کے جہاز کی تلاش کا حکم دیا۔ لیکن داماد فرید اور برطانوی چیف کمشنر کی یہ ساری دوا دوش بیکار گئی۔ اور کمال پاشا اپنے دونوں ساتھیوں کرنل عارف اور کرنل رفعت کے ساتھ ۱۹۔ مئی ۱۹۱۹ء کو بندرگاہ سمسون پر بہ خیر و عافیت پہونچ گئے۔

باب (۱۳)

قومی تحریک کا آغاز

سموں پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ جہاں مصطفےٰ کمال پاشا کی ہر ہر نقل وحرکت پر نگرانی رکھی جانے لگی۔ کچھ دنوں تو مصطفےٰ کمال بڑی احتیاط سے کام کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک عذر تراش کر اپنا مستقر کاوآسا کو قرار دیا۔ اور کاوآسا سے کچھ دنوں بعد اماسیہ آ گئے۔ یہ مقام ساحل سے بہت دور اور اناطولیہ کے قلب میں واقع ہے۔ اور یہاں انگریز جاسوسوں کا بھی گذر نہیں تھا۔ اس لئے یہاں پہونچ کر مصطفےٰ کمال پاشا نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس جگہ ہم یہ اور بتا دینا چاہتے ہیں کہ اناطولیہ میں جنگ عظیم کے ختم ہو جانیکے بعد ایک طرح کی طوائف الملوکی پیدا ہو گئی تھی۔ جنگ کے خاتمہ کے وقت جو ترکی افسر یہاں رہ گئے تھے وہ ایک طرح سے خودمختار سے تھے۔ ان میں علی فواد، ادھم، اور رفعت قابل ذکر ہیں۔ اور رؤف بے جو قسطنطنیہ میں وزیر بحر بنائے گئے تھے وہ بھی مستعفی ہو کر اناطولیہ آ گئے تھے۔ اور سمرنا کے گرد پہاڑیوں میں ترکوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں نالرہ یونانیوں پر چھاپے مارنے میں مصروف تھے۔ اگرچہ ان سب ترکی افسروں کے دل میں یہی تمنا تھی کہ کسی طرح یہ اپنی سرزمین سے دشمنوں کو نکال دیں۔ اور یہ سب کے سب اس کیلئے اپنی سی کوشش بھی کر رہے تھے لیکن ان میں تنظیم نہیں تھی۔ اور نہ ان کا کوئی مرکز تھا۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے اماسیہ کو

اپنا مستقر قرار دینے کے بعد پہلا کام یہی کیا کہ علی فواد، رؤف اور رفعت کے نام تار بھیجے کہ فوراً مستقر آئیں۔ جب یہ لوگ اماسیہ پہونچے تو مصطفےٰ کمال پاشانے ایک خفیہ کانفرنس کی جس کی روئداد کرنل عارف لکھتے جاتے تھے۔ اس کانفرنس میں بحث مباحثہ کے بعد یہ طے ہوا کہ دشمن سے مقابلہ ہی اب آخری چارہ کار رہے۔ اوراس کے سوا اور کوئی صورت ترکی کو دشمنوں سے پاک کرنیکی نہیں ہوسکتی۔ سلطان کی حکومت اس وقت بے بس اور اتحادیوں کے قبضہ میں ہے۔ اس سے امداد کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی اس لئے طے یہ پایا کہ ساری مغربی فوجوں کی کمان علی فواد کریں۔ مشرقی فوجیں کاظم قرہ بکر کی ماتحتی میں رہیں اور قلب کی فوجوں کی کمان مصطفےٰ کمال پاشا کو دی جائے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی طے ہوا کہ جب تک قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا اثر ہے اناطولیہ میں ایک عارضی حکومت قائم کی جائے۔ اور اس حکومت کے قیام کیلئے سیواس کے مقام پر سارے ترکی نمائندے جمع ہوں۔

جب اس فیصلہ کی اطلاع سارے ترکی افسروں کو بذریعہ تار دی گئی تو کاظم قرہ بکرنے دیاربکر سے اور ایڈریانوپل سے کرنل جعفرطیار نے اپنی رضامندی تار کے ذریعہ ظاہر کردی۔ اس طرح مصطفےٰ کمال پاشا نے اناطولیہ کی طوائف الملوکی کو ختم کر کے سب ترکی فوجی افسروں کو ایک مرکز پر جمع کر دیا۔

فوجی افسروں کو راضی کر کے مصطفےٰ کمال پاشا نے ملک کے طول وعرض کا دورہ شروع کر دیا۔ اور دن رات کی سرگرم مشقت سے انھوں نے ہر ہر گاؤں میں ایک ایک کمیٹی بھی بنا ڈالی جو قوم پرستوں کو دشمنوں سے لڑنے کیلئے والنٹیر بھی دے اور۔ اور قومی فوج کے کھانے پینے کا بھی بندوبست کرے۔ یہ کام بڑا مشکل تھا تھکے ہوئے ترکوں کو جگانا اور ان کو اپنا قومی فرض جتانا آسان نہ تھا۔ خاصکر ایسی صورت میں

جبکہ کامیابی کی بھی کوئی خاص صورت باقی نہ رہ گئی ہو۔ لیکن مصطفےٰ کمال پاشا کی لغت میں نپولین بوناپارٹ کی طرح "ناممکن" کوئی لفظ ہی نہ تھا ۔ ان کے جوش اور سرگرمی کو دیکھکر اور لوگ بھی بے خود ہوئے جاتے تھے۔ اور جہاں جہاں مصطفےٰ کمال پاشا جاتے وہاں وہاں ترکوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہو جاتا اور وہ بڑے جوش سے دشمن سے ایک آخری مقابلہ کی تیاریاں کرنے لگتے۔ خاصکر مشرقی اضلاع میں مصطفےٰ کمال پاشا کا کام نسبتاً بہت آسان ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ انگریزوں نے آرمینیہ میں جمہوریت قائم کر دی تھی۔ اور آرمینیہ والوں سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ صلح کے بعد ترکی کے شمالی اضلاع اس جمہوریت میں شامل کر دیئے جائیں گے۔ اس خبر سے مقامی ترکوں میں پہلے ہی سے اشتعال پیدا ہو گیا تھا۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا کی ذرا سی چھیڑ سے وہ مرنے مارنیکو آمادہ ہو گئے۔ دَورے سے واپس آکر مصطفےٰ کمال پاشا نے فوج کے سارے کمانڈروں کے نام ایک حکم جاری کیا کہ انگریزوں کو ہتیار نہ دیئے جائیں اور نہ فوجوں کو منتشر کیا جائے۔ بلکہ جو لوگ چھٹی پر ہوں ان کو بھی اپنی اپنی رجمنٹ میں واپس بلا لیا جائے۔ اور شہری حکام کو مصطفےٰ کمال پاشا نے یہ حکم بھیجا کہ سرکاری محاصل برابر وصول ہوتے رہیں اور قسطنطنیہ بھیجنے کے بجائے ان کے مُستقر اماسیہ میں بھیجے جائیں ۔

ان سرگرمیوں کی اطلاعیں جب قسطنطنیہ پہونچیں تو اتحادیوں کو بڑا غصہ آیا۔ اور انھوں نے سلطان کو دھمکیاں دینی شروع کیں کہ جلد اس سرکش آدمی کو اناطولیہ سے واپس بلاؤ ورنہ ہم اس کا بدلا تم سے لیں گے ۔ سلطان وحید الدین بھی بہت بگڑے کہ ان کو میں نے اناطولیہ اس لئے بھیجا تھا کہ فوجوں کو منتشر کر دیں ۔ یہ وہاں جاکر الٹے ان کی تنظیم اور ترتیب میں مصروف ہو گئے۔ سلطان کے نزدیک اس وقت کسی

قسم کا مقابلہ ترکی کو اور زیادہ نقصان پہنچاتا تھا۔ اور ترکی سے زیادہ وحید الدین کو اپنے تخت کی پڑی تھی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کا تخت اتحادیوں کے زیر سایہ ہی قائم رہ سکتا ہے۔ اور اس کے قائم رکھنے کیلئے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی خوشامد درامد بھی ضروری ہے۔ غرض انہی خیالات کے ماتحت سلطان نے مصطفےٰ کمال پاشا کو تار بھیجا کہ فوراً قسطنطنیہ آجائیں۔ اس تار کے جواب میں مصطفےٰ کمال پاشا نے سلطان کے نام تار کے ذریعہ ایک طویل عرضداشت بھیجی جس میں ان سے یہ درخواست کی کہ "اس موقع پر قوم پرستوں کی راہ میں روڑے نہ اٹکانے چاہئیں بلکہ بہ حیثیت ترکی لیڈر کے سلطان خود قسطنطنیہ سے اناطولیہ آجائیں۔ اور قوم پرستوں کی قیادت کریں۔"

رات بھر مصطفےٰ کمال پاشا اس تار کی جواب کے انتظار میں تار گھر میں بیٹھے رہے لیکن سلطان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ البتہ صبح کو ایک اور سخت حکم انھیں قسطنطنیہ سے ملا کہ "فوراً واپس آؤ۔" مصطفےٰ کمال پاشا نے جواب میں اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور لکھا کہ میں اس وقت تک اناطولیہ میں ٹھیروں گا جب تک قوم کو آزادی حاصل نہ ہو جائیگی۔ اس جواب پر سلطان نے انھیں فوج کی کمان سے علیحدہ کر دیا۔ اور اناطولیہ کے سارے فوجی اور شہری حکام کو یہ فرمان بھیجدیا کہ مصطفےٰ کمال پاشا کے احکام کی تعمیل نہ کریں۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے خود بھی فوج کی کمیشن سے استعفےٰ دیدیا۔ اور سارے فوجی افسروں کو بلا کر یہ اعلان کر دیا کہ مرکزی حکومت ہمارے خلاف ہو گئی ہے اور میں نے فوج میں اپنے کمیشن سے استعفےٰ دیدیا ہے۔ اب ہمیں جو کچھ کرنا ہے اپنے بل پر کرنا ہے۔ اب آپ اپنے لئے ایک لیڈر تجویز کر لیجئے جو اس نیک مقصد میں آپ کی رہنمائی کرے۔ اگر آپ نے مجھے اپنا لیڈر منتخب کیا تو آپ کو ہر حال میں میرا ساتھ دینا ہوگا۔ اور میرے حکم کو بلا عذر و حیلہ

تسلیم کرنا ہوگا۔

اس کانفرنس نے بالاتفاق نہایت جوش وخروش سے مصطفےٰ کمال پاشا کو اپنا لیڈر تسلیم کرلیا۔ اوران کی اطاعت اور فرمانبرداری کی شرط منظور کرلی البتہ رؤف اور کاظم قرہ بکر نے اپنی طرف سے یہ شرط پیش کی کہ سلطان کی مخالفت نہ کی جائیگی۔ اور نہ انھیں برخواست کیا جائیگا۔ اس کو مصطفےٰ کمال پاشا نے تسلیم کرلیا۔ اس طرح اناطولیہ کی قومی تحریک اپنی حیات کی پہلی منزل طے کرگئی۔

باب (۱۴)

قومی حکومت کی پہلی منزل۔ پہلی ترکی کانگریس کا فیصلہ

فوجی افسروں کی تائید سے قومی تحریک کی پہلی منزل بخیر و خوبی طے ہو گئی۔ اب ٹی کی کانگریس کی رائے سے عارضی حکومت کے قیام کا مرحلہ پیش تھا۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے اس کانگریس میں شرکت کیلئے دعوت نامے ترکی کے سارے ضلعوں اور صوبوں کے افسروں کے پاس بھیج دیئے تھے۔ اور ہر جگہ سے تین تین نمائندے کانگریس میں شرکت کیلئے سیوا اس بلائے گئے۔ اور ہدایت کی تھی کہ اپنی نقل و حرکت میں انتہائی رازداری سے کام لیا جائے۔ اس کانفرنس کی اطلاع جب اتحادیوں کو اور سلطان کو قسطنطنیہ میں خبر پہنچی۔ تو کاظم قرہ بکر کو فرمان بھیجا کہ مصطفےٰ کمال پاشا کو گرفتار کر لیا جائے اور جو لوگ کانگریس میں شریک ہونیکو آئیں انھیں اپنے اپنے ضلعوں میں واپس بھیجدیا جائے۔ یہ وقت مصطفےٰ کمال پاشا کے لئے بڑا سخت تھا۔ کاظم قرہ بکر پرانے قسم کے ترکی جنرلوں میں تھے جو پرانی روایات کا از حد احترام کرتے ہیں اور کسی طرح یہ برداشت نہیں کرسکتے کہ خلیفۃ المسلمین کے حکم سے روگردانی بھی کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ کاظم قرہ بکر نے یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ مصطفےٰ کمال پاشا کا ساتھ دیں گے لیکن جب سلطان نے ان کی گرفتاری کا حکم دیدیا تو وہ سوچ میں پڑ گئے کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے اس مسئلہ کو طے کرنے کیلئے "ارض روم" میں ایک کانفرنس بلائی گئی جس میں مصطفےٰ کمال پاشا اور رؤف بے نے مرکزی حکومت کی پوزیشن پر بڑی صفائی سے روشنی

ڈالی۔ اور یہ ثابت کیا کہ سلطان اور ان کی حکومت اس وقت دشمنوں کے قبضے میں ہے اس لئے ان کے احکام اور قوانین بے لاگ اور منصفانہ نہیں کہے جا سکتے۔ بلکہ یہ دشمن کے اشارے سے جاری ہوئے ہیں۔ اس لئے قوم کے لئے یہ قابل عمل نہیں ہو سکتے۔ اس کانفرنس کی بحثوں سے کاظم قرہ بکر کی بڑی تالیفِ قلب ہوئی اور انھوں نے سلطان کے حکم کو پسِ پشت ڈال کر مصطفےٰ کمال پاشا کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کردی۔ اسی کانفرنس نے مصطفےٰ کمال پاشا کو "سیواس" میں ہونیوالی کانگریس کا چیرمین بھی منتخب کردیا۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا باقاعدہ قومی تحریک کے رہنما تسلیم کر لئے گئے۔

ادھر سیواس میں کانگریس کی تیاریاں ہو رہی تھیں ادھر سلطان نے پولیس کو حکم دیا کہ کانگریس میں شامل ہونیوالے ممبروں کو راستہ ہی میں گرفتار کرے۔ لیکن اس کا پتہ کانگریس کے ممبروں کو چل گیا تھا اس لئے سلطان کی تدبیر ناکام رہی اور چونکہ فوج اس کانگریس کے ساتھ تھی اس لئے سیواس میں گھس کر پولیس ان ممبروں کو گرفتار نہیں کر سکتی تھی۔ جب سلطان کی یہ تدبیر ناکام رہی۔ اور سیواس میں زور شور سے قوم پرستوں کی کانگریس شروع ہو گئی تو سلطان نے ایک اور چال چلی وہ یہ کہ مذہب کے نام سے کردوں کو ابھارا کہ وہ قوم پرستوں پر حملہ کر دیں۔ اور انھیں گرفتار کر لیں۔ کانگریس کے نمائندوں کو جب اس کا علم ہوا تو انھیں بڑا غصہ آیا۔ ترکوں کی اس سے زیادہ اور کیا توہین ہو سکتی تھی کہ ان کی گرفتاری کیلئے کردوں کو مقرر کیا جائے۔ کانگریس نے بالاتفاق مصطفےٰ کمال پاشا سے درخواست کی کہ وہ کردوں کی سرکوبی کے لئے اپنی قیادت میں ایک مہم بھیجیں۔ چنانچہ مصطفےٰ کمال پاشا نے فوراً ایک ترکی ڈویژن کردوں کی سرکوبی کو بھیجا۔ جس نے کردوں کو شکستِ فاش دی اور سلطان کے پیغامبر

علی غالب کو مار کر اناطولیہ کے باہر بھگا دیا۔ علی غالب کے پاس سے کچھ کاغذ پکڑے گئے جن سے یہ ثابت ہوگیا کہ داماد فرید پاشا نے علی غالب کو کردوں کے پاس بھیجا تھا کہ وہ جمع ہو کر قوم پرستوں پر حملہ کردیں۔ سلطان کی اس حرکت سے کانگریس میں جان سی پڑ گئی۔ اور ترکوں کے نمائندوں نے کانگریس میں مصطفےٰ کمال پاشا کی زیر صدارت نہایت جوش وخروش کے ساتھ بالاتفاق ایک صلحنامہ مرتب کیا جس کا نام انھوں نے قومی معاہدہ رکھا۔ اور قسم کھائی کہ ہم اس وقت تک صلح نہ کریں گے جب تک ہمارا معاہدۂ اتحادی منظور نہ کرلیں، اسی کے ساتھ پارلیمنٹ کے ممبروں میں سے ایک ایگزیکٹیو کمیٹی بنائی۔ اور مرکزی حکومت سے بے نیاز ہو کر اناطولیہ کی حکومت اس کے سپرد کردی۔ علی غالب کے پاس سے جو کاغذات برامد ہوئے تھے ان سے چونکہ یہ ثابت ہوچکا تھا کہ داماد فرید نے کردوں کو ترکوں پر ابھارا تھا۔ اس لئے کانگریس نے قسطنطنیہ کی حکومت کو ایک الٹی میٹم بھیجا کہ فوراً داماد فرید کو وزارت سے علیحدہ کردیا جائے اور پارلیمنٹ کا نیا انتخاب کیا جائے۔ لیکن جب قسطنطنیہ سے اسکا کوئی جواب نہیں آیا تو مصطفےٰ کمال پاشا نے سارے علاقہ میں یہ حکم بھیجدیا کہ قسطنطنیہ سے سب قسم کے تعلقات منقطع کرلئے جائیں۔ اور مالگذاری بجائے قسطنطنیہ کے فوجی پارلیمنٹ کے صدر دفتر میں بھیجی جائے۔ اس حکم کا سلطان پر اثر پڑا۔ انھوں نے داماد فرید کو علیحدہ کردیا اور علی رضا ایک بوڑھے اور ناکارہ پاشا کو وزیر اعظم بنادیا۔ اور پارلیمنٹ کے دوبارہ انتخاب کا حکم دیدیا۔ پارلیمنٹ کے دوبارہ انتخاب میں قومی کانگریس کو بڑی زبردست اکثریت حاصل ہوئی۔ اس کامیابی سے مدہوش ہو کر کانگریس کے ممبروں نے اپنے پہلے ہی اجلاس میں جو الیکشن کے بعد کانگریس کے صدر مقام "انگورہ" میں ہوا تھا یہ تجویز پیش کردی کہ پارلیمنٹ کا آئندہ اجلاس قسطنطنیہ میں ہونا چاہیئے۔ اور اب کانگریس کو توڑ دینا چاہیئے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے ان دونوں تجویزوں کی مخالفت کی اور ممبروں کو سمجھایا

کہ کانگریس کو اس وقت تک نہ توڑو جب تک پارلیمنٹ کا رنگ نہ دیکھ لو۔ اور قسطنطنیہ میں پارلیمنٹ کا اجلاس کرنیکی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ قسطنطنیہ پر غیر ملکی حکومتوں کا قبضہ ہے۔ پارلیمنٹ ہرگز ایسے ماحول میں صحیح کام نہیں کرسکتی۔ اور اگر کوشش یہی کی گئی تو پارلیمنٹ توڑ دی جائیگی۔ اور اس کے ممبروں کو گرفتار کرلیا جائیگا۔ لیکن مصطفےٰ کمال پاشا کی نصیحت اب کے رائیگاں گئی۔ کانگریس کے ممبر اس سے بہت خوش تھے کہ وہ اب باغی نہیں رہے۔ بلکہ قوم کے منتخب نمائندے اور حکومت کے تسلیم شدہ ممبر ہیں۔ اور یہ نشہ ان پر کچھ ایسا سوار ہوا کہ مصطفےٰ کمال پاشا کی نصیحت نے ذرہ برابر بھی ان پر اثر نہ کیا۔ اور وہ رؤف بے کی قیادت میں پارلیمنٹ کا اجلاس قسطنطنیہ میں کرنے کے لئے روانہ ہوگئے۔ مصطفےٰ کمال پاشا "ارض روم" کی طرف سے نمائندہ تھے لیکن وہ پارلیمنٹ میں شرکت کیلئے نہیں گئے۔ انھیں یقین کامل تھا کہ یہ پارلیمنٹ قسطنطنیہ میں قطعی ناکام رہیگی۔ سلطان وحیدالدین کو وہ خوب جانتے تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ ذرا بھی پارلیمنٹ کی امداد نہ کریں گے۔ اور جب اتحادی پارلیمنٹ کو توڑ ڈالیں گے تو یہ سب لوگ بھاگے ہوئے میری پناہ میں آئیں گے اس بات کا مصطفےٰ کمال پاشا کو اس قدر یقین تھا کہ انھوں نے انگورہ میں پہلے ہی سے پارلیمنٹ کا انتظام کرنا شروع کر دیا۔ اور فوج کی داخلی اور خارجی تنظیم میں پوری سرگرمی سے متوجہ ہوگئے۔

باب ۱۵

پارلیمنٹ کے ممبروں کی گرفتاری اور قوم پرستوں کے خلاف سلطانی فوجوں کی روانگی

اب ادھر کا حال سنئے۔ پارلیمنٹ کے ممبر بڑے جوش و خروش سے قسطنطنیہ پہونچے اور پارلیمنٹ کے پہلے ہی اجلاس میں انھوں نے سلطان کی وفاداری کی تجویز بھی منظور کی۔ اور اطمینان سے کام شروع کر دیا۔ ان کے کام کرنیکا انداز قطعی آزادانہ تھا۔ یہ نہ سلطان کی طرف جھکے اور نہ اتحادیوں کی طرف۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان اور اتحادیوں نے ان کی کارروائیوں پر احتساب کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دنوں بعد اتحادیوں کے سپہ سالار نے ترکی وزیر حرب کو علیحدہ کرنیکا مطالبہ کیا۔ سلطان نے اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ اور وزیر حرب کو اپنی خدمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ پارلیمنٹ نے اس پر بڑا غل مچایا۔ اور اپنا وہ قومی معاہدہ شائع کر دیا جو ارض روم کی کانفرنس میں منظور ہوا تھا پارلیمنٹ کے ممبر دراصل اس پر پھولے ہوئے تھے کہ ترکی میں حالات ان کے حق میں بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ شام میں قوم پرستوں نے فرانسیسیوں کو دو جگہ شکست دی تھی کاکیشیا، کریمیا اور اناطولیہ سے برطانوی فوجیں واپس آچکی تھیں۔ اور اناطولیہ کے ترکی فوجی دستوں نے انگریزوں کے سامنے ہتیار ڈالنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اتحادیوں کے ایجنٹ جو ہتیار جمع کرنے کے لئے دورہ کر رہے تھے بے بس سے نظر آنے لگے تھے۔ پارلیمنٹ کے ممبران حالات میں یہ سمجھے ہوئے تھے کہ وہ اتحادیوں کو دبا کر ترکی کی کھوئے

ہوئے وقار کو حاصل کرلیں گے لیکن انگریزوں نے ترکوں کو اس قدر بڑھتا ہوا دیکھکر انھیں سزا دینے کی ٹھان لی۔ ۱۶- مارچ ۱۹۲۰ء کو انھوں نے ترکی کے جملہ شعبہ جات پر بقبضہ کرلیا۔ پارلیمنٹ کے اکثر ممبروں کو جن میں رؤف بے اور فتحی بے بھی شامل تھے مع شیخ الاسلام کے گرفتار کرلیا۔ اور ساٹھ آدمیوں کو نظر بند کرکے مالٹا بھیجدیا۔ اس پکڑ دھکڑ کو دیکھکر پارلیمنٹ کے بقیہ ممبر حکومت کے افسر اور قسطنطنیہ کے معزز ترک چھپ چھپ کر اناطولیہ کی طرف فرار ہونے لگے۔ جہاں مصطفےٰ کمال پاشا پہلے ہی سے ان باتوں کا اندازہ کئے ان کی آمد کے منتظر بیٹھے تھے۔ دفتر جنگ سے عصمت اور فیضی اور ڈاکٹر عدنان اور ان کی بیوی خالدہ ادیب بھی قسطنطنیہ سے فرار ہوکر مصطفےٰ کمال پاشا کے پاس انگورا آگئے۔

سلطان وحیدالدین نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اتحادیوں کی مدد سے قوم پرستوں کے خلاف خلیفہ سے بغاوت کرنیکا فتوےٰ صادر کردیا۔ اور باغیوں کی سرکوبی کیلئے اناطولیہ کے مشہور ڈاکو احمد انزور کی ماتحتی میں ایک بے قاعدہ فوج بھی بھیجی۔ جگہ جگہ سلطان کے ایجنٹوں نے قوم پرستوں کیخلاف پروپگنڈا شروع کردیا۔ اور مذہب کا نام لے لے کر ترکوں کو قوم پرستوں کے خلاف ابھارنے لگے۔ اسی کے ساتھ سلطان نے توفیق پاشا کو وزارت عظمےٰ سے ہٹادیا اور اپنے داماد فرید کو وزیراعظم بنادیا اور مصطفےٰ کمال پاشا کے متعلق ایک عام اشتہار شائع کردیا کہ جو ان کو اور ان کے گرد و بیش کے لوگوں کو قتل کردیگا وہ دنیا اور آخرت دونوں جہان میں انعام پائیگا۔ قوم پرستوں پر سلطان کی طرف سے اس قدر تیزی کے ساتھ یہ پے در پے حملے ہوئے کہ ایک دفعہ مصطفےٰ کمال پاشا کے حمایتیوں کے قدم بھی ڈگمگانے لگے سلطان کے ایجنٹوں کو جگہ جگہ کامیابی ہورہی تھی اور سلطان کی بے قاعدہ

فوجیں شہر پر شہر فتح کرتی ہوئی انگورا کی طرف بڑھی چلی آرہی تھیں مصطفےٰ کمال پاشا اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ انگورا کے مدرسہ زراعت میں بیٹھے یہ سب کچھ سُن رہے تھے۔ خود ان کے ہمراہیوں کرنل عارف، عصمت فیضی، خالدہ ادیب اور اونان کے چہروں پر بھی مایوسی کے آثار پائے جاتے تھے۔ لیکن مصطفےٰ کمال پاشا اپنے ماحول سے بے پرواجنگ کی کامیابی اور ناکامی کے قرائن وامکان پر غور کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں مصطفےٰ کمال پاشا اپنی کرسی سے اٹھے اور نہایت صاف اور بلند آواز میں انھوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "ہم لڑیں گے۔ آخر وقت تک یا تو فتح ہماری ہو گئی یا ہم صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے" مصطفےٰ کمال پاشا کے ان الفاظ سے ان کے ساتھیوں پر بھی جادو کا سا اثر ہوا۔ رفتہ رفتہ ان کی مایوسی رخصت ہوتی گئی۔ اور اس کی جگہ عزم و استقلال کی سُرخی آتی گئی۔ یہ واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے ساتھیوں کو مصطفےٰ کمال پاشا کی ذات پر پورا پورا اعتماد تھا اور وہ خوب سمجھتے تھے کہ اس عالم میں اگر ان کو کوئی تباہی سے بچاسکتا ہے تو وہ مصطفےٰ کمال پاشا ہی ہیں۔

مصطفےٰ کمال پاشا نے اس فیصلہ کے بعد دن اور رات ایک کر دیا۔ تھکی ماندی ترکی فوج کو سمیٹ کر دوبارہ مرتب کیا۔ ایک طرف سلطانی نے فوج کے مقابلہ کے لئے علی فواد کو بھیجا، دوسری طرف آرمینیہ کی بغاوت کو فرو کرنے کیلئے کاظم قرہ بکر کو روانہ کیا۔ اور خود انگورا میں بیٹھے ہوئے سلطانی زہر کے لئے تریاق بہم پہونچاتے رہے۔ جب ترکی دیہاتوں میں یہ اطلاع پہونچی کہ قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا اور سلطان نے انگریزوں کے حکم سے ترکی پارلیمنٹ کو بند کر دیا اور ممبروں کو نظر بند کر کے مالٹا بھیجدیا۔ تو سلطانی پروپیگنڈے کی ترکوں پر اصلیت کھل گئی اور انھیں یقین ہو گیا کہ یہ غدار سلطان اپنی غرض کیلئے ترکی کو اتحادیوں کے ہاتھ بیچ رہا ہے اور کسی ترک کو قسطنطنیہ سے کوئی توقع نہیں ہوسکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطانی فوجوں

سے جو ایک ڈاکو کی سرکردگی میں آگے بڑھ رہی تھیں عام ترکوں کی ہمدردیاں حاصل رہیں۔ اور وہ قوم پرستوں کے ساتھ ہو گئے۔ ہوا کا رُخ بدل گیا۔ ہر مقام پر سلطانی فوجوں کو شکست پر شکست ہوئی۔ بہت سے سپاہی سلطانی فوج سے ٹوٹ کر قوم پرستوں سے آملے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اناطولیہ سلطانی فوج سے خالی ہو گیا۔ اُدھر سے اطمینان کرنے کے بعد مصطفےٰ کمال پاشا نے فوراً پارلیمنٹ کے ممبروں کو انگورہ میں جمع کیا۔ اور پارلیمنٹ کا وہ اجلاس جو قسطنطنیہ میں سلطان کے حکم سے بند کر دیا گیا تھا انگورہ میں کھول دیا گیا۔ پہلے ہی اجلاس میں پارلیمنٹ کے ممبروں نے سلطان اور اس کی نام نہاد حکومت سے قطع تعلق کر لیا۔ اپنی پارلیمنٹ کا نام گرینڈ نیشنل اسمبلی رکھا۔ اور اس کا صدر بالاتفاق مصطفےٰ کمال پاشا کو منتخب کر لیا۔

باب (۱۶)

معاہدہ سیورے اور قوم پرستوں کی جدوجہد کا آغاز

گرینڈ نیشنل اسمبلی کے قیام کے بعد مصطفےٰ کمال پاشا نے اس کے صدر کی حیثیت سے یورپ کی سب سلطنتوں کے نام ایک اعلان بھیجا۔ جس میں یہ لکھا کہ قسطنطنیہ پر اتحادیوں کے نامنصفانہ قبضہ کے بعد ترک اپنے خلیفہ اور ترکی حکومت کو گرفتار سمجھتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے بڑے پیمانہ پر ایک قومی اجتماع کیا اور اس اجتماع میں انھوں نے گرینڈ نیشنل اسمبلی کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ اسمبلی اس وقت ترکی کی حکمراں ہے اور کوئی معاہدہ بغیر اس کی منظوری کے ترکی میں نافذ نہ ہو سکے گا۔

جب مصطفےٰ کمال پاشا کا یہ اعلان پیرس کی صلح کانفرنس میں پہونچا تو پریسیڈنٹ ولسن، مسٹر لائڈ جارج اور موسیو کلیمنسو جو سر جوڑے بیٹھے دُنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے ایک دفعہ چونک سے پڑے۔ ان کی سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ مُردہ ترکی میں ...... یہ جان کہاں سے پڑ گئی۔ اور یہ گرینڈ نیشنل اسمبلی کیا بلا ہے جس سے انھیں گفتگو کی دعوت دی گئی ہے۔ انھوں نے اس کو ترکوں کی بندر بھبکی قرار دیا اور اپنی قوت و شوکت کے زعم میں معاہدہ سیورے کا اعلان کر دیا۔ اس معاہدہ سیورے میں سمرنا اور مشرقی اور مغربی تھریس یونان کو، اور کردستان کا سارا علاقہ ملیشیا کے جنوب تک آرمینیہ کو دیدیا تھا۔ آبناؤں پر اتحادیوں کا قبضہ تسلیم کیا تھا۔ سلطنت کے مالیہ پر اتحادیوں کی نگرانی قائم کر دی تھی اور قانون "احتیارات" میں فسخ

اقوام کیلئے خاص رعایت رکھی تھی۔ ہر قسم کی بحری، بری اور فضائی فوج رکھنے کی ممانعت کر دی تھی۔ اور ملک کے اندرونی انتظام کیلئے صرف پندرہ ہزار پولیس رکھنے کی تجویز کی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ترکی اب کسی وقت میں بھی سر نہ اٹھا سکے۔ اس اعلان کا شائع ہونا تھا کہ ساری ترکی میں آگ سی لگ گئی۔ کیونکہ اس معاہدہ کو قبول کرنے کے معنی ترکی کی فوری موت تھی۔ ترکی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگ مصطفےٰ کمال پاشا کے حامی ہو گئے۔ اور انھیں یقین ہو گیا کہ مصطفےٰ کمال پاشا نے جو کہا تھا وہ صحیح تھا۔ سلطان کی حکومت حقیقتاً انھیں اتحادیوں کے ہاتھ بیچ رہی ہے گرینڈ نیشنل اسمبلی کے اجلاس نے معاہدہ سیورے کے انتہائی غیض و غضب میں پرزے اڑا دیئے۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا کو کامل اختیارات کے ساتھ دشمنوں سے نمٹنے کے لئے مقرر کر دیا۔

مصطفےٰ کمال پاشا نے اتحادیوں اور یونانیوں کے مقابلہ کیلئے ایک فوجی کیبنٹ بنائی جس میں بکر سمیع، ادنان اور فیضی شامل تھے۔ اور عصمت کو چیف آف اسٹاف مقرر کیا۔ سب سے پہلے شام کی سرحد سے فرانسیسیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو بازنطی میں روکا اور انھیں شکستِ فاش دیکر پیچھے ہٹا دیا۔ مشرق میں کاظم قرہ بکر نے آرمینیہ کی سرحدات کو شریر آرمینیوں سے پاک و صاف کر دیا۔ اس کے بعد مصطفےٰ کمال پاشا نے علی فواد کو ایشیا کی طرف سے اور جعفر طیار کو یورپ کی طرف سے قسطنطنیہ کی طرف بڑھنے کا حکم بھیجا۔ علی فواد نے "اسمد" پر سلطان کے حامیوں سے آخری مقابلہ کیا۔ اور انھیں مار بھگایا۔ اب علی فواد کے آگے صرف ایک میل کے فاصلہ پر انگریزی فوجیں رہ گئیں۔ قسطنطنیہ میں اتحادی فوجیں برائے نام تھیں اور اس موقع پر ان پر انتہائی بے بسی کا عالم طاری تھا۔ اٹلی اور فرانس میں خانہ جنگی

برپا تھی۔ اور وہ مزید فوجیں قسطنطنیہ بھیجنے کیلئے تیار نہیں تھا۔ انگلستان میں مسٹر لائڈ جارج کی حکومت کا زوال شروع ہوگیا تھا۔ اور برطانوی پارلیمنٹ نے ترکی سرزمین پر برطانوی فوجوں کو کٹوانیکی اجازت دینے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ اہلِ قسطنطنیہ کی اتحادی فوجوں کیلئے دو ہی صورتیں ممکن رہ گئی تھیں کہ یا تو وہ آخر دم تک لڑیں، یا اپنا بوریا بندھنا باندھ کر ترکی سے فرار ہو جائیں۔ برطانوی کمانڈر انچیف نے جو ساری اتحادی فوج کا کمانڈر بھی تھا، یہی تصفیہ کیا کہ قسطنطنیہ خالی کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے اہم کاغذات جلانے اور چپکے چپکے نکل چلنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن ابھی وہ اپنے فیصلہ پر عمل نہ کرنے پایا تھا کہ حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ پیرس کانفرنس کے مدبرین نے ترکی قوم پرستوں کو دبانے کی ایک اور چال سوچی اور وہ یہ کہ حکومتِ یونان کو جو وینیزولہ وزیر اعظم یونان کی ماتحتی میں اناطولیہ میں یونانی سلطنت کے خواب دیکھ رہی تھی گانٹھ لیا۔ اور اُسے اس پر آمادہ کر لیا کہ ترکی قوم پرستوں کی فوجیں قسطنطنیہ کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ یونان کی فوجیں سمرنا سے آگے اناطولیہ کی مغربی پہاڑیوں کی طرف پیش قدمی شروع کر دیں۔ اور اس ریلوے پر قبضہ کر لیں جو قوم پرستوں کی مغربی فوج کو انگورہ سے ملائے ہوئے ہے۔ اور اس کے معاوضہ میں یونان سے ایک بڑی سلطنت کا وعدہ بھی کر لیا گیا۔ وینیزولہ جو مدت سے ایسے سودے پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا جھٹ راضی ہوگیا۔ اور اس کے ساتھ ۲۲۔ جون ۱۹۲۰ء کو یونانی فوجوں نے تھریس اور اناطولیہ کے ہر محاذ پر پیش قدمی شروع کر دی۔ تھریس کی فوجوں نے جعفر طیار کی فوج کو آسانی سے گھیر لیا۔ اس لئے کہ اس غریب کو کسی طرف سے امداد نہیں پہونچ سکتی تھی۔ اور سمرنا پر جو یونانی فوج تھی۔ اس نے آگے بڑھکر "اسمد" پر پڑاؤ ڈال دیا۔ اور ترکی فوج کو وہاں سے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اسی کے ساتھ یونان کی دو ڈویژن ریلوے لائن پر قبضہ کرنیکی نیت سے آگے بڑھنے لگے۔ لیکن "اسکی شہر" کے

پاس پہونچ کر ان فوجوں کو ٹھہر جانیکا حکم ملا۔ اور یہ یہاں خندقیں کھود کر اپنی پوزیشن کو مضبوط بناتی رہیں۔

یونانیوں کی اس یکایک پیش قدمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی فوجیں قسطنطنیہ پر حملہ نہ کرسکیں۔ قوم پرستوں کے حوصلے پست ہوگئے۔ انگورہ میں مصطفےٰ کمال پاشا کے خلاف ایک ہیجان سا پیدا ہوگیا کہ یہی ترکی کو کانٹوں میں گھسیٹے جا رہے ہیں اور صلح نہیں ہونے دیتے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے بگڑی ہوئی مگر نادان پارلیمنٹ کے ممبروں کے آگے ایک نہایت جوشیلی تقریر کی۔ اور انھیں بتایا کہ صحیح حالات کیا ہیں۔ اور ترکی کا فائدہ اسی میں ہے کہ اناطولیہ میں یونانیوں کے قدم نہ جمنے پائیں۔ انھوں نے کہا کہ " کیا تم لوگ جو ترک کہلاتے ہو اس پر تیار ہو کہ یونانیوں سے جو کل تک تمھاری رعایا اور غلام تھے گڑگڑا کر صلح کی بھیک مانگو۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم لوگ اس قدر بے غیرت اور بے حمیت ہوگئے ہو کہ یہ ننگ اپنی قوم کے لیے برداشت کرلوگے؟ اب بھی وقت ہے اٹھو اور دشمنوں کو یہ بتا دو کہ اس عالم میں بھی تمھارے ہاتھ ضرب لگا سکتے ہیں۔ اور تمھارا لوہا کاٹ سکتا ہے۔ اور تم اپنے گھر کی بڑی خوبی سے حفاظت کرسکتے ہو میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ فتح تمھاری ہوگی "۔ مصطفےٰ کمال پاشا کی اس جوشیلی تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ پارلیمنٹ کے وہ ممبر جو ان کے خلاف تھے ، اپنی اس حرکت پر پارلیمنٹ کے کھلے اجلاس میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اور بالاتفاق مصطفےٰ کمال پاشا کو پورے اختیارات کے ساتھ دشمنوں کے مقابلہ کی اجازت دیدی۔

پارلیمنٹ کو راضی کرتے ہی مصطفےٰ کمال پاشا نے دن اور رات ایک کر دیا۔ نئی فوجیں بھرتی کرنی شروع کر دیں۔ اور سوئٹ روس سے معاہدہ کیا اس سے ہتھیار اور روپیہ قرض لیا۔ اور ان تھک محنت اور معجزانہ مہارت سے انھوں نے جھ ہی مہنے

میں ترکوں کا ایک اچھا لشکر فراہم کر لیا۔ ایک طرف مصطفےٰ کمال پاشا یونانیوں سے ایک فیصلہ کن مقابلہ کی تیاریاں کر رہے تھے ۔ دوسری طرف خود انگورہ میں ایک پارٹی ایسی بن گئی جو اس فیصلہ کن جنگ کے خلاف تھی اور وہ برابر مصطفےٰ کمال پاشا پر زور ڈال رہی تھی کہ فیصلہ کن مقابلہ سے صلح بہتر ہے نہ معلوم اس جنگ کا نتیجہ ترکی کے حق میں کیا نکلے ۔ لیکن مصطفےٰ کمال پاشا اس قسم کا بزدلانہ مشورہ سننے تک کے روادار نہ ہوئے ۔ فرانس نے بھی کوشش کی کہ بیچ بچاؤ کر کے ترکی اور یونان کی صلح کرا دے ۔ چنانچہ فرانس کا نمائندہ بھی انگورا پہونچا ۔ لیکن مصطفےٰ کمال پاشا نے اُسے صاف طور پر بتا دیا کہ تم "عرب لے لو یا شام لے لو ہمیں ذرا بھی پرواہ نہ ہو گی۔ لیکن ترکی کی ایک انچ زمین بھی تمھیں نہ مل سکے گی ۔ ہم صرف اپنی سرزمین چاہتے ہیں۔ نہ اس سے ایک انچ کم لیں گے نہ زیادہ ۔"

جس زبردست عزم کے ساتھ مصطفےٰ کمال پاشا نے یہ تیاریاں شروع کی تھیں اس نے ترکوں میں بھی ایک جان سی ڈال دی ۔ لیکن ان تیاریوں کی عین تکمیل کے وقت ایک مشکل اور پیش آ گئی جسے دور کئے بغیر قوم پرست فوجی اسکیم کی تکمیل نہ کر سکتے تھے سمرنا کے آگے اب تک جو فوج چھپ چھپ کر یونانیوں کا مقابلہ کرتی رہی تھی وہ ادھم بے کی بے قاعدہ فوج تھی ۔ اس فوج کی نہ کوئی تنظیم تھی نہ ترتیب ۔ فوجی قاعدے اور قانون سے آزاد اور ایک سرپھری قسم کی فوج تھی جس کا گذارا لوٹ مار پر تھا ۔ قسطنطنیہ پر جب سے اتحادیوں کا قبضہ ہوا اور سلطان بے بس ہو گئے تو ادھم بے بھی جو اس فوج کے کمانڈر تھے اپنے آپ کو خود مختار سمجھنے لگے تھے ۔ اور انگورا کی منظم کوششوں کو وہ اپنے اقتدار کے خلاف سمجھتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ یونانیوں سے اس طرح چھپ چھپ کر ہی کامیابی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے ۔ کھلے میدان میں ترکی فوجوں کو کامیابی نہیں ہو سکتی ۔ اس

اختلافِ خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصطفےٰ کمال پاشا نے جب عصمت پاشا کو چیف آف اسٹاف مقرر کیا تو ادھم بے نے ان کی ماتحتی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ علی فواد بھی چھپے چوری ادھم بے کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ مصطفےٰ کمال پاشا کے اس حکم کے خلاف اپنی اور ادھم بے کی فوجی مہارت دکھانے کے لئے انھوں نے عصمت پاشا کی رائے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اکتوبر میں یونانیوں کی ایک چوکی پر حملہ کر دیا۔ حملہ بالکل ناکام رہا اور علی فواد کی فوج کے ٹکڑے اڑ گئے۔ علی فواد کی اس ناکامی کو وجہ قرار دیکر مصطفےٰ کمال پاشا نے ادھم بے کو دوبارہ حکم بھیجا کہ وہ اپنی بے قاعدہ فوج عصمت پاشا کی ماتحتی میں دیدیں۔ اور علی فواد کو فوجی کمان سے علیحدہ کر کے ان کی جگہ رفعت کو بھیجدیا۔ ادھم بے نے پھر بھی یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ بلکہ وہ اس مکرر حکم سے اس قدر بگڑے کہ انھوں نے مصطفےٰ کمال پاشا کو ہزاروں صلواتیں سنائیں اور از راہِ غرور اپنی فوج کے آگے کہنے لگے کہ اگر میں کبھی انگورا گیا تو مصطفےٰ کمال کو اسمبلی کے دروازہ کے آگے پھانسی دیدوں گا۔ مصطفےٰ کمال نے ان کو انگورا طلب کیا تاکہ اس ناگوار قضیہ کو طے کر لیں۔ ادھم بے انگورا گئے ضرور لیکن بہت چڑ کر گئے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے ان کی بڑی خاطر کی اور نہایت تفصیل سے انھیں اونچ نیچ سمجھائی اور ترکی کا واسطہ دیا کہ وہ اپنی ضد سے باز آجائیں اور عصمت پاشا کی ماتحتی میں کام کریں۔ لیکن ادھم بے کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ اسی دوران میں عزت پاشا کی سرکردگی میں قسطنطنیہ سے ایک وفد آیا جس کی خواہش تھی کہ انگورا اور قسطنطنیہ میں صلح کرادے۔ اور دونوں مل کر یونانیوں سے صلح کر لیں۔ پارلیمنٹ کے اکثر ممبر بھی اس وفد کی طرف جھک گئے اور ادھم بے نے بھی بے سوچے سمجھے محض مصطفےٰ کمال پاشا کو نیچا دکھانے کیلئے اس وفد کی طرفداری شروع کر دی۔ غرض مصطفےٰ کمال پاشا اور ادھم بے کے درمیان اس ملاقات سے کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا بلکہ کشیدگی

ان میں اور بڑھ گئی۔ چنانچہ ادھم بے نے اپنے مستقر "قونیہ" پہونچ کر مصطفےٰ کمال پاشا کو یہ لکھا کہ "قوم پرستوں کی فوج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے میں گرینڈ نیشنل اسمبلی کو یہ پیغام بھیج رہا ہوں کہ ملک لڑائی سے تھک گیا ہے اس لئے عزت پاشا کی ماتحتی میں جو وفد قسطنطنیہ سے آیا ہے اس کو صلح کی شرائط طے کرنیکا اختیار دیدیا جائے۔" اسکے جواب میں مصطفےٰ کمال پاشا نے ادھم بے کو لکھا کہ اب تک تو میں تم کو ایک بھائی اور اپنے ہمعصر کی طرح سمجھتا رہا لیکن اب میں تم سے ایک ریاست کے صدر کی طرح سلوک کروں گا۔ اس جواب کے ساتھ ہی مصطفےٰ کمال پاشا نے رفعت کو حکم دیا کہ ادھم بے کی بے قاعدہ فوج پر حملہ کر دیں اور ادھم کو قونیہ سے نکال دیں۔ رفعت کی باقاعدہ فوج نے اس حکم کے ملتے ہی ادھم کی فوج پر حملہ کر دیا۔ اور اس کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ ادھم اپنے مستقر سے بھاگے اور ان کی بے قاعدہ فوج کا خاتمہ ہو گیا۔ یہاں یہ اور بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادھم اور ان کے بھائی اناطولیہ میں بالشویزم پھیلانا چاہتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں انھوں نے ادھر کچھ بالشویک خیالات کی تبلیغ بھی شروع کر دی تھی۔ مصطفےٰ کمال پاشا کا اگرچہ روس سے دوستانہ معاہدہ تھا اور روس برابر اس جنگ میں کمالی ترکوں کی مدد بھی کر رہا تھا لیکن مصطفےٰ کمال پاشا یہ نہیں چاہتے تھے کہ اناطولیہ بالشویک عقیدہ کا گہوارہ بن جائے۔ اور دُنیا میں اپنی ایک انفرادیت قائم کرنے کے بجائے روس کا ایک حصّہ بن کر رہ جائے۔ چنانچہ انھوں نے ان دونوں بھائیوں کی قوت کو جو اناطولیہ میں بالشویک لیڈر بنے ہوئے تھے موقع ملتے ہی توڑ کر رکھدیا۔ اور ان کی بے قاعدہ فوج کے سپاہیوں کو قوم پرستوں کی باقاعدہ فوج میں شامل کر لیا۔

ایک غیر جانب دار پڑھنے والے کو یہاں یہ ضرور معلوم کرنیکا اشتیاق ہوگا کہ اتحادیوں نے قوم پرست ترکوں کو اس تیاری کے لئے جو سراسر ان کے خلاف تھی کیوں

آزاد چھوڑ دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہی تھی کہ انھوں نے ترکی قوم پرستوں کے مقابلہ کے لئے یونانیوں کی طاقت کو کافی سمجھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ معاہدہ سیورے پر جب ترکی سلطان اور ان کی حکومت کے دستخط ہو چکے تو انھوں نے سلطان کو یہی معاہدہ سارے ملک سے منوانے کے لئے چھ مہینہ کی مہلت دیدی تھی۔ لیکن ملک میں سلطان وحید الدین کا اثر ختم ہو چکا تھا۔ انھوں نے اتحادیوں کو خوش کرنے اور ملک سے اس معاہدہ کو منوانے کے سلسلے میں مذہبی سیاسی اور فوجی نوعیت کی جس قدر کوششیں کیں وہ سب ناکام ہو چکی تھیں۔ اور قوم پرست ترکوں کا اثر برابر بڑھتا ہی چلا جاتا تھا اسی کے ساتھ اتحادیوں میں بھی کچھ پھوٹ کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ فرانس نے اگرچہ معاہدہ سیورے پر دستخط ضرور کر دیئے تھے مگر وہ اس سے مطمئن نہ تھا، اس لئے کہ جنگ کے خاتمہ پر ترکی مال غنیمت کا زیادہ حصّہ برطانیہ نے ہضم کر لیا تھا اور فرانس کے لئے شام اور سلیشیہ کا علاقہ چھوڑ دیا تھا۔ جس میں سے سلیشیہ بھی نزاعی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے کہ ترک اس حصّہ کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اور ان کی مقامی فوجیں برابر سلیشیہ کی فرانسیسی فوجوں کو دق کر رہی تھیں۔ فرانس نے معاہدہ سیورے کے معاملہ میں اس لئے یہ طرح دی تھی کہ اسے فرانس کی شمال مشرقی سرحد کو رائین تک بڑھا لے جانے میں انگلستان سے امداد کی توقع تھی لیکن جب یہ توقع بھی اٹھ گئی تو فرانس میں کھلم کھلا انگورہ کے قوم پرست ترکوں سے ہمدردی کا اظہار ہونے لگا۔ دوسری طرف اٹلی کو برطانیہ کی یہ حرکت بہت ناگوار معلوم ہوئی کہ اس نے یونان کو ایشیائے کوچک میں ایک سلطنت قائم کرنے کی اجازت دیدی۔ اور ترکی مال غنیمت سے اٹلی کو حصہ نہ ملا۔ اٹلی نے اگرچہ اپنے اصلی حلیف جرمنی اور ترکی کے ساتھ غدّاری کر کے برطانیہ اور فرانس کا ساتھ دیا تھا لیکن بہرحال اس جنگ میں اس نے بھی کچھ قربانیاں کی تھیں اس لئے وہ بھی اپنے آپ کو کچھ معاوضہ کا حقدار

سمجھتا تھا۔ اسی کے ساتھ متحدین میں خود بھی رنجش پیدا ہو گئی۔ اور یونان میں وینیزولہ کا اثر بھی ختم ہونے لگا جس نے اناطولیہ میں قوم پرستوں سے جنگ کرنے کی ذمہ داری لی تھی۔ وینیزولہ نے شاہ یونان قسطنطین کو جنگ عظیم کے زمانہ میں یورپ کی سلطنتوں کی مدد سے یونان سے جلاوطن کر دیا تھا۔ اور اس کے بجائے اس کے بیٹے الیگزنڈر کو شاہ یونان بنا کر خود سیاہ وسفید کا مالک بن بیٹھا تھا۔ لیکن وینیزولہ کی مختاری زیادہ دنوں نہ چل سکی۔ نوجوان شاہ یونان ایک بندر کے کاٹے سے ہلاک ہو گیا۔ وینیزولہ نے چاہا کہ الیگزنڈر کے چھوٹے بھائی کو تخت پر بٹھا دے لیکن اس غیور نوجوان نے اس کو منظور نہیں کیا۔ بلکہ یہ مطالبہ کیا کہ اس کے جلاوطن والد کو یونان واپس بلایا جائے اس کے انکار کے ساتھ ہی یونان میں باقاعدہ شاہ پرست پارٹی پیدا ہو گئی اور رائے عامہ کے استصواب سے شاہ قسطنطین واپس یونان پہونچے۔ اور وینیزولہ کو ان کی بجائے یونان سے جلاوطن ہونا پڑا۔ اسی کے ساتھ امریکہ والے، پریسیڈنٹ ولسن اور ان کی چودہ نکات سے بگڑ گئے۔ اور انھوں نے یورپین معاملات سے اپنی قطعی بے تعلقی کا اعلان کر دیا۔

ان حالات میں قوم پرست ترکوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی طرف کسی کو توجہ کرنے کی نہ فرصت تھی۔ نہ ضرورت۔ صرف برطانیہ نے ان کی طرف توجہ کرنی چاہی لیکن وہاں بھی مسٹر لائڈ جارج کی حکومت زوال پذیر تھی اس لئے یہ توجہ مؤثر ثابت نہ ہوئی۔ غرض یہ صورتِ حال تھی جب مصطفےٰ کمال نے ادھم بے کی بے قاعدہ فوج کو توڑا، اور ادھم مصطفےٰ کمال سے بدلہ لینے کے لئے یونانیوں سے جا ملا۔ ادھم کی اس غداری پر سارے غیر ملکی تذکرہ نویس متفق ہیں۔ ایسے وقت میں جبکہ دشمن ترکی کو تباہ کرنے پر تلے کھڑے ہوں ایک ترک کا محض ذاتی رنجش کو وجہ بنا کر اپنے وطن اور قوم کے دشمنوں سے مل جانا قومی غداری کی تاریخ میں ایک نہایت مکروہ مثال ہے۔

باب (۱۷)

دریائے سقاریہ کا فیصلہ کُن مَعرکہ

ادھر جب یونانیوں کو جا ملے تو یونانیوں کو یہ مغالطہ ہوا کہ قوم پرست ترک اب آپس ہی میں لڑنے لگے ہیں۔ چنانچہ اس موقع کو غنیمت جان کر یونانی فوجوں نے "افیون قرہ حصار" پر حملہ کر دیا۔ اور اناطولیہ ریلوے کا ایک حصّہ بھی فتح کر لیا۔ لیکن اس حملہ کے ایک ہی ہفتہ بعد عصمت پاشا کی باقاعدہ فوجوں نے یونانیوں پر جوابی حملہ کیا۔ اور "اینونو" کے مقام پر انھیں شکست فاش دیکر پھر پیچھے دھکیل دیا۔ یونانی اس جوابی حملہ سے اس قدر بدحواس ہوئے کہ اپنے پہلے ہی مقام پر واپس آ گئے۔ اور اپنی پوزیشن مضبوط کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ادھر اس کامیابی سے ترکی فوجوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ ایک طرف تو ترکی فوجوں کو یونانیوں کے مقابلے میں کامیابی ہوئی اور دوسری طرف کاظم قرہ بکر پاشا نے آرمینیہ کی بغاوت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ اور کارس پر قبضہ کر کے سویٹ روس سے براہ راست ترکی رشتہ قائم کر دیا۔ جہاں سے قوم پرستوں کو روپیہ اور سامانِ جنگ کی مدد مل رہی تھی۔ یہ حالت دیکھکر برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے ترکی اور یونان میں بیچ بچاؤ کرا دینا چاہا۔ اور لندن میں ایک کانفرنس کی بنا ڈالی اور قسطنطنیہ کی حکومت کو لکھا کہ وہ اس کانفرنس میں اپنے نمائندے بھیجے۔ اور اپنی طرف سے انگورہ کے نمائندوں کو بھی شرکت کی دعوت دیدے۔ اس دعوت نامہ کے ملتے ہی توفیق پاشا وزیر اعظم نے سلطان

کی طرف سے مصطفےٰ کمال پاشا کو لکھا کہ اب سب اختلافات مٹا کر لندن کانفرنس
میں قسطنطنیہ کے نمائندوں کے ساتھ اپنے نمائندے بھی بھیجیں لیکن مصطفےٰ کمال پاشا
نے اسے منظور نہیں کیا۔ بلکہ اس کے جواب میں لکھا کہ اصلی حکومت ترکی کی انگورہ
میں قائم ہے۔ اس لئے اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت براہ راست انگورہ حکومت
کے نام آنی چاہیئے۔ متحدین نے جب دیکھا کہ قسطنطنیہ کی حکومت کا اثر اناطولیہ پر اب
برائے نام بھی نہیں رہا ہے تو انھوں نے انگورہ حکومت کو بھی براہ راست شرکت
کانفرنس کا دعوت نامہ بھیجا۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا نے بکر سمیع کو اپنا نمائندہ بنا کر
لندن بھیجدیا۔ پہلے دن تو قسطنطنیہ اور انگورہ کے نمائندے علیحدہ علیحدہ رہے
لیکن دوسرے دن کانفرنس کو یہ دیکھکر بڑی حیرت ہوئی کہ توفیق پاشا بکر سمیع
کے حق میں وفد کی قیادت سے دست بردار ہو گئے۔ کانفرنس کا مقصد یونان اور
ترکی میں بیچ بچاؤ کرنے اور سیورے کے معاہدہ پر نظر ثانی کرنے کے لئے ایک کمیشن
مقرر کرنیکا تھا۔ ترکی نمائندہ نے کمیشن بھیجنے کی اسکیم منظور کر لی لیکن یونانیوں نے
ان دونوں تجویزوں کو نہ مانا۔ اسی کانفرنس کے دوران میں فرانسیسی پریسیڈنٹ
اور بکر سمیع کے مابین ایک معاہدہ یہ ہوا کہ فرانس سلیشیہ سے دست بردار ہو جائیگا
بشرطیکہ اناطولیہ میں اس کو خاص تجارتی رعایتیں دیدی جائیں۔ لیکن اس معاہدہ
کو مصطفےٰ کمال پاشا نے تسلیم نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بکر سمیع کو وزارت سے
استعفےٰ دینا پڑا۔ اور وہ بعد کو مخالف پارٹی میں شامل ہو گئے۔ غرض یہ کانفرنس ہر
اعتبار سے ناکام رہی۔ یونان کو اپنی ڈیڑھ لاکھ فوج کا زعم تھا جو بیشمار جدید
آلات سے مسلح اناطولیہ کے میدانوں میں پڑی تھی۔ اتحادیوں نے کانفرنس کی ناکامی
کے بعد غیر جانبداری کا اعلان کر دیا۔ اب گویا ترکی اور یونان کا برابر کا مقابلہ تھا۔
اور اس مقابلہ کی مصطفےٰ کمال پاشا نہایت سرگرمی سے تیاریاں کر رہے تھے۔

یونانیوں نے بھی ایک زبردست حملہ کی بڑے پیمانہ پر تیاریاں شروع کر دیں مصطفےٰ کمال پاشا نے خطرہ کو بھانپ لیا۔ وہ یونانیوں کی تیاریوں کی تکمیل سے پہلے ہی حملہ کر دینا چاہتے تھے انھوں نے اپنی فوجی تیاری میں دن اور رات ایک کر دیا لیکن ان کی راہ میں ابھی بیشمار مشکلیں تھیں۔ ایک طرف فوجیں کافی نہ تھیں اور جو تھیں بھی تو ان کے پاس اسلحہ کافی نہ تھے۔ ذرائع رسل و رسائل کا ٹوٹا تھا۔ روپیہ اور رسد کا انتظام ٹھیک نہ تھا۔ اور سب سے زیادہ جو بات ان کے انتظامات میں حائل ہو رہی تھی وہ گرینڈ نیشنل اسمبلی کے نئے ممبروں کی روش تھی۔ انگورہ کے یہ "کرسی نشین مدبر" بے سوچے سمجھے برابر مصطفےٰ کمال پاشا کی فوجی اسکیم میں اپنی ٹانگ اڑائے جاتے تھے۔ اور بات بات پر الجھتے تھے۔ انگورا اور اس کی نئی حکومت اس وقت تک اچھی طرح قائم نہیں ہوئی تھی اور جس حد تک قائم ہو سکی تھی وہ بھی مصطفےٰ کمال پاشا ہی کی قابلیت، شخصیت اور کوششوں کا نتیجہ تھا۔ لیکن اس ذرا سے نمود کے بعد اب وہی حکومت مصطفےٰ کمال پاشا کے لئے سنگِ راہ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک یونانی ترکی سرزمین پر موجود ہیں انگورا میں فوجی حکومت ہونی چاہیئے۔ پارلیمنٹ کہتی تھی کہ نہیں ہر فوجی اسکیم پہلے نیشنل اسمبلی میں زیر بحث آنی چاہیئے۔ اس کھینچا تانی کا نتیجہ یہ تھا کہ ذرا ذرا سی بات کی منظوری مصطفےٰ کمال پاشا کو نیشنل اسمبلی سے لینی ہوتی تھی۔ اور معمولی سے معمولی بات ممبروں کو سمجھانے کیلئے گھنٹوں بحث کرنی پڑتی تھی۔ ایک ایسے ہی تھکا دینے والے واقعہ کے بعد مصطفےٰ کمال پاشا سخت کبیدہ خاطر اسمبلی سے اپنے گھر لوٹے۔ وہاں عصمت، فیضی، ادتان اور خالدہ ادیب پہلے سے موجود تھے۔ مصطفےٰ کمال پاشا یہاں پہونچتے ہی سیاسی مدبروں پر برس پڑے اور کہنے لگے "ڈموکریسی کے معنی مجھے آج معلوم ہوئے یعنی ایسے چند لوگوں کی حکومت جن کے دماغوں میں بھیجے کی بجائے بُھس بھرا ہوا ہو

حکومت تو صرف شخصی اچھی جس میں احمقوں سے بے نیاز ہو کر حکومت کی جاتی ہے ۔"
پارلیمنٹ کے ممبروں کی ناسمجھی اور کج بحثی سے تنگ آ کر اسی طرح اپنے دوستوں کے آگے
مصطفےٰ کمال پاشا اپنا غصہ اتار لیا کرتے تھے نیشنل اسمبلی میں اس موقع پر کئی جماعتیں
بن گئی تھیں ۔ ایک گروہ بکر سمیع کی ماتحتی میں تھا جو پہلے وزیر خارجہ تھے لیکن فرانس
کے معاہدہ کی منسوخی کے باعث مستعفی ہو کر حکومت کے خلاف ہو گئے تھے ۔ یہ گروہ اپنے
آپ کو اعتدال پسند کہا کرتا تھا ۔ اس نے مطالبہ کیا کہ اس وقت فرانس اور اٹلی چونکہ
انگورا کی حکومت سے ہمدردی رکھتے ہیں اس لئے دوبارہ صلح کی سلسلہ جنبانی ہونی
ہونی چاہیئے ۔ اس کے علاوہ پانچ چار اور مخالف پارٹیاں تھیں لیکن ان کا مقصد
صرف ذاتی تھا کہ ان کے لیڈر بھی اس موقع پر قومی لیڈر بن جائیں ۔ اصل اختلاف
اسمبلی میں درحقیقت سلطان کی شخصیت اور ذات کے متعلق تھا اور سارے ممبر
اس معاملہ میں یک زبان معلوم ہوتے تھے کہ سلطان کو برقرار رکھا جائے ۔ کاظم قرہ
بکر پاشا اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے ۔ یہ سوال چونکہ ترکی کے نئے دستور میں بھی پوری
طرح طے نہیں ہوا تھا اس لئے اسے بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی ۔ اور اس کی حمایتیوں
کی تعداد بڑھ گئی تھی ۔ چنانچہ کاظم قرہ بکر پاشا نے اس سلسلہ میں مصطفےٰ کمال پاشا کو
لکھا بھی تھا کہ کیا آپ کا منشا سلطان کی شخصیت کو ختم کر کے جمہوریت قائم کرنے کا ہے
لیکن اس سوال کو مصطفےٰ کمال پاشا نے مصلحتاً صاف نہیں کیا ، وقت کے انتظار
میں ٹال گئے ۔ ایک طرف اسمبلی میں یہ قصہ ہو ہی رہا تھا کہ انگورہ کی خفیہ پولیس نے
ایک ہندوستانی مسلمان مصطفےٰ صغیر کو اس الزام میں گرفتار کر لیا کہ مصطفےٰ کمال
پاشا پر قاتلانہ حملہ کرنے کی نیت سے انگورا آیا ہے ۔ اس شخص پر انگورا کی مخصوص عدالت
میں مقدمہ چلا ۔ اس مقدمہ کے دوران میں عجیب عجیب باتیں کھلیں ۔ اس شخص نے
بیان کیا کہ اسے برطانیہ کے محکمہ خفیہ نے مصطفےٰ کمال کے قتل کرنے کو بھیجا ہے ۔ اور

ایک لاکھ روپئے مصطفےٰ کمال کے سر کے لئے مقرر کئے ہیں۔ اور اس شخص کو انگورہ اس لئے بھیجا ہے کہ اس نے اس سے پہلے افغانستان کے امیر حبیب اللہ خاں کو بھی قتل کیا تھا۔ اس کی باتوں میں صداقت ہو یا نہ ہو لیکن اس واقعہ نے ساری ترکی میں آگ لگا دی اور برطانیہ کے خلاف سخت نفرت اور حقارت کا مظاہرہ ہونے لگا اور کچھ دنوں کیلئے سلطان کی شخصیت کا نزاعی سوال دب گیا۔

اس دوران میں انور پاشا نے جو جنگ عظیم کے بعد کچھ دنوں جرمنی میں چھپے رہے اور بعد کو روس پہونچ گئے تھے اور روس سے دوستی گانٹھکر شمالی کاکیشیا میں قوم پرست ترکوں کی تنظیم کر رہے تھے ترکی واپس آنے اور استخلاص وطن کی جنگ میں مصطفےٰ کمال کا ساتھ دینے کی درخواست کی۔ لیکن مصطفےٰ کمال اس پر راضی نہ ہوئے اس لئے کہ وہ اور انور پاشا کبھی ہم رائے نہیں ہو سکتے تھے اور نہ مل کر کام کر سکتے تھے۔ ادھر سے مایوس ہو کر انور پاشا نے بخارا کا رخ کیا۔ اور وہاں انھیں اچھا اقتدار حاصل ہو گیا۔ بخارا والوں کو یہ شکایت تھی کہ سویٹ روس انھیں پیسے ڈالتا ہے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ سوویٹ روس سے مقابلہ کر کے آزادی حاصل کر لیں۔ انھیں اس مہم کے لئے ایک تجربہ کار جنرل کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انور پاشا کو انھوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور فوراً اپنی ایک فوج تیار کر کے ان کی ماتحتی میں سوویٹ روس سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ انور پاشا کی یہ حرکت مصطفےٰ کمال پاشا کی ماسکو کی پالیسی کے سخت خلاف تھی۔ انھیں اندیشہ ہوا کہ کہیں سویٹ خود مصطفےٰ کمال پاشا سے نہ بدظن ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے بڑی مشکل سے سویٹ سفیر کو یہ یقین دلایا کہ انور کا اناطولیہ سے کوئی تعلق اور رشتہ نہیں ہے۔ وہ اپنی حرکتوں کے آپ ہی ذمہ دار ہیں۔ سوویٹ روس کو مصطفےٰ کمال کی بے تعلقی کا یقین ہو گیا۔ اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد انور پاشا سویٹ روس کی ایک مہم میں ہلاک ہو گئے۔ اور روسیوں نے فوجی اعزاز

کے ساتھ ان کی تجہیز وتکفین کر دی۔ اس کے ایک سال بعد طلعت پاشا کو کسی نے دن دہاڑے برلن کی سڑک پر قتل کر دیا۔ اور کچھ ہی دنوں بعد ان کے تیسری ساتھی جمال پاشا جو برلن سے افغانستان چلے گئے تھے اور امان اللہ خاں کے مشیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے ان کے زوال کے بعد ماسکو چلے آئے۔ یہاں ان سے اور سوویٹ حکومت سے کچھ اَن بن ہو گئی، یہ وہاں سے بھاگ کر طفلس پہونچے۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا سے ترکی واپس آنے کی اجازت مانگی۔ ابھی اس کا جواب ان تک نہ پہونچا تھا کہ کسی نے انھیں بھی طفلس میں قتل کر دیا۔ اس طرح جنگ عظیم سے پہلے کی اتحادی حکومت کے تینوں ممبر یکے بعد دیگرے ختم ہو گئے۔

ابتداءً مصطفےٰ کمال پاشا انگورا میں رہا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں انگورا سے چار میل کے فاصلے پر "چان کیا" نامی ایک گاؤں میں اٹھ گئے۔ ان کی والدہ زبیدہ خانم بھی آ گئی تھیں جو اب ان کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ مصطفےٰ کمال پاشا پر شب و روز کی مصروفیت اور ان تھک مشقت کے باعث پھر گردے کا دورہ پڑا اور ساتھ ہی ملیریا کا بھی حملہ ہوا۔ انگورا بہت مرطوب مقام تھا اور یہاں ملیریا کا بڑا زور تھا۔ اس بیماری میں زبیدہ خانم اور فکری خانم نے جو زبیدہ خانم کی ایک عزیزہ تھیں مصطفےٰ کمال پاشا کی بڑی خدمت کی۔ ابھی وہ بیماری سے پوری طرح تندرست نہ ہوئے تھے کہ جولائی ۱۹۲۱ء کے پہلے ہفتہ یونانیوں نے حملہ کر دیا۔ اور ایک ہی حملہ میں "کوتھانیہ" اور "اقیون قرہ حصار" کو فتح کرتے ہوئے اپنی ساری طاقت اسکی شہر کے آگے جمع کر ڈالی۔ اسکی شہر اناطولیہ کا ریلوے جنکشن اور نہایت اہم فوجی مقام تھا عصمت پاشا اپنی فوجیں لئے اسکی شہر کے پیچھے پڑے تھے۔ ترکی فوج پر یونانیوں کا سخت دباؤ پڑ رہا تھا۔ اور تین طرف سے یونانی فوجیں اسکی شہر کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

عصمت پاشا نے یونانیوں کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے کئی جوابی حملے کئے۔ لیکن ایک بھی کامیاب نہ ہوا۔ وہ رات اور دن محنت سے اپنی فوجوں کو ترتیب دیتے لیکن حاصل کچھ نہ ہوتا۔ انھیں اپنی شکست کا یقین ہوگیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کی ہمّت نے جواب دیدیا۔ ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ انھیں کرنا کیا ہے۔ اگر یہیں جمے رہتے ہیں تو یونانی انھیں بالکل تباہ و برباد کردیتے ہیں اور اگر پیچھے ہٹتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ترکی کو شکست فاش ہوگئی۔ اس صورت حال سے وہ اس قدر بوکھلائے کہ انھوں نے فوراً مصطفےٰ کمال پاشا کو تار دیا کہ وہ خود میدانِ جنگ میں آکر انھیں اس مخمصے سے نجات دیں۔

جیسے ہی تار ملا مصطفےٰ کمال پاشا انگورہ سے چل پڑے۔ اور مار امار اسی دن اسکی شہر پہونچ گئے۔ اور جاتے ہی عصمت پاشا سے کمان لے لی۔ عصمت کے کندھوں سے گویا ایک بوجھ سا اتر گیا۔ ادھر مصطفےٰ کمال پاشا کے میدانِ جنگ میں پہنچتے ہی سپاہیوں میں ایک نیا حوصلہ پیدا ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مصطفےٰ کمال کی شخصیت میں کچھ ہی کچھ ایسی جاذبیت کہ ان کی موجودگی میں سپاہیوں کی جرأتیں بڑھ جاتی تھیں۔ اور انھیں اپنے اوپر اعتماد پیدا ہوجاتا تھا۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے فوج کی کمان لیتے ہی صورت حال کو اچھی طرح سمجھا۔ اس کے بعد جنگ کے نقشہ کا بڑے غور سے مطالعہ کیا۔ اور دریائے سقاریہ کے کنارے ایک چھوٹی سی جھنڈی گاڑ دی۔ اور پلٹ کر عصمت پاشا کو حکم دیا فوجوں کو فوراً تین سو کیلومیٹر پیچھے ہٹاؤ اور دریائے سقاریہ کے اس کنارے پر خندقیں کھود کر بچاؤ کی لائن قائم کردو۔ دشمن کو اتنی دور آگے بڑھنے میں خاصی تکلیف ہوگی اور کافی دن لگیں گے۔ اور ہمیں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کا موقع مل جائیگا۔ عصمت پاشا کو یہ حکم

دیگر مصطفےٰ کمال پاشا فوراً انگورہ پہونچے۔ وہاں کی عجیب حالت ہو رہی تھی لوگ بدحواس اور انگورا چھوڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے فوراً اسمبلی کا اجلاس طلب کیا۔ اور اس اجلاس میں یہ مطالبہ کیا کہ انھیں سیاہ وسپید کے مطلق اختیارات کے ساتھ کمانڈر انچیف بنایا جائے۔ اسمبلی نے چند شرطوں کے ساتھ تاکہ بعد میں وہ یہ اختیارات مصطفےٰ کمال سے واپس لے سکے انھیں بالاتفاق ڈکٹیٹر تسلیم کرلیا۔ یہ مرحلہ طے کرکے مصطفےٰ کمال پاشا پھر فوجی ترتیب اور تنظیم میں مصروف ہوگئے۔ اس دوڑ دھوپ میں ایک دن گھوڑے سے گر پڑے جس کی وجہ سے ان کی پسلی کی دو ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ مجبوراً دو دن تک بستر پر پڑا رہنا پڑا۔ گردے کا دورہ پڑا لیکن اس کی بھی انھوں نے پرواہ نہیں کی اور اسی عالم میں وہ سارے انتظامات مکمل کرکے میدان جنگ میں پہونچے۔ اور ترکی فوجوں کی خود کمان لی۔

یہ معرکہ بڑا سخت تھا ترک اور یونانی ایک فیصلہ کن جنگ کیلئے ایک دوسری کے مقابل پڑے ہوئے تھے۔ آخر ۲۴۔ اگست ۱۹۲۱ء کو یونانیوں نے ترکوں پر حملہ کردیا۔ حملہ اس شدت کا تھا کہ ترکی اور یونانی فوجیں پہلے ہی دن ایک دوسری سے مل گئیں۔ اور دست بدست مقابلہ ہونے لگا۔ رات ہوگئی فیصلہ کسی طرف کو نہ ہوا دوسرے دن پو پھٹتے ہی پھر میدان کارزار گرم ہوا۔ اور شام تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ لیکن فیصلہ اب بھی نہ ہوسکا۔ اسی طرح مسلسل چودہ دن تک مقابلہ ہوتا رہا۔ اور فتح اور شکست دونوں طرف برابر کی تلتی رہی۔ دونوں فوجیں تھک کر چور ہوچکی تھیں۔ حوصلے پست ہونے لگے تھے سپاہیوں کے دل چھوٹ رہے تھے۔ میدان جنگ سے چند قدم کے فاصلہ پر "الاغوش" نامی گاؤں میں مصطفےٰ کمال پاشا ایک بوسیدہ سے مکان کے صحن میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔

بار بار کمانڈروں کے نام احکام لکھواتے جاتے ۔ اور ٹیلیفون پر فوجوں کی صحیح پوزیشن معلوم کرتے جاتے۔ گردے کے دَورے پھر پڑنے لگے۔ پسلی کی ہڈیوں میں پھر درد ہونے لگا تھا۔ لیکن انھیں اس کا بھی ہوش نہ تھا کہ اپنی اس بیماری اور درد تک کو محسوس کرتے۔ بار بار سیاہ کافی پیتے جاتے اور احکام لکھواتے جاتے حالات نازک ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی کبیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ چودہ دن کی متواتر جنگ نے ترکی لائن کو کمزور کر دیا تھا۔ اور اب وہ جھکنے لگی تھی۔ یہی حال یونانیوں کا ہو رہا تھا۔ سوال صرف حوصلہ کا رہ گیا تھا۔ جو پہلے حوصلہ ہارتا وہی جنگ ہار جاتا۔ ویسے بھی مقابلہ نابرابر کا تھا۔ ترکوں کے صرف ایک لاکھ سپاہی میدان میں تھے اور یونانیوں کے پورے تین لاکھ۔ اپنے سے تقریباً تگنی فوج کو چودہ دن برابر روکے رکھنا ترکوں ہی کا حوصلہ تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ حوصلہ مصطفےٰ کمال کی ذات نے ان میں پیدا کر دیا تھا۔ چودھواں دن گذرتا جا رہا تھا مصطفےٰ کمال پاشا کی بے چینی اور بے چینی کے ساتھ ساتھ بدمزاجی بڑھتی جا رہی تھی کہ دفعتہً ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ فیضی پاشا بول رہے تھے۔ "آج کا معرکہ ترکوں کے حق میں رہا۔ یونانیوں نے ہمت ہار دی۔ اب وہ پسپا ہونیکی تیاریاں کر رہے ہیں۔" مصطفےٰ کمال پاشا نے ٹیلیفون کا ریسیور کان سے ہٹایا اور ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا یہ پہلی ہنسی تھی جو یونانیوں کے مقابلہ کے بعد لوگوں نے سُنی۔ آدمی کو حکم دیا کہ سیاہ کافی کی پیالی لائے۔ چہرہ پر ایک دفعہ ہی تازگی پیدا ہو گئی۔ بیماری اور تھکن کا دُور دُور پتہ نہ تھا۔

دوسرے دن مصطفےٰ کمال پاشا نے بے دھڑک اپنی ساری ریزرو فوج کو میدانِ جنگ میں بھیجنے کا حکم دیدیا۔ اور بہ نفس نفیس میدانِ جنگ میں پہونچے۔

گولوں اور گولیوں سے بے خطر ترکی سپاہیوں کی صفوں میں پھرنے اور سپاہیوں کا دل بڑھانے لگے۔ یونانی اس کے بعد بھی ایک ہفتہ تک لڑتے رہے۔ لیکن ان کا جوش ختم ہو چکا تھا۔ حوصلہ پست اور ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ ہاری ہوئی لڑائی تھی جو کھسیانپن سے لڑے جا رہے تھے۔ بالآخر پورے بائیسویں دن دریائے سقاریہ سے یونانی فوجیں پسپا ہونی شروع ہوئیں۔ اس شان سے کہ آگے آگے یونانی اور پیچھے پیچھے ترک۔ غرض تین سو کیلو میٹر واپس طے کر کے یہ پھر وہیں آپڑیں جہاں سے یہ جولائی میں آگے بڑھی تھیں۔ اور ترک بھی ان کے سامنے خندقیں کھود کر اطمینان سے جا بیٹھے۔

باب ۱۸

فتح سمرنا اور قوم پرست ترکوں کی فتح کی تکمیل

جنگ سقاریہ کی فتح کے بعد جب مصطفےٰ کمال پاشا انگورہ پہونچے تو لوگ خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے۔ کیونکہ اس فیصلہ کُن جنگ کے بعد یونانیوں کے آگے بڑھنے کا امکان بالکل ختم ہو گیا تھا۔ اور ترکی فوج اور ترکی رعایا کے دل بڑھ گئے تھے گرینڈ نیشنل اسمبلی نے اس موقع پر اپنے اجلاس میں مصطفےٰ کمال پاشا کیلئے "غازی" کا اعزاز تجویز کیا۔ ترکوں کے علاوہ مصر، عرب، شام، عراق، افغانستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے بھی غازی پاشا کو مبارکبادیں دی گئیں جن میں انھیں ترکی کے نجات دہندہ سے خطاب کیا گیا تھا۔ لیکن یونانیوں سے مقابلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ابھی سمرنا کے قریب ان کا ایک زبردست مورچہ اور باقی تھا۔ جب تک یہ مورچہ ان کے ہاتھ سے نہ چھینا جائے ترکی یونانیوں کی ہاتھوں محفوظ نہیں تھی۔ غازی پاشا نے اس عارضی فتح کو ذرا بھی اہمیت نہ دی اور سمرنا پر ایک اور فیصلہ کُن جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ سوویٹ روس سے روپیہ قرض لیا۔ اٹلی اور امریکہ سے نئے ہتھیار منگوائے۔ اور نئے رنگروٹوں کے لئے ملک کے طول و عرض میں مشن بھیجے۔ ترک لڑتے لڑتے خستہ حال ہو رہے تھے۔ اور اب وہ اطمینان اور چین چاہتے تھے۔ تاکہ آرام سے کھیتی باڑی میں مصروف ہو جائیں۔ اس لئے اب کے رنگروٹوں کے بھرتی کرنیوالے مشن کو کسی قدر مایوسی

کاسامنا کرنا پڑا۔ لیکن غازی پاشا کی لغت میں ناممکن کوئی معنی ہی نہیں رکھتا تھا۔ انھوں نے خود بعض دیہات کا دورہ کیا۔ اور جہاں جہاں وہ گئے لوگ غیرتِ قومی سے مدہوش ہو ہو گئے۔ اور جوق جوق ان کے جھنڈے تلے آنے لگے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں غازی پاشا نے تھکی ہوئی ترکی فوج کی مدد کیلئے ایک اور تازہ دم فوج تیار کرلی۔ لیکن ابھی وہ اس مہم سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ انگورہ میں سیاسی مدبروں کی جماعت نے پھر ان کا راستہ کاٹا۔ رؤف اور فتحی بھی مالٹا سے چھوٹ کر انگورہ آگئے تھے۔ ان لوگوں نے پہلے تو غازی پاشا کی تائید کی لیکن کچھ ہی دنوں بعد انھیں غازی پاشا کے غیر محدود اختیارات پر اعتراض ہوا۔ اور ان دونوں نے مل کر یہ کوشش کی کہ گرینڈ نیشنل اسمبلی ان کے اختیارات واپس لے لے۔ رؤف اور فتحی اصل میں ڈموکراٹک خیال کے سیاسی مدبروں میں تھے۔ اور ڈکٹیٹری کو کسی انداز میں پسند نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت بھی جبکہ حالات قابو میں نہیں آئے تھے اور یونانی سمرنا پر مورچہ جمائے بیٹھے تھے ان دونوں نے اپنے اختلاف کے اظہار میں تامل نہیں کیا۔ اور ساری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھکر یہ کوشش کی کہ اسمبلی کے ذریعہ غازی پاشا کے سارے غیر معمولی فوجی اور سول اختیارات واپس لے لیں۔ لیکن ان کی یہ کوشش بیکار گئی۔ اسمبلی نے یونانیوں کے خطرہ کو ابھی ملک میں باقی دیکھکر اس موضوع پر بحث کرنے ہی سے انکار کردیا۔ اپنی اس کوشش میں جب ان لوگوں کو ناکامی ہوئی تو انھوں نے غازی پاشا پر زور دینا شروع کیا کہ اسی وقت یونانیوں سے صلح کرلیں اور لڑائی کو طول نہ دیں۔ کیونکہ نہیں کہا جاسکتا کہ سمرنا کی مورچوں پر ترکوں کو کیا صورت پیش آئے۔ لیکن غازی پاشا نے اس مشورہ کو سننے تک سے انکار کردیا۔ انھیں یقین تھا کہ ہم یونانیوں کو لڑائی میں مکمل شکست دیں گے

اور اس وقت صلح کی بھیک مانگنے کی عوض فہمند ہو کر اپنی شرائط خود اتحادیوں کے آگے پیش کریں گے۔ لیکن جب ان لوگوں کا دباؤ زیادہ پڑا تو محض یہ دکھانے کو کہ ان لوگوں نے حالات کا کس قدر غلط اندازہ لگایا ہے اور کیسی غلط توقعات اتحادیوں سے قائم کی ہیں، غازی پاشا اس پر راضی ہو گئے کہ سمرنا کے معرکہ سے پہلے ان لوگوں کو ایک دفعہ صلح کی کوشش کر لینے دیں۔ چنانچہ صلح کی بات چیت کیلئے فتحی کچھ ساتھیوں کے ساتھ لندن گئے۔ لیکن وہاں کسی نے ان کی بات سننی تو بڑی بات ہے اس وفد سے ملاقات تک نہ کی۔ بلکہ لندن کے لوگ اس وفد سے نہایت ذلت آمیز طریقہ سے پیش آئے۔ جب یہ وفد مایوس ہو کر لندن سے انگورا واپس ہوا تو غازی پاشا طنزیہ انداز میں مسکرائے۔ گویا ان ضدی اور ناتجربہ کار لڑکوں کو یہ یاد دلایا کہ وہ اس نتیجہ پر پہلے ہی پہنچ چکے تھے کہ صلح کی بھیک نہیں مانگی جاتی بلکہ صلح زور بازو سے حاصل کی جاتی ہے۔ وفد کے لندن سے مایوس واپس آنیکے بعد مخالف پارٹی پر اوس پڑ گئی اور غازی پاشا پھر پوری سرگرمی سے ایک آخری مقابلہ کی تیاریاں کرنے لگے۔ اگست ۱۹۲۲ء کے آخری ہفتہ غازی پاشا نے یونانیوں پر حملہ کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ پہلی اگست کو آپ نے میدان جنگ کی ساری فوجوں کا خود جائزہ لے لیا۔ اور ہر ہر رجمنٹ میں پہنچ کر سپاہیوں کی ترتیب دیکھی اور نہایت خاموشی کے ساتھ راز میں آخری حملہ کیلئے کمانڈروں کو ضروری ھدایتیں دیں۔ اسی دوران میں دشمنوں کی آنکھوں میں خاک ڈالنے کیلئے غازی پاشا نے ایک فٹ بال ٹورنامنٹ کرنیکا حکم دیا۔ اور فائنل دیکھنے خود گئے۔ وہاں ہر رجمنٹ کے کمانڈر کھیل دیکھنے کے بہانے موجود تھے۔ جنھیں غازی پاشا نے ۲۶۔ اگست کی صبح کو دشمن پر حملہ کر دینے کا حکم اور ہر رجمنٹ کے متعلق ضروری ہدایتیں دیں اور کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ فٹ بال کے اس پُر اسرار فائنل میچ میں کیا کچھ ہو گیا۔

اس میچ کے دوسرے دن باہر کے سارے تار کاٹ دیئے گئے ۔ اور دشمن کو اور زیادہ بھلاوا دینے کیلئے یہ افواہ اڑادی کہ انگورا میں بغاوت ہوگئی ہے ۔ ۲۴۔ اگست کو غازی پاشا نے انگورہ میں جتنے غیر ملکی سفیر اور ترکی مدبر تھے ان سب کو ۲۶۔ اگست کو ڈنر اور رات کو بال میں شریک ہونے کے لئے دعوتی رقعے بھیجے۔ غرض اس حملہ کی تیاریاں غازی پاشا نے اس قدر چپکے چپکے کیں کہ نہ صرف انگورا میں کسی سیاسی مدبر کو اس کا پتہ نہ چلا بلکہ خود غازی پاشا کے گھر میں ان کی والدہ اور ان کی بہن فکری خانم نے بھی کوئی نئی بات محسوس نہیں کی ۔ ادھر یونانی افسر بھی اس سے بالکل بیخبر تھے کہ کیا ہونیوالا ہے ۔ یونانی کمانڈر انچیف بدل دیا گیا تھا۔ اور اب جو کمانڈر تھا وہ غریب سمرنا کی یونانی فوجوں سے بھی اچھی طرح واقف نہ تھا۔ اور کمانڈروں کے ساتھ ہی بہت سے چھوٹے یونانی افسر بھی سمرنا کے محاذ پر نئے تبدیل ہوئے تھے۔ یونان میں وینیزولہ کی حکومت کا خاتمہ ہوچکا تھا ۔ اور وینیزولہ کے ساتھ اس کی پالیسی بھی ختم ہوچکی تھی ۔ سمرنا کی یونانی فوجوں سے پایہ تخت میں دلچسپی کم ہوگئی تھی ۔ جس کی وجہ سے فوجیں بھی کچھ بےترتیب سی تھیں ۔ اور ر حوصلہ چھوڑے ہوئے معلوم ہو رہی تھیں

غرض یہ صورت تھی جس سے فائدہ اٹھا کر ترکی فوجوں نے غازی پاشا کی قیادت میں ۲۶۔ اگست کی صبح چار بجے یونانیوں کے اہم پوزیشن "افیون قرہ حصار"، پر حملہ کردیا ۔ اور شام تک سمرنا کی فوجوں سے ان کے سارے تعلقات منقطع کر دیئے۔ یونانی انتہائی بے سروسامانی اور پریشانی میں میدان چھوڑ کر بھاگے ۔ اور انکے تعاقب میں پوری تیزی سے ترکی سپاہ تھی ۔ لیکن یونانی جس قدر تیزی سے فرار ہوئے ترکی سپاہی اس قدر تیزی سے ان کا تعاقب نہ کر سکے ۔ اس لئے بھاگتے

ہوئے یونانیوں کو یہ موقع مل گیا کہ راستہ میں جو ترکی آبادی انھیں ملی اسے تباہ و تاراج کر گئے۔ بچوں بوڑھوں اور عورتوں تک کو یونانی درندوں نے تہ تیغ کر دیا۔ اور بستی کی بستیاں پھونک دیں۔ ان یونانی درندوں کی پسپا ہوتی ہوئی فوجوں نے اناطولیہ کے مغربی علاقہ کو خوب روندا۔ لیکن پیر ان کے کہیں نہ جم سکے۔ وہ برابر پیچھے ہٹتے جا رہے تھے اور ترکی فوجیں ہر طرف سے انھیں دبا رہی تھیں۔ بندرگاہ سمرنا پر یونانی بیڑے اپنی شکست خوردہ فوج لے جانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ اور فوجیں انتہائی بدحواسی میں ان پر سوار ہو رہی تھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ترکی فوجیں سمرنا پہونچ جائیں اور ان کی واپسی کا راستہ روک لیں۔ غرض ۲۶۔ اگست کو ترکی فوجوں نے یونانیوں پر جارحانہ حملہ شروع کیا اور دس دن کے اندر انھیں ترکی سرحد سے پرے بحیرۂ روم میں دھکیل دیا۔ اور اس طرح یونانیوں کے ناپاک قدموں کے نشان تک سے ترکی کی سرزمین کو پاک کر دیا۔

سمرنا فتح ہو چکا تھا۔ غازی پاشا "یوشاک" میں ٹھیرے ہوئے تھے اور سمرنا میں غازی پاشا کے فاتحانہ داخلہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ خبر ملی کہ یونانی کمانڈر انچیف اور اس کا سکنڈ اِن کمانڈ دونوں گرفتار ہو گئے۔ غازی پاشا نے حکم دیا کہ دونوں ان کے ملاحظہ میں پیش کئے جائیں۔ "یوشاک" کے ٹاؤن ہال میں غازی پاشا نے ان شکست خوردہ جنرلوں سے ملاقات کی۔ ملاقات کے وقت غازی پاشا کی ایک طرف مارشل فیضی اور دوسری طرف عصمت پاشا تھے۔ غازی پاشا نے بڑی تپاک اور اخلاق سے اپنے شکست خوردہ دشمنوں کی پذیرائی کی سگریٹ اور کافی سے بھی ان کی خاطر کی۔ اور جنگ کی چالوں پر ان سے گفتگو کرتے رہے۔ لیکن غازی پاشا کو بڑی مایوسی ہوئی اس لئے کہ یہ لوگ جنگی تدبیروں پر گفتگو کرنیکے بجائے اپنی

اپنی قسمت کا گلہ کرتے رہے۔ غازی پاشانے بالآخران الفاظ کے ساتھ انھیں رخصت کیا "جنرل! جنگ اصل میں قسمت کا کھیل ہے۔ آپ نے قابلیت سے مقابلہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن قسمت آپ کے ساتھ نہ تھی اس لئے مایوس ہونے سے کوئی فائدہ نہیں" جب یہ دونوں چلے گئے تو غازی پاشانے عصمت پاشا کی طرف دیکھا۔ گویا غازی پاشا کو اس سے مایوسی ہوئی۔ کہ جو جنرل آپ کے مقابل تھے وہ فوجی مہارت میں آپ کے برابر نہ تھے۔

آخر کار سمرنا میں غازی پاشا کے داخلہ کے سارے انتظامات مکمل ہو گئے اور ستمبر کی ۱۰ کو غازی مصطفےٰ کمال پاشا اپنے خاص باڈی گارڈ کے جلو میں سمرنا میں داخل ہوئے۔ ترک مارے خوشی کے دیوانے ہو رہے تھے۔ سڑکوں کے دونوں طرف عورتوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے جو غازی پاشا کی موٹر میں پھول برسا رہے تھے۔ اور زور زور سے غازی کو دعائیں دے رہے تھے۔ جگہ جگہ اعزازی کمانیں بنائی گئی تھیں۔ اور رات کو سارے شہر میں چراغاں کئے گئے تھے۔ دور سمندر میں ایک طرف یونانی فوجوں کے جہاز بدحواسی کے ساتھ یونان واپس جا رہے تھے۔ اور دوسری طرف اتحادیوں کے جنگی جہاز کھڑے شہر کے چراغوں کا تماشہ کر رہے تھے۔ لیکن دونوں قطعی بے بس اور کسی قسم کی مداخلت سے مجبور تھے۔ سمرنا کی فتح کے ساتھ ہی ترکی اور یونانی جنگ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اور اب اتحادی ترکی سے خود ترکوں کی شرائط پر صلح کرنے کے لئے مجبور تھے۔

باب ۱۹

لطیف خانم سے پہلی ملاقات

سمرنا میں غازی پاشا شہر کے اندر ایک معمولی سے مکان میں ٹھیرے ہوئے تھے اور وہیں سے سمرنا کی فتح کے بعد جدید نظم ونسق نافذ کر رہے تھے۔ یونانی اگرچہ اناطولیہ کو خالی کر گئے تھے۔ لیکن یورپ کی طرف سے وہ تھریس میں جمع ہونے لگے تھے۔ اور غازی پاشا چاہتے تھے کہ تھریس میں یونانیوں کی فوجیں جمع ہونے سے پہلے ہی ان پر حملہ کر دیا جائے۔ لیکن دقّت یہ تھی کہ ترکی کے پاس کوئی بحری بیڑا نہیں تھا۔ اور خشکی کی راہ سے ترکی فوجیں اس لئے گذر نہیں سکتی تھیں کہ "چناق" پر برطانوی فوجیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ کبھی اجازت نہ دیتیں۔ کہ ترکی کی فوجیں ان کے آگے سے تھریس میں گذر جائیں۔

سمرنا آئے ہوئے غازی پاشا کو تیسرا دن تھا۔ اور وہ ابھی اس نئی گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھے کہ ایک آرڈرلی غازی پاشا کے کمرہ میں آیا۔ اور اس نے اطلاع دی کہ ایک خاتون غازی پاشا سے ملنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے اپنا نام نہیں بتایا۔ اور انھیں اصرار ہے کہ وہ اسی وقت غازی پاشا سے ملیں گی۔ ابھی آرڈرلی کا یہ بیان ختم نہیں ہوا تھا اور نہ غازی پاشا نے کوئی حکم دیا تھا کہ ایک ترک لڑکی یورپین لباس میں بغیر نقاب کے بے دھڑک پردہ اٹھا کر کمرے کے اندر چلی آئی۔ یہ بالکل نئی بات تھی۔ لیکن غازی پاشا نے ضبط کیا اور اس آرڈرلی کو

اشارے سے باہر جانیکا حکم دیا۔ جب آرڈرلی چلا گیا تو غازی پاشا نے اس خاتون سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتی ہے ۔ اس خاتون نے اپنا نام لطیفہ خانم بتایا اور کہا کہ میرے والد سمرنا کی جہاز راں کمپنی کے مالک ہیں ۔ اور اس وقت وہ پیرس میں ہیں ۔ میں خود بھی پیرس سے کل ہی آئی ہوں ۔ اس کے بعد اس نے غازی پاشا سے درخواست کی کہ وہ جب تک سمرنا میں رہیں اس کے مہمان رہیں ۔ غازی پاشا اور ان کے اسٹاف کیلئے اس کی کوٹھی ہر وقت حاضر ہے ۔ غازی پاشا کو چونکہ خود بھی اس جگہ تکلیف تھی اس لئے غازی پاشا نے لطیفہ خانم کی درخواست قبول کرلی ۔ اور ان کی خوبصورت کوٹھی میں جو پہاڑی پر واقع تھی اٹھ گئے ۔

یہ لطیفہ خانم کی اور غازی پاشا کی پہلی ملاقات تھی ۔ کوٹھی میں لطیفہ خانم نے غازی پاشا کی ضروریات کی خود نگرانی کی ۔ اور انھیں اس قدر آرام پہونچایا کہ جس قدر انھیں خود اپنے گھر میں مل سکتا تھا ۔ اسی دوران میں لطیفہ خانم اور غازی پاشا میں مختلف موضوع پر تبادلہ خیال بھی ہوتا رہا ۔ اس سے غازی پاشا کو لطیفہ کی قابلیت اور معلومات کا اندازہ کرنیکا موقع مل گیا ۔ انھیں معلوم ہوگیا کہ لطیفہ خانم نے پیرس میں تعلیم کی تکمیل کی ہے ۔ اور وہ بہت آزاد خیال اور وسیع معلومات کی خاتون ہیں ۔ ان باتوں نے لطیفہ خانم کو اور زیادہ غازی پاشا کی قریب کردیا ۔ بلکہ غازی پاشا نے لطیفہ خانم کی صحبت میں یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ انھیں اب ایک رفیقہ حیات کی ضرورت ہے ۔ جو نہ صرف ان کی تنہائی کو دور کرکے ان کا حوصلہ بڑھاتی رہے بلکہ ترکی کو نیا جنم دینے کے متعلق انھوں نے جو اسکیم بنا رکھی ہے اس میں بھی ان کی مدد کرے ۔ اور لطیفہ خانم میں غازی پاشا کو یہ دونوں باتیں نظر آئیں ۔ غازی پاشا کو یقین تھا کہ لطیفہ خانم ترکی میں آزادی نسواں کی تحریک

کو کامیاب بنانیکی پوری پوری اہلیت رکھتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کی مغربی تربیت غازی پاشا کی خانگی زندگی ہیں جو فوجی اور ملکی معاملات کی مسلسل کش مکش کے باعث انتہائی پراگندہ اور پریشان ہو رہی ہے ایک قسم کا کیف اور سکون پیدا کر دیگی چنانچہ انھوں نے یہ طے کر لیا کہ وہ لطیفہ خانم سے شادی کر لیں گے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ غازی پاشا نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ جب تک ترکی سرزمین کو وہ اغیار سے پاک نہ کریں گے اس وقت تک اپنی ذاتی آسائش کی طرف بالکل توجہ نہ دیں گے۔ اس لئے فی الفور وہ شادی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہی بات نہایت صفائی سے انھوں نے لطیفہ خانم سے بھی کہہ دی۔ اور آئندہ کیلئے آپس ہیں قول و قرار بھی ہو گئے۔ جس کے بعد تیسرے ہی دن غازی پاشا "بروصہ" روانہ ہو گئے تاکہ تھریس ہیں جمع ہونے والی یونانی فوجوں کو منتشر کرنے کیلئے فوجی پیش قدمی شروع کریں۔

باب ۲۰

چناق پر انگریزی فوجوں کا سامنا اور عارضی مصالحت

سمرنا سے واپس آتے ہی غازی پاشا نے اپنی فوج کے دو کالم کئے۔ ایک کو دردانیال کی طرف روانہ کیا اور دوسرے کو قسطنطنیہ کی طرف بھیجا "چناق" پر انگریزی فوجیں پڑی ہوئی تھیں۔ غازی پاشا نے انگریزی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ہیرنگٹن کو لکھا کہ ترکی فوجیں تھریس میں یونانیوں سے مقابلہ کیلئے اس راہ سے گذریں گی انھیں اس کی اجازت دیدی جائے۔ لیکن جنرل ہیرنگٹن نے ایسی اجازت دینے سے قطعاً انکار کر دیا۔ یہ وقت بہت نازک اور بڑی آزمائش کا تھا۔ ایک طرف ترکی فوج فتح کے نشے میں چور اپنے راستہ میں کسی روک کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھی۔ دوسری طرف یہ خطرہ تھا کہ اگر چناق کی مٹھی بھر انگریزی فوج کو پرے ہٹا کر ترک تھریس میں پہونچ گئے تو یہ ایک نئی جنگ عظیم کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ کیونکہ اس موقع پر انگریزی فوج سے لڑنے کے معنی یہ تھے کہ اتحادیوں کو دعوتِ جنگ دیدی جائے۔

ادھر غازی پاشا صورت حال کی اس نزاکت پر غور کر رہے تھے۔ اُدھر جنرل ہیرنگٹن کو اپنی فکر پڑی ہوئی تھی، یہ برائے نام اتحادی فوجوں کے سپہ سالار بنے بیٹھے تھے۔ حالانکہ ترکی پیش قدمی کو دیکھکر پہلے فرانسیسی اور پھر اطالوی

فوجیں دردانیال سے کھسک[1] گئی تھیں اور اب ترکوں کا صرف انگریزوں ہی سے مقابلہ رہ گیا تھا اس لئے ساری ذمہ داری جنرل ہیرنگٹن اور ان کی برطانوی فوجوں پر آپڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غازی پاشا برطانوی جنرل سر چارلس ہیرنگٹن کی اس کمزوری کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ اور انھیں یہ یقین ہوگیا تھا کہ انگریزی سپہ سالار کی یہ کوری دھمکی ہے۔ وہ پیش قدمی کی صورت میں ترکوں سے مقابلہ ہرگز نہ کریگا۔ چنانچہ انھوں نے بے دھڑک اپنی فوجوں کو چناق پر بڑھنے کا حکم دیدیا۔ یہاں تک کہ ترک اور انگریزوں کے درمیان چند قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ یہ حقیقتاً ایسا نازک وقت تھا کہ کسی طرف سے بھی اگر غلطی سے ایک فائر بھی ہوجاتا تو پھر سارے یورپ میں جنگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آنے لگتے۔ ایک طرف ترکوں نے انتہائی تحمل سے کام لیا اور اپنے سپہ سالار کے حکم سے ہتیار نیچے کئے ہوئے دوستانہ انداز میں بڑھتے چلے گئے اور دوسری طرف انگریزی فوجوں نے دانشمندی سے کام لیا کہ ترکوں کی مسلسل پیش قدمی سے مشتعل نہ ہوئے۔ اصل میں ترکوں کی اس جسارت پر انگریزی فوج چکر میں پڑگئی تھی کہ وہ اب کرے تو کیا کرے۔ جنرل ہیرنگٹن کا اخیر یہ حکم ضرور تھا کہ ترکوں کو روکیں، لیکن یہ حکم ہرگز نہیں تھا کہ ترکوں سے لڑیں۔ صورت حال کی اس نزاکت نے یورپ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سنسنی پھیلادی اور فرانس کو یہ اندیشہ ہوگیا کہ اگر ترکوں اور انگریزوں میں

---

[1] جب ترکی کالم قسطنطنیہ اور دردانیال کی طرف بڑھے تو برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج نے چناق کی فوجوں کے لئے خطرہ محسوس کیا اور ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ لیکن یہ اعلان چونکہ اتحادیوں کے مشورے کے بغیر ہوا تھا اس لئے فرانس اور اٹلی نے اسی کو وجہ قرار دے کر اپنی اپنی فوجیں دردانیال سے ہٹالی تھیں۔

لڑائی ہو پڑی تو فوراً روس بھی میدان جنگ میں اتر آئیگا اور یورپ میں پھر ایک نئی جنگ شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ اس جنگ کے احتمال ہی سے بد حواس ہو کر فرانس نے فوراً اپنا سفیر فرینکلن بوائیلن عارضی مصالحت کے پیغام کے ساتھ غازی پاشا کی خدمت میں بھیجا، اور تھریس کو یونانیوں اور قسطنطنیہ کو اتحادیوں سے خالی کرانیکی خود ذمہ داری لے لی۔ فرانس کی اس مداخلت کے ساتھ ہی مدانیہ میں اتحادیوں کی ایک کانفرنس ہوئی، جس میں عصمت پاشا نے کمالی ترکوں کی نمائندگی کی۔ اور ان شرائط کے ماتحت کہ تھریس کو یونانی فوج سے خود اتحادی خالی کرا دیں گے اور قسطنطنیہ سے بھی جلد سے جلد وہ اپنی فوجیں ہٹا لیں گے ترکی اور برطانیہ میں عارضی معاہدہ مصالحت پر دستخط ہو گئے۔

اس معاہدہ کے بعد حقیقتاً کمالی ترکوں کی فتح مکمل ہو گئی۔ اور وہ جو کچھ چاہتے تھے وہ سب کچھ انھیں مل گیا۔ اور اب غازی پاشا اس قابل ہو گئے کہ اتحادیوں سے اپنی شرائط پر صلح کریں۔

اس عارضی مصالحت کا اثر انگلستان پر یہ پڑا کہ مسٹر لائڈ جارج کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ان کی جگہ قدامت پسند پارٹی کے لیڈر مسٹر بونرلا نے وزارت ترتیب دی اور یونان میں یہ ہوا کہ بری اور بحری افسران فوج نے شاہ قسطنطین کے خلاف بغاوت کر دی اور اس غریب کو دوبارہ یونان سے جلاوطن کر دیا۔ اور وینیزولہ کو دوبارہ یونان میں بلا لیا۔

زبیدہ خانم والدہ آتا ترک

’شمان کیا‘ میں آتا ترک کا مکان
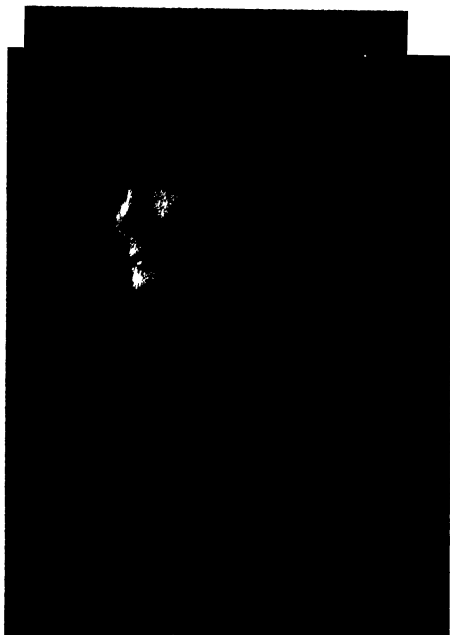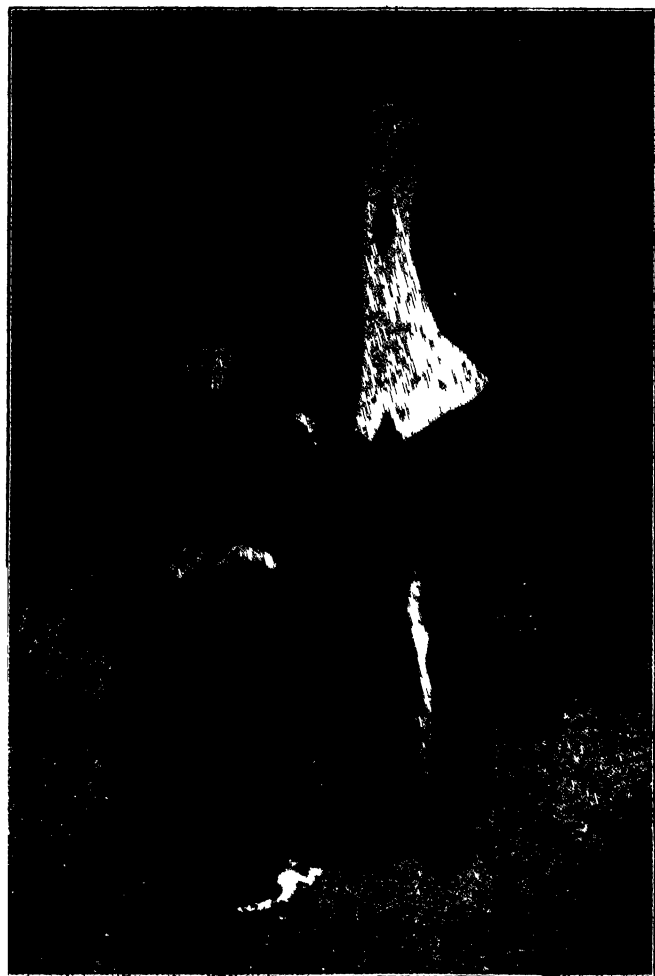
آتا ترک اور لطیفہ خانم

باب ۲۱

لطیفہ خانم سے غازی پاشا کی شادی

اتحادیوں کے معاہدہ کے بعد کہ تھریس سے وہ خود یونانیوں کو نکال دینگے اور قسطنطنیہ سے بھی بہت جلد اپنی فوجیں ہٹالیں گے قوم پرست ترکوں کا مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ اور غازی پاشا کا یہ عہد بھی پورا ہو چکا تھا کہ جب تک ترکی کو اپنی سرحدات میں غیر ملکی اثر سے آزاد نہ کرالیں گے اس وقت تک ذاتی آسائش کو حرام سمجھیں گے۔ چنانچہ اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد ہی ادھر انگورا اور اناطولیہ کے ہر بڑے شہر میں قوم پرست ترکوں کی اس فتح پر خوشیاں منائی جارہی تھیں اور ادھر غازی پاشا چپ چاپ کسی سے کچھ کہے سنے بغیر انگورا سے موٹر میں سمرنا کی طرف اڑے چلے جارہے تھے۔ سمرنا میں سیدھے لطیفہ خانم کے گھر پہونچے اور اطلاع کرائے بغیر اندر چلے گئے کہتے ہیں کہ اس وقت لطیفہ خانم باورچی خانہ میں کھڑی تھیں۔ فرائی پان ہاتھ میں تھا اور اپنے لئے کوئی چیز تلنی چاہتی تھیں کہ غازی پاشا نے دبے پاؤں باورچی خانہ میں پہونچ کر پیچھے سے ان کی آنکھیں بند کرلیں، لطیفہ خانم نے بوکھلا کر جب ان کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے جدا کئے تو غازی پاشا کو اپنے سامنے کھڑا دیکھکر گھبرا سی گئیں۔ غازی پاشا نے وہیں باورچی خانہ ہی میں لطیفہ خانم کو اپنا وعدہ یاد دلایا اور اسی وقت ایفاء عہد کا تقاضا کیا۔ تو غازی پاشا کی یکایک آمد اور فوراً ہی

نکاح کی درخواست سے لطیفہ خانم کچھ بے اوسان سی ہوگئیں اور بڑی مشکل سے انھوں نے نکاح کے مسئلہ کو دوسرے دن پر ٹالا۔ دوسرے دن صبح سویرے ہی سمرنا کے قاضی نے دو گواہوں کی موجودگی میں اسلامی طریقہ پر غازی پاشا کا نکاح لطیفہ خانم سے پڑھ دیا۔ اور اسی دن غازی پاشا اپنی دولھن کو لیکر اناطولیہ کے دیہات میں دورہ پر چلے گئے۔ نکاح کے بعد بھی غازی پاشا نے اپنی شادی کا چرچا نہیں کیا۔ بلکہ جب غازی پاشا دیہات کے دورہ سے فارغ ہو کر اپنی دلھن کے ساتھ انگورا پہو نچے اور ان کے دوستوں اور عام ترکوں نے لطیفہ خانم کو ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا دیکھا اس وقت پتہ چلا کہ غازی پاشا نے بالآخر شادی کرلی ——— ان کی شادی پر ملک میں کچھ دنوں طرح طرح کی چہ میگوئیاں رہیں۔ ان کے سیاسی حریفوں کا خیال تھا کہ مصطفےٰ کمال شاید سلطان بننا چاہتے ہیں، ان کے دوستوں کا خیال تھا کہ یہ شادی کامیاب ثابت نہیں ہوسکتی۔ لیکن ان کی والدہ اور اناطولیہ کے سادہ لوح ترکوں کو کسی گہرائی میں جانیکی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خوش تھے کہ بالآخر غازی پاشا کی خانہ آبادی ہوگئی۔

باب ۲۲

ترکی جمہوریت کی طرف پہلا قدم

مدانیہ کی عارضی مصالحت کے بعد غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی شخصیت سارے مشرق میں نمایاں ہوگئی۔ اور اس فتح کی مبارکباد دینے شام، مصر، ایران، افغانستان اور ہندوستان کے وفدان کی خدمت میں پہونچے۔ اسی کے ساتھ سوویٹ روس کا بھی ایک وفد آیا۔ جس نے ترکی کو دعوت دی کہ مغرب کی ہوس پرستی کو ختم کرنے اور پست قوموں کو ابھارنے میں ترکی سوویٹ روس کا شریک ہوجائے۔ اس زبردست ذاتی کامیابی کے وقت جب کہ یورپ اور ایشیا میں غازی پاشا کی فوجی مہارت اور سیاسی قابلیت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اور ایشیا کی ہر قابل فخر سلطنت کے وفدان کے آئندہ پروگرام معلوم کرنے کیلئے بے چین تھے۔ اور اپنی طرف سے ہر قسم کی امداد کا وعدہ کرنے کو تیار تھے۔ غازی پاشا نے غیر معمولی سیاسی بصیرت اور انتہائی دانش مندی کا ثبوت دیا۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انکی قیادت صرف ترکی کو غیر ملکی اثر و اقتدار سے آزاد کرانے کی حد تک ہے۔ اس سے زیادہ کی نہ ترکی کو ضرورت ہے۔ اور نہ وہ خواہ مخواہ ترکی کو دوسری قوموں کے جھگڑے میں پھنسانے کے خواہش مند ہیں۔ چنانچہ ان اسلامی اور سوویٹ وفد کا خیر مقدم تو انھوں نے نہایت تپاک سے کیا لیکن اپنے جواب میں بڑی صفائی سے یہ بتادیا کہ:-

"دنیا میں نہ کوئی قوم ظالم ہے نہ مظلوم، وہ قومیں مظلوم کہلاتی ہیں جو اوروں کو اپنے اوپر ظلم کرنے کی اجازت دیتی ہیں لیکن الحمدللہ کہ ترک ان میں سے نہیں ہیں، ترک اپنی حفاظت خود کرسکتے ہیں اور یہی دوسری قوموں کو بھی کرنا چاہیئے۔ اس وقت ہمارے آگے صرف ایک ہی اصول ہے اور وہ یہ کہ ہر مسئلہ کو ہم ترکی نقطہ نظر سے دیکھیں اور ترکی مفاد کی حفاظت کریں۔"

غازی پاشا کے اس جواب سے ان اسلامی اور غیر اسلامی سلطنتوں کے وفد کو مایوسی تو بہت ہوئی لیکن دُنیا کو ترکی کی آئندہ پالیسی نہایت صفائی سے معلوم ہوگئی۔ جس کے بعد مصطفےٰ کمال کے آئندہ پروگرام کے متعلق یورپ کو کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ اور ایشیا کی غلط توقعات ختم ہوگئیں۔

لیکن جیسے ہی قوم پرست ترکوں کی فتح کا چرچا کم ہوا انگورا کے سیاسی مدبروں میں یہ بحث پھر تازہ ہوگئی کہ اب ترکی میں کس وضع کی حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ کیونکہ انگورا میں اس وقت تک عارضی حکومت تھی۔ اور قسطنطنیہ میں جہاں سلطان اپنے وزیروں کے ساتھ بیٹھے تھے برائے نام حکومت تھی، انگورا کے مدبر اب اس دو عملی کو ختم کر کے ترکی کے لئے ایک ہی وضع کی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان مدبروں میں رؤف بے جو مالٹا سے واپس آنے کے بعد انگورا کی اس عارضی حکومت کے وزیر اعظم بنا دیئے گئے تھے پیش پیش تھے۔ انھیں غازی پاشا سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ سلطان کی حکومت کو ختم کر کے خود ترکی کے ڈکٹیٹر بننا چاہتے ہیں۔ اور وہ اور ان کی پارٹی یہ نہیں چاہتی تھی کہ ترکی میں غازی پاشا کو مختار مطلق دیکھے، اس لئے اس پارٹی نے حکومت کی دو عملی کو ختم

کرنے کی یہ تجویز سوچی تھی کہ ترکی میں برطانیوی دستور رائج کیا جائے۔ سلطان برائے نام ترکی کے شہنشاہ رہیں۔ اور مصطفیٰ کمال پورے اختیارات کے ساتھ ان کے آئینی وزیر اعظم بنا دیئے جائیں۔ چنانچہ رؤف بے اور ان کی پارٹی نے جس میں فتحی، رفعت، ادنان اور خالدہ ادیب بھی شامل تھے یہ تجویز غازی پاشا کے آگے پیش کی۔ لیکن غازی پاشا نے اس کا فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ یہ وعدہ کر لیا کہ وہ بہت جلد اس سلسلے میں اپنے خیالات اسمبلی میں ظاہر کر دیں گے۔ اصل میں غازی پاشا یہ نہیں چاہتے تھے کہ قوم پرست ترکوں کی جدوجہد کا پھل سلطان وحید الدین جیسے قومی غدار کے حصے میں آئے اور ترکی کے کندھے پر ایک دفعہ پھر شخصی حکومت کا جوا رکھ دیا جائے۔ وہ اب ترکی میں سوئٹزرلینڈ کے وضع کی کامل جمہوریت قائم کرنی چاہتے تھے۔ لیکن ان سیاسی مدبّروں کے خیالات معلوم کر کے اور یہ محسوس کر کے کہ ملک ابھی اپنی پچھلی روایات کو بھلانے پر تیار نہیں ہے غازی پاشا نے اپنے اصلی خیالات کے اظہار سے پرہیز کیا۔ اور رؤف اور انکی پارٹی کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ اس مسئلہ میں اپنے خیالات اسمبلی میں ظاھر کریں گے۔

لیکن غازی پاشا کو اپنے اصلی خیالات کی ایک جھلک اسمبلی میں دکھانے کا موقع بہت جلد مل گیا۔ متحدین نے لوزان میں صلح کی کانفرنس تجویز کی۔ مگر برطانیہ کی رائے سے اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت قسطنطنیہ کی برائے نام حکومت کو دی گئی۔ برطانیہ نے یہ چال غازی پاشا کو نیچا دکھانے کیلئے چلی تھی۔ لیکن یہ خود اُسی پر اُلٹی پڑی، اور غازی پاشا نے برطانیہ کی اس حماقت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انگورہ کی نیشنل اسمبلی غصہ سے بدحواس ہو گئی۔ سارے

ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگ گئی۔ کہ قسطنطنیہ کی برائے نام حکومت اور اس کے غدار سلطان کو یہ حق کب پہونچتا تھا کہ وہ لوزان کانفرنس کی دعوت قبول کرے، جگہ جگہ سلطان کے آدمیوں پر حملے ہوئے خود سلطان اور اس کے وزیر اعظم کو قسطنطنیہ میں مُنہ دکھانا مشکل ہوگیا۔ غازی پاشا نے سلطان کی اس عام مخالفت میں قیام جمہوریت کا ایک موقع دیکھا۔ فوراً نیشنل اسمبلی کو مدعو کیا کہ وہ آئندہ حکومت کا خاکہ بنائے۔ اور ملک سے اس دوعملی کو ختم کرنیکی کوئی تدبیر سوچے۔ اسمبلی کے اجلاس میں سلطان اور اس کی برائے نام حکومت کی پوری شدت سے مخالفت ہوئی، ممبروں نے سخت سے سخت اشتعال انگیز تقریریں کیں۔ لیکن کسی خاص نتیجہ پر نہ پہونچ سکے۔ غازی پاشا جو اسمبلی میں بیٹھے ہوئے ان تقریروں کو سن رہے تھے اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور اسمبلی کے ممبروں کو مخاطب کرکے ایک چھوٹی سی تقریر کی جس میں یہ تجویز پیش کی کہ خلافت سے سلطنت کو علیحدہ کردیا جائے۔ اور سلطان وحید الدین کو معزول کردیا جائے اسمبلی کے ممبروں میں اگرچہ اس وقت سلطان کے خلاف کافی جوش پایا جاتا تھا۔ لیکن اس انوکھی تجویز کو سن کر وہ سب کے سب چونک پڑے۔ اس لئے کہ مذہب اسلام میں ایسا کوئی تخیل ہی موجود نہ تھا کہ خلیفہ مسلمانوں کا مذہبی پیشوا تو رہے لیکن سلطان نہ رہے۔ خلافت کے منصب میں صدیوں سے دینی پیشوائی اور دُنیاوی قیادت، مذہبی رہنمائی اور دنیاوی حکومت دونوں شامل چلی آتی تھیں اور اسلامی تاریخ میں ایک بھی ایسی مثال نہیں تھی کہ یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے جدا سمجھی گئی ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ اسمبلی کے ممبر انتہائی جوش و خروش کے عالم میں بھی اس انوکھی تجویز کو نہ فوراً سمجھ سکے اور نہ منظور کرسکے۔ اس تجویز کو غور وبحث کیلئے ایک شرعی اور قانونی کمیٹی کے سپرد کردیا۔

دوسرے ہی دن اس شرعی اور قانونی کمیٹی کا اجلاس ہوا تو اس اجلاس میں ترکی کے بڑے بڑے مفتی اور مقنن شامل تھے۔ غازی پاشا بھی ایک کونے میں بیٹھے ان کے بحث مباحثہ کی سیر دیکھ رہے تھے۔ بحث نے کافی طول کھینچا اس تجویز کے موافقین اور مخالفین میں بڑے زور کی رسّہ کشی ہوتی رہی اور ایوان میں بے انتہا جوش وخروش پیدا ہوگیا۔ اندیشہ تھا کہ کہیں ممبروں میں فساد نہ ہو جائے۔ کہ غازی پاشا اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔ کمیٹی نے غازی کو اپنے خیالات ظاہر کرنیکی اجازت دیدی۔ غازی پاشا نے ایک بہت مختصر سی تقریر کی اور آخر میں کہا :۔

"حکومت ہمیں عطا نہیں کی گئی ہے بلکہ ہم نے اپنے قوتِ بازو سے چھینی ہے۔ اس سے پہلے آل عثمان نے حکومت حاصل کی تھی۔ آج قوم نے بزور بازو اسے حاصل کیا ہے۔ اگر یہ کمیٹی اور نیشنل اسمبلی اس نقطہ نظر سے اس سوال کی حقیقت اور واقعیت پر غور کرے تو اُسے یہ بالکل معمولی اور آسان نظر آئیگا۔ لیکن اگر اسمبلی اور اس کمیٹی نے اس صحیح زاویہ سے اس تجویز پر غور کرنے سے انکار کر دیا تو حضرات میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہوگا تو وہی جو اس تجویز میں آپ کے آگے پیش کیا گیا ہے، البتہ اس کی تکمیل میں چند سر خاک اور خون میں لتھڑے ہوئے بیشک نظر آئیں گے"

غازی پاشا کی اس تقریر سے ایوان میں سناٹا چھا گیا۔ سب سے پہلے کمیٹی کے صدر نے اپنے حواس بجا کئے اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ایوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :۔

"حضرات! غازی پاشا نے اپنی تقریر میں اس مسئلہ کو ایک نئی روشنی میں پیش کیا ہے، جس کے بعد اس پر بحث بے سود معلوم ہوتی ہے۔"

اس طرح کمیٹی نے غازی پاشا کی تجویز جوں کی توں منظور کر لی۔

کمیٹی کی منظوری کے فوراً بعد یہ تجویز اسمبلی کے پورے اجلاس میں پیش ہوئی اور صدر نے اس پر رائے شماری کا اعلان کیا۔ بعض مخالف ممبروں نے مطالبہ کیا کہ رائے اپنے ناموں سے دی جانی چاہیے۔ لیکن غازی پاشا نے یہ کہہ کر اس اعتراض کو رد کر دیا کہ یہ محض بے ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے صدر اسمبلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:۔

"مجھے یقین ہے کہ ایوان نے بھی یہ تجویز جوں کی توں منظور کر لی ہے۔"

غازی پاشا کے اس کہنے کے ساتھ ہی صدر نے اعلان کیا کہ:۔

"تجویز متفقہ منظور ہوئی"

اس کے جواب میں ایک آواز اٹھی کہ "میں اس کے خلاف ہوں"۔ دوسری آواز آئی "خاموش رہو" اور اس کے ساتھ ہی ایوان برخواست ہو گیا۔

اس انداز سے ساڑھے چھ سو برس بعد ترکی میں آل عثمان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور خلافت برائے نام انھیں بخش دی گئی۔ نیشنل اسمبلی کے اس فیصلہ کی اطلاع جیسے ہی قسطنطنیہ پہونچی توفیق پاشا وزیر اعظم، مارشل عزت پاشا وزیر جنگ اور سب برائے نام وزراء نے استعفے دیدیئے۔ البتہ سلطان اپنے مُردہ تخت سے بدستور چپٹے رہے۔ لیکن کچھ دنوں بعد جب انگورا کی حکومت

نے ان پر قومی غدّاری کا الزام لگایا اور اس الزام میں ان پر مقدمہ چلانےکی تیاری کی تو انھیں تخت سے زیادہ اپنی جان پیاری معلوم ہوئی اور وہ انگریزی سپہ سالار ہیرنگٹن کی پناہ میں اپنے لڑکے اور حرم کے ساتھ انتہائی بےسرو سامانی کے عالم میں بحسرت و یاس ترکی سرزمین سے رخصت ہو گئے اور انگریزوں کے زیر سایہ مالٹا میں جا اُترے۔ اور نیشنل اسمبلی نے ان کے بجائے ان کے چچا زاد بھائی پرنس "عبد المجید" کو "خلیفہ" مقرر کر دیا۔ اور انگورا حکومت کی طرف سے کرنل رفعت پاشا نے قسطنطنیہ کے نظم و نسق پر قبضہ کر لیا۔

باب ۲۳

انگورا میں سیاسی کشمکش کا آغاز

خلافت اور سلطنت کو ایک دوسرے سے جُدا کر دینے میں تو غازی پاشا کو کامیابی ہو گئی لیکن اسی کے ساتھ انگورا میں غازی پاشا اور ان کے طرزِ حکومت کی مخالفت بھی بڑھ گئی۔ وہ پارٹی جو جمہوریت کی شدید مخالف تھی اور برطانیہ کی وضع کی "ڈیموکریٹک" حکومت ترکی میں دیکھنا چاہتی تھی، سلطان کی معزولی سے خوش نہیں تھی۔ اور موقع کی تلاش میں تھی کہ جیسے ہی موقع ہاتھ آئے فوراً خلیفہ کو آئینی سلطان بنا کر ملک میں ڈیموکریٹک طرز کی حکومت قائم کر دے۔ اس پارٹی میں خوش قسمتی یا بدقسمتی سے غازی پاشا کے سارے پچھلے دوست اور مددگار شریک ہو گئے تھے۔ رؤف بے اگرچہ اس وقت وزیرِ اعظم تھے لیکن اس جماعت کے خفیہ لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ کرنل رفعت پاشا، علی فواد پاشا، کاظم قرہ بکر پاشا اور نور الدین پاشا فاتح سمرنا یہ سب کے سب جمہوریت کے مخالف اور اسی خیال کے حامی تھے کہ خلیفہ کو آئینی سلطان بنا کر ملک میں ڈیموکریٹک حکومت قائم کرنی چاہیئے اور غازی پاشا کے ساتھ صرف فیضی اور عصمت تھے جو پوری وفاداری سے کام کر رہے تھے۔ اور کوئی ایسا شخص نہ تھا جس پر غازی پاشا اعتماد کر سکتے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ جس اسمبلی سے غازی پاشا نے سلطنت اور خلافت کو علیحدہ علیحدہ کرا دینے کی منظوری لی تھی اسی اسمبلی میں

کچھ دنوں بعد اس کے خلاف تجویز پاس ہو جاتی اور خلیفہ پھر سلطان بن بیٹھتے اس لئے کہ وہ تجویز اس قدر جلدی میں منظور ہوئی تھی کہ غازی پاشا کی سیاسی مخالفوں کو ملک میں کنویسنگ کرنیکا موقع ہی نہ ملا۔ اور اب جب کہ وہ پوری تیاری کے ساتھ منظم ہو کر نیشنل اسمبلی میں اس تجویز پر نظر ثانی کا مطالبہ کرینگے تو غازی پاشا اسمبلی میں جب تک اپنی ہم خیال اکثریت حاصل نہ کریں اس وقت تک اپنے سیاسی مخالفوں کا کامیابی سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس صورتحال کے مقابلہ کیلئے غازی پاشا نے ایک اور سیاسی چال چلی۔ اور وہ یہ کہ اپنی صدارت میں ایک "پیپلز پارٹی" کی بنیاد رکھی۔ اور مدافعتی کمیٹیوں کو جو یونانیوں سے مقابلہ کے دوران میں اناطولیہ کے قصبہ قصبہ اور گاؤں گاؤں میں پھیلی ہوئی تھیں "پیپلز پارٹی" کی شکل میں بدل دیا۔ اور جگہ جگہ خود دورہ کر کے لوگوں کو "پیپلز پارٹی"، اس کے مقاصد، اس کے فرائض اور ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔ اور اس طرح اسمبلی کیلئے انتخاب میں اپنے ہم خیالوں کی اکثریت کی ضمانت حاصل کر لی۔

۲۰۔ نومبر ۱۹۲۲ء کو پہلی لوزان کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ ترکی کی طرف سے جنرل عصمت پاشا نمائندہ بنا کر بھیجے گئے۔ رؤف بے وزیر اعظم تھے انھیں یہ بات ناگوار گذری۔ وہ چاہتے تھے کہ لوزان کانفرنس میں خود ترکی نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوں۔ لیکن غازی پاشا نے ان پر اپنے وفادار دوست اور مددگار عصمت پاشا کو ترجیح دی۔ رؤف بے کے دل میں اس واقعہ سے غازی پاشا کے خلاف ایک اور گرہ بن گئی۔

لوزان کانفرنس کی صدارت برطانیہ کے نمایندگی لارڈ کرزن کر رہے

تھے ۔ اپنی افتتاحی تقریر میں انھوں نے کہا کہ " اس کانفرنس میں سیورے کے معاہدہ کو گفتگو کی بنیاد قرار دی جائیگی "۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عصمت پاشا نے جو کسی قدر اونچا سُنا کرتے تھے اس اعلان کو شاید سنا ہی نہیں انھوں نے اپنی جوابی تقریر میں یہ کہا کہ اس کانفرنس میں جو گفتگو ہوگی وہ یا تو بالکل مساوی حیثیت سے ہوگی یا پھر یہ کانفرنس یوں ہی ختم کر دی جائیگی "۔ اس عجیب و غریب جوابی اعلان سے کانفرنس میں بڑی حیرانی پیدا ہو گئی ۔ لیکن اس اختلاف پر کانفرنس ختم نہیں کی گئی بلکہ ترکی نمائندہ کو اپنے مطالبات تفصیل سے پیش کرنیکی آزادی دیدی گئی ۔ عصمت پاشا نے بے کم و کاست اپنے مطالبات کانفرنس کے آگے پیش کر دیئے ۔ اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ ترکی نہ اس سے ایک اِنچ کم قبول کریگا نہ زیادہ ۔ لیکن اس کانفرنس میں صورت حال یہ تھی کہ فرانس اور اٹلی جو کچھ دنوں پہلے ترکی سے جدا جدا سمجھوتہ کر چکے تھے برطانیہ کے ساتھ دکھائی دے رہے تھے ۔ اور روس کا نمائندہ بھی ترکی سے دوستی کا دم بھرتے ہوئے انگلستان اور فرانس کے ساتھ ہو گیا تھا ۔ فرانس کو اپنی یورپین سرحد کی پڑی ہوئی تھی ۔ اور اس قضیہ میں وہ جرمنی کے مقابل برطانیہ کی امداد چاہتا تھا اور اٹلی اور روس کو برطانیہ نے اپنی چالوں سے گانٹھ لیا تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عصمت پاشا تین مہینے تک ان متحدین کا مقابلہ کرتے رہے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا ۔ آخر ایک دن لارڈ کرزن نے اپنے لندن واپس جانیکا اعلان کر دیا ۔ وہ سمجھتے تھے کہ ترکی نمائندہ پر اس اعلان کا کچھ اثر ہوگا ۔ اور جس دن وہ روانہ ہونے لگے انھوں نے عصمت پاشا کا اسٹیشن پر انتظار بھی کیا کہ شاید یہ اب بھی انھیں روکنے واپس آجائے اور انہی کی شرائط پر معاملہ کر جائے ۔ لیکن عصمت پاشا نے لارڈ کرزن کی خبر بھی نہ لی ۔ مجبوراً لارڈ کرزن کو ناکام و نامرام

لندن واپس ہونا پڑا۔ اس طرح پہلی لوزان کانفرنس تین مہینے کی گفت و شنید کے بعد فروری ۱۹۲۳ء میں بے نتیجہ ختم ہو گئی۔

عصمت پاشا بھی ناکام انگورا لوٹے۔ اسٹیشن پر غازی پاشا نے ان کا استقبال کیا لیکن رؤف بے وزیر اعظم ان کی پذیرائی کو وہاں موجود نہ تھے۔ غازی پاشا نے رؤف بے کی اس غیر مکلف حرکت کا جواب مانگا۔ رؤف بے نے جواب دیا کہ وہ سرکاری طور پر عصمت پاشا کی پذیرائی کیلئے تیار نہیں تھے اس لئے کہ عصمت پاشا نے لوزان میں کچھ اچھا کام نہیں کیا۔ اور یہ مسئلہ چونکہ اسمبلی میں عصمت پاشا کے خلاف پیش ہونیوالا تھا اس لئے غازی پاشا کو خود بھی انکے استقبال کیلئے اسٹیشن پر نہ جانا چاہیئے تھا۔ اس اختلاف نے اتنا طول کھینچا کہ رؤف بے نے وزارت عظمےٰ سے استعفےٰ دیدیا۔ اور اس کے بعد وہ کھلم کھلا عصمت پاشا کے مخالف اور غازی پاشا کے سیاسی حریف بن گئے۔ کامل نو دن تک رؤف بے کی قیادت میں انگورا اسمبلی کے اندر عصمت پاشا کی کارگذاری پر حملے ہوتے رہے۔ لیکن جب عصمت پاشا کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پیش ہوئی تو غازی پاشا کے اثر سے وہ تجویز منظور نہ ہو سکی اور عصمت پاشا اس سیاسی مخالفت سے بے داغ نکل آئے۔

لیکن اس کامیابی کے باوجود اسمبلی میں غازی پاشا کے خلاف مخالف پارٹی برابر زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اور ان ممبروں کا بھی ٹھیک نہ رہا تھا جو غازی پاشا کے ہم خیال ثابت ہوتے رہے تھے۔ یہ حالت دیکھکر غازی پاشا نے پیپلز پارٹی کی پوری سرگرمی سے تنظیم شروع کر دی تا کہ اسمبلی کے آئندہ

انتخاب میں اس سے کام لیا جا سکے۔ حریف پارٹی نے جو غازی پاشا کی یہ سرگرمیاں دیکھیں تو رؤف بے کی ماتحتی میں ان کے پاس ایک وفد بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس پارٹی کی صدارت سے مستعفی ہو جائیں اس لئے کہ وہ موجودہ ترکی حکومت کے صدر ہیں۔ اور صدر کے لئے ہر پارٹی سے غیر جانب دار رہنا ضروری ہے۔ غازی پاشا نے اس کا جواب وفد کو یہ دیا کہ "میں یہ تسلیم ہی نہیں کرتا کہ ملک میں ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیاں موجود ہیں۔ ترکی میں اس وقت صرف ایک سیاسی پارٹی ہے اور مجھے اس پر فخر ہے کہ میں اس کا صدر ہوں"۔ اس جواب سے حریف پارٹی اور زیادہ مشتعل ہو گئی اور اس نے علانیہ غازی پاشا اور ان کے طرز حکومت پر نکتہ چینیاں شروع کر دیں۔ اور اسمبلی میں ان کی ہر پیش کردہ تجویز کی مخالفت ہونے لگی۔ اس صورتِ حال کے مقابلہ کیلئے غازی پاشا نے ایک رات وزارت کی پارٹی کو اپنے ہاں طلب کیا اور دوسرے دن موجودہ اسمبلی کے برخواست کی تجویز ایوان میں پیش کر دی۔ جو اسی وقت منظور ہو گئی۔ ۲۔ اپریل ۱۹۲۳ء کو دوسری اسمبلی کا انتخاب مکمل ہو گیا۔ اور اس انتخاب میں غازی پاشا کی "پیپلز پارٹی" کو پوری کامیابی حاصل ہوئی اور حریف پارٹی کو انتخاب کے نتیجہ سے مایوس ہونا پڑا۔

حریف پارٹی کو دبانے کا جو طریقہ غازی پاشا نے اختیار کیا وہ بادی النظر میں ایک طرح کی سیاسی چالبازی کہا جا سکتا ہے۔ اور ان کے حریف بھی "پیپلز پارٹی" کے قیام کے باعث ان پر یہی الزام لگاتے ہیں لیکن اس بارے میں خود غازی پاشا اپنی صفائی اس طرح پیش کرتے ہیں۔ کہ اناطولیہ کے زراعت پیشہ ترک جو سیاست کی ابجد سے بھی ناواقف تھے

ان کیلئے سیاست کی دو مختلف الخیال پارٹیوں کا سمجھنا بہت مشکل تھا۔ اور جو حقیقی اصلاحات حکومت کی طرف سے ان کی اپنی فلاح اور بہبود کیلئے نافذ ہوتیں حریف پارٹی کے مخالفانہ پروپیگنڈے کے باعث ان کا اثر بھی کم ہو جاتا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اُس وقت تک ملک میں ایک ہی سیاسی پارٹی قائم رہے جب تک کہ عام ترک سیاست اور اس کے مختلف مدارج کو اچھی طرح نہ سمجھ جائیں۔ جب ان میں اس قدر سمجھ آجائیگی تو پھر وہ اپنی بھلائی اور برائی کو خود ہی اچھی طرح سمجھنے لگیں گے۔ اور اس وقت حریف پارٹیوں کا ملک میں پایا جانا قوم اور ملک کیلئے مضر ثابت نہ ہوگا۔ یہی دلیل تھی جس کی وجہ سے غازی پاشا نے ترکی میں حریف سیاسی پارٹیوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ دوسری دلیل غازی پاشا کی "پیپلز پارٹی" کو اسمبلی میں اکثریت میں رکھنے کی یہ تھی کہ غازی پاشا کے پاس ملک میں اصلاحات کے نفاذ کا ایک طویل اور انتہائی انقلابی پروگرام تھا۔ اور یہ ناممکن تھا کہ موجودہ اسمبلی کو برقرار رکھتے ہوئے غازی پاشا اپنے انقلابی پروگرام کو ملک میں نافذ کرسکتے۔

اصل میں غازی پاشا اور ان کے سیاسی حریفوں میں نقطۂ نظر کا اختلاف تھا۔ ان کے حریف جدید ترکی حکومت میں صرف لیپا پوتی چاہتے تھے اور اپنی پچھلی روایات سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن غازی پاشا حکومت کے ساتھ، ترکی تمدن، ترکی معاشرت، ترکی مذہب میں ایک انقلاب پیدا کر دینا چاہتے تھے۔ اور ترکی کو ہر قسم کی قدیم روایات سے آزاد کرکے بالکل نئی شکل اور نئے درجے میں دُنیا کے آگے پیش کرنا چاہتے تھے۔ جہاں تک اصول اور نقطۂ نظر کا تعلق ہے ہمارے نزدیک ایماندار دونوں تھے غازی پاشا بھی اور ان کے سیاسی حریف بھی لیکن یہ تصفیہ کرنا کہ راستی پر کون تھا غالباً ان کے

سوانح نگار کا فرض نہیں ہے بلکہ اس کا فیصلہ خود اُس قوم کو کرنا ہے جو غازی پاشا کے انقلابی پروگرام پر اب تک عمل کر رہی ہے۔

نئے انتخاب میں اسمبلی میں پیپلز پارٹی کو اکثریت ضرور حاصل ہوگئی لیکن غازی پاشا کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ ان کے حریفوں نے ان کے خلاف اور شدت سے پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اور سب سے زیادہ تکلیف دہ صورت یہ تھی کہ غازی پاشا کے یہ سیاسی حریف کوئی غیر نہیں تھے بلکہ زمانہ انقلاب میں انکے دوست اور استخلاص وطن کی کوششوں میں ان کے مددگار رہ چکے تھے۔ان میں کاظم قرہ بکر پاشا، نورالدین پاشا، رفعت پاشا، علی فواد پاشا، رحمی بے، ڈاکٹر عدنان، خالدہ ادیب اور رؤف بے قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ مرحوم اتحاد و ترقی کے کچھ پچھلے ممبر بھی میدان میں اتر آئے تھے اور غازی پاشا کی ذات کے خلاف انگورا اور قسطنطنیہ میں باقاعدہ سازش کا جال بچھانے میں مصروف ہوگئے تھے۔

باب ۲۴

دوسری لوزان کانفرنس

۱۹- اپریل ۱۹۲۳ء کو دوسری مرتبہ لوزان میں کانفرنس شروع ہوئی اور اس مرتبہ لارڈ کرزن کی بجائے برطانیہ کی طرف سے سر ہورس رمبولڈ شریک کانفرنس ہوئے جو قسطنطنیہ میں برطانوی ہائی کمشنر مقرر کئے گئے تھے، یہ اجلاس بھی تین مہینے تک ہوتا رہا۔ بالآخر ۲۴- جولائی ۱۹۲۳ء کو صلح کا اعلان کر دیا گیا۔ اس معاہدہ میں ترکی کو وہ سب کچھ مل گیا جس کا قوم پرست ترکوں نے اپنے قومی مطالبہ میں اعلان کیا تھا۔

ترکی کی سرحدیں وہی تسلیم کر لی گئیں جو انھوں نے جنگ میں فتح کی تھیں امتیازی قوانین جو سلطان کے وقت میں غیر ملکی باشندوں کیلئے نافذ تھے یکقلم اڑا دیئے گئے۔ عیسائی اقلیت کا ترکی حدود سے تبادلہ کر دیا گیا۔ دردانیال کے بارے میں یہ طے ہوا کہ اس کا تھوڑا سا علاقہ غیر جانب دار چھوڑ کر ترکی اس پر قابض رہے گا۔ البتہ اس کی قلعہ بندی کی مخالفت کر دی گئی۔ اور تجارتی جہازوں کو بے روک ٹوک گذرنے کی اجازت دیدی گئی۔ رہا موصل کا قضیہ اس کے متعلق یہ طے پایا کہ ترکی اور برطانیہ براہ راست اس کو نمٹ لیں۔

لوزان میں ترکی کی اس سو فیصدی کامیابی سے غازی پاشا کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ اور حریف پارٹیوں پر اوس سی پڑ گئی۔ اس موقع

سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غازی پاشا نے ترکی جمہوریت کے اعلان کا تہیّہ کر لیا اور چپکے چپکے اس کی تیاریاں کرنے لگے۔
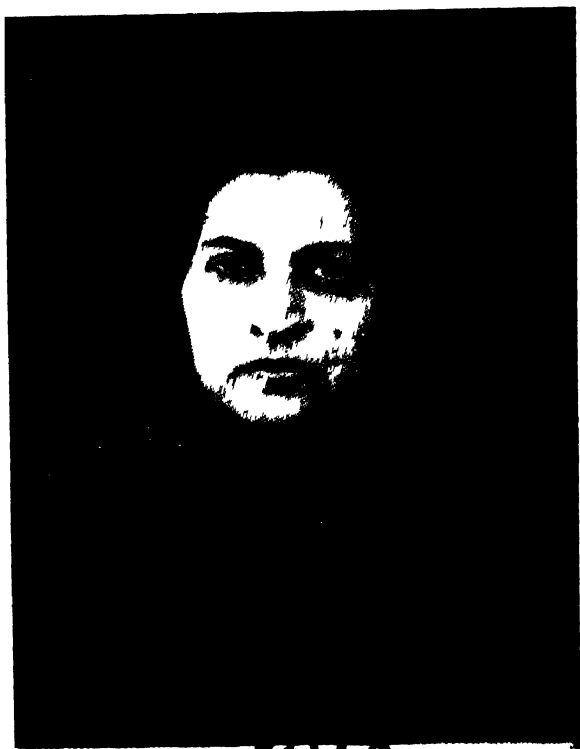
خالدہ آدیب خانم

کمال آتا ترک صدر جمہوریہ ترکیہ

عصمت اینونو وزیر اعظم جمہوریہ ترکیہ

باب ۲۵

ترکی جمہوریت کا اعلان

رؤف بے کے وزارت عظمیٰ سے ہٹنے کے بعد فتحی بے وزیر اعظم بنا دیئے گئے تھے۔ ان کی وزارت اگرچہ پوری پوری اصلاح پسند تو نہیں تھی لیکن پھر بھی رؤف بے کی وزارت سے غنیمت تھی۔ لیکن اس کے باوجود اسمبلی برابر فتحی بے اور ان کے ماتحت وزیروں کے کام میں مداخلت کرتی رہتی تھی۔ یہ بات فتحی بے اور ان کی ساری وزارت کو ناپسند تھی لیکن مجبوری یہ تھی کہ اس وقت کے دستور ہی نے اسمبلی کو یہ غیر معمولی اختیارات دے رکھے تھے۔ اور سارے وزیروں کا تقرر اسمبلی ہی کی منظوری سے ہوا کرتا تھا۔ غازی پاشا نے اس موقع پر اسمبلی کے اسی قانون کو عذر بنا کر ایک چھوٹی سی سیاسی چال چلی اور ملک میں جمہوریت کا اعلان کر دیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک دن، غازی پاشا نے فتحی بے اور ان کی ساری وزارت کو کھانے پر مدعو کیا۔ اور ان سے اسمبلی کے ان غیر محدود اختیارات پر گفتگو کی۔ یہ لوگ پہلے ہی اسمبلی کی مسلسل مداخلت سے تنگ آچکے تھے۔ سب نے اسمبلی کے اس قانون سے بیزاری ظاہر کی اور غازی پاشا سے اس بارے میں مدد چاہی۔ غازی پاشا نے فتحی بے کو یہ رائے دی کہ وہ کل ہی اپنی وزارت سمیت مستعفی ہو جائیں۔ اور میں اسمبلی سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ نئی وزارت مرتب کرے۔ اسمبلی نے چونکہ ایک قانون یہ بھی بنا رکھا ہے کہ

نئی وزارت میں کوئی پچھلی حکومت کا وزیر دوبارہ منتخب نہیں ہوسکتا اس لئے
اسمبلی کو نئے وزیر تلاش کرنے ہوں گے اور یہ وہ نہیں کرسکے گی۔ اور جب وہ
مجبور ہوجائیگی تو ہم ملک کا سارا دستور ہی بدل دیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن
غازی پاشا کی ہدایت کے مطابق فتحی بے اور ان کے ماتحت سارے وزیروں
نے اسمبلی کے غیر محدود اختیارات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ دیدیا۔
اور غازی پاشا نے اسمبلی سے درخواست کی کہ وہ نئی وزارت منتخب کرے۔ اس
نئی افتاد کے مقابلہ کیلئے اسمبلی تیار نہیں تھی۔ اس لئے اسے بڑی پریشانی کا
سامنا کرنا پڑا۔ یہ پریشانی اس وجہ سے اور بڑھ گئی کہ غازی پاشا کے سیاسی
حریفوں میں رؤف بے، کاظم قرہ بکر پاشا، علی فواد پاشا، رفعت پاشا اور
نورالدین پاشا اس وقت انگورہ میں موجود نہیں تھے جو اس مشکل کا مقابلہ
کرتے۔ اور مزید اضافہ اس پریشانی میں خود غازی پاشا نے یہ کردیا کہ اسمبلی کے
پیپلز پارٹی کے ممبروں اور آزاد ممبروں کو وزارت قبول کرنے سے منع کردیا۔
نتیجہ یہ ہوا کہ اسمبلی کو مخالف پارٹی سے وزیر چننے پڑے جسے ایوان منظور نہیں
کرسکتا تھا۔ دو دن تک یہی صورت حال رہی کہ ہر گھنٹے ایک نئی وزارت بنتی اور
دوسرے گھنٹے وہ ٹوٹ جاتی۔ دو دن بعد غازی پاشا نے فتحی بے، عصمت پاشا،
فیضی پاشا اور چند اور اسمبلی کے ہم خیال ممبروں کو اپنے ہاں دوبارہ مدعو کیا اور
انھیں مطلع کیا کہ کل وہ اسمبلی میں جمہوریت کا اعلان کردیں گے۔ غازی پاشا کے
اس غیر متوقع اعلان سے ان لوگوں کو حیرت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو لیکن کسی نے
اس کا اظہار نہیں کیا۔ اور سب نے جمہوریت کے حمایت کی حامی بھرلی۔ دوسرے
دن فتحی بے نے غازی پاشا کی حسب ہدایت ایک اور وزارت کا خاکہ پیش کیا۔
لیکن اسمبلی اسے منظور نہیں کرسکتی تھی تاہم اس پر بحث ہوتی رہی۔ جب بحث

مباحثہ میں کافی جوش و خروش پیدا ہو گیا تو نور الدین نے جو غازی پاشا کے دوسرے ہم خیال ممبر تھے ایوان کے آگے یہ تجویز پیش کی کہ اس موقع پر غازی پاشا سے درخواست کرنی چاہیے کہ وہ نئی وزارت کی ترتیب میں اسمبلی کی مدد کریں۔ اسمبلی نے اس تجویز کو فوراً منظور کر لیا اور فوراً غازی پاشا کی خدمت میں قاصد بھیجا کہ آپ اس موقع پر اسمبلی کی مشکل آسان کریں۔ قاصد کے پہونچنے کے بعد غازی پاشا اسمبلی میں پہونچے۔ پہلے پیپلز پارٹی کا اجلاس ہوا جس کی صدارت فتحی بے نے کی۔ اور غازی پاشا سے درخواست کی گئی کہ وہ اس موقع پر ممبروں کی رہنمائی کریں۔ غازی پاشا نے نہایت مختصر سی تقریر میں کہا:۔

"یہ خرابی اصل میں ہمارے موجودہ دستور کی ہے کہ اسمبلی کا ہر ممبر وزیروں کے انتخاب میں رائے رکھتا ہے۔ آپ لوگ خود اس کا اندازہ کر سکتے ہیں جب ہر شخص اس طرح دخیل ہوتا رہیگا تو وزارت کی ترتیب کس قدر مشکل ہو جائیگی۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنے اس دستور ہی میں تبدیلی کر دیں۔"

یہ کہہ کر غازی پاشا نے اپنی جیب سے ایک مسودہ نکالا اور اجلاس میں پیش کر دیا۔ پارٹی کو یہ خیال تھا کہ غازی پاشا نے موجودہ مشکل سے نکلنے کی اس مسودہ میں کوئی تدبیر بتائی ہوگی۔ لیکن یہ جمہوریت کا مسودہ قانون تھا جس میں ملک کیلئے چار برس کیلئے ایک صدر تجویز کیا گیا تھا جو دوبارہ بھی منتخب ہو سکتا تھا۔

وزیراعظم کا تقرر پریسیڈنٹ کے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اور وزیراعظم کو وزارت کی ترتیب کا اختیار دیدیا تھا۔ اس مسودۂ قانون سے پارٹی چونک پڑی لیکن اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اسے منظور کرلے۔ چنانچہ معمولی بحث وتمحیص کے بعد پارٹی نے یہ مسودہ قانون منظور کرلیا۔ شام کو پھر اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا۔ اسمبلی نے اس مسودہ کو غور وبحث کیلئے ایک کمیشن کے سپرد کیا، کمیشن نے اس میں صرف اس قدر ترمیم کی کہ ترکی جمہوریہ کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا۔ کمیشن کی منظوری کے فوراً بعد یہ مسودہ پھر اسمبلی میں پیش ہوا۔ اور بکے بعد دیگرے تینوں پیشیوں میں یہ بالاتفاق منظور ہوگیا۔ اور اس کی منظوری کے پندرہ منٹ بعد غازی پاشا نئی جمہوریہ ترکیہ کے پہلے صدر منتخب ہوگئے۔ انگورا کے سرکاری توپ خانہ نے ایک سو ایک ضرب توپ سے حکومت کی اس تبدیلی کا اعلان کردیا اور سارے ملک میں تار برقی کے ذریعہ آن کی آن میں یہ خبر پہونچ گئی کہ ترکی نے اپنی سیاسی روایات سے آخری رشتہ بھی منقطع کرلیا۔ یہ واقعہ ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء کا ہے۔

باب ۲۶

ترکی سے آلِ عثمان کا اخراج

جمہوریت کے اعلان کے ساتھ ہی خلافت کا سوال دوبارہ پیدا ہو گیا۔ عام مسلمان حکومت کو جُدا کر کے نری خلافت کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس لئے کہ صدیوں سے سلطنت اور خلافت ایک ہی ہستی میں جمع ہوتی چلی آئی تھی اور اسلامی تاریخ میں ایسی کوئی نظیر بھی نہیں تھی کہ ایک ہی ملک میں سلطان اور خلیفہ کا علیحدہ علیحدہ وجود پایا گیا ہو۔ اس کے علاوہ ترکی سلاطین کے ساتھ قرنوں سے خلافت کا منصب وابستہ چلا آتا تھا۔ اور مذہبی ترک اس کو برداشت نہ کر سکتا تھا کہ یہ صدیوں کی پرانی مذہبی روایت بہ یک جنبش قلم محو کر دی جائے۔ چنانچہ انگورا میں جمہوریت کے اعلان کے ساتھ ہی قسطنطنیہ میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ اور نئے سرے سے خلیفہ کی حمایت میں پریس اور پلیٹ فارم آراستہ ہونے لگا۔ غازی پاشا کے سیاسی حریفوں نے اس پراگندگی اور عام ناراضی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور رؤف بے، ڈاکٹر عدنان بے، رفعت پاشا، کاظم قرہ بکر پاشا اور علی فواد پاشا پہلی فرصت میں قسطنطنیہ پہونچے اور خلیفہ کی حمایت میں انھوں نے پوری شدت کے ساتھ کھلم کھلا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ مقصد اس حمایت کا یہ تھا کہ انگورا کی جمہوری حکومت کو ختم کر دیں اور خلیفہ کو آئینی سلطان بنا کر خود ان کو وزیر بنائیں

لیکن سارے تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں کہ خود خلیفہ عبدالمجید نہایت مہذب، سمجھ دار اور مرنج و مرنجان انسان تھے۔ انھوں نے خود کبھی حکومت کی ہوس نہیں کی اور نہ یہ چاہا کہ ترکی کے آئینی سلطان بنا دیئے جائیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ان سازشیوں کے لپیٹے میں آگئے۔ اور اپنی مرضی کے خلاف حریفوں کی سیاسی کش مکش میں پھنس گئے۔

دسمبر ۱۹۲۳ء میں خلیفہ عبدالمجید نے غازی پاشا کے سکریٹری کو خط لکھا جس میں یہ درخواست تھی کہ خلیفہ کو جو الاؤنس دیا جاتا ہے وہ ناکافی ہے اس میں اضافہ کیا جائے اور ساتھ ہی یہ شکایت تھی کہ ترکی حکومت نے خلیفہ کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے اس کا تدارک کیا جائے۔ پہلی جنوری ۱۹۲۴ء کو غازی پاشا نے اس کا جواب دیا:-

"خلیفہ کا یہ مطالبہ کہ ترکی حکومت ان سے حلیفانہ تعلقات رکھے آزاد ترکی جمہوریہ کے اصول کے خلاف ہے۔ منصب خلافت کو نہ سیاسی اہمیت حاصل ہے اور نہ معاشرتی۔ یہ صرف ایک تاریخی منصب ہے۔ اس اعتبار سے اس کیلئے جو الاؤنس حکومت نے مقرر کیا ہے اور جو ترکی کے صدر جمہوریہ کی الاؤنس سے بھی زیادہ ہے بالکل کافی ہونا چاہیئے۔ منصب خلافت کے ساتھ ظاہری نمائش اور طمطراق محض بے معنی چیزیں ہیں ان کو علیحدہ کر دیا جائے۔ کیونکہ اس وقت تک چیف سکریٹریوں اور محل کے وزیروں کو باقی رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی موجودگی سے خلیفہ کی دُنیاوی رفعت کی

پرانے تخیل کو زندہ رکھا گیا ہے۔"

غازی پاشا کے اس جواب سے خلیفہ کے حمایتوں میں اشتعال سا پیدا ہو گیا نہ صرف ترکی میں بلکہ سارے عالم اسلام میں خلیفہ کی حمایت میں جلسے ہوئے۔ اور انگورا کی حکومت سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ خلیفہ عبدالمجید سے ان کی شایانِ شان سلوک کیا جائے۔ اسی اثناء میں ہزہائی نس سر آغا خاں اور جسٹس امیر علی مرحوم نے ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے انگورا گورنمنٹ کو ایک خط لکھا جس میں غازی پاشا سے یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کے مذھبی پیشوا کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھا جائے۔ اور خلافت کو دوبارہ ترکی میں قائم کیا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ خط انگورا پہونچنے سے پہلے قسطنطنیہ کے ایک اخبار میں چھپ گیا اور غازی پاشا کے سیاسی حریفوں نے اس کو خوب خوب اچھالنا شروع کر دیا۔ یہ ایسی سیاسی غلطی تھی جس کا خمیازہ بعد کو سلطان عبدالمجید اور سارے آل عثمان کو بھگتنا پڑا۔ اس لئے کہ قسطنطنیہ کے اخباروں میں یہ چھپا ہوا خط جب انگورا پہنچا اور ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ سر آغا خاں اور امیر علی مرحوم مدت سے انگلستان میں رہتے ہیں اور ایک عرصہ سے برطانوی حکومت کے ایجنٹ ہیں تو ساری اناطولیہ میں ان برطانوی ایجنٹوں کی مداخلت سے ایک آگ سی لگ گئی۔ اور یہ سمجھا جانے لگا کہ خلیفہ عبدالمجید خود انگریزوں سے مل کر ان کے مسلمان ایجنٹوں سے اپنا پروپیگنڈا کرا رہے ہیں اور اس طرح ایک دفعہ پھر ترکی پر غیر ملکی اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس پروپیگنڈے کو خود غازی پاشا نے بھی ہوا دی، نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کو بے دست و پا کر دینے کے سلسلے میں غازی پاشا کے خلاف جو ہوا چل رہی تھی اس کا رخ ناکردہ گناہ عبدالمجید کی طرف پھر گیا اور ان سے اور ان کے سازشی ساتھیوں سے سارے ترکی میں علانیہ بیزاری کا اظہار کیا جانے لگا۔

غازی پاشا نے اس فضا سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ قسطنطنیہ کے جس اخبار نے آغا خاں کا خط چھاپا تھا اس کے ایڈیٹر لطفی فکری بے کے خلاف بغاوت میں مقدمہ چلا کر اُسے جیل بھیج دیا۔ اور اعلان جمہوریت کے بعد پہلی مرتبہ یکم مارچ ۱۹۲۴ء کو جب اسمبلی کا افتتاح ہوا تو اپنی افتتاحی تقریر ہی میں غازی پاشا نے سلطنت اور خلافت کے تعلق پر نہایت تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے یہ کہا:۔

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اسی خلافت کے لئے اب تک ترک برابر ہر جگہ جنگ کرتے رہے اور اپنی ہستی مٹاتے رہے ہیں؟ لیکن اب سے ترک جو کچھ جد وجہد کریں گے صرف اپنی قومی بقا اور سلامتی کیلئے کریں گے۔ ترکی میں خود اتنے کام ہمیں کرنے ہیں کہ ان کی موجودگی میں کسی اور طرف توجہ دینے کا ہمیں مطلق ہوش نہیں ہے اور نہ ہم اس قابل ہیں کہ دوسری قوموں کی مدد کر سکیں۔"

اسمبلی کی یہ افتتاحی تقریر دراصل تمہید تھی اس مسودۂ قانون کی جو دو دن بعد ۳۔ مارچ ۱۹۲۴ء کو غازی پاشا نے ترکی سے آل عثمان کے اخراج کے متعلق پیش کیا۔ پچھلے باب میں ہم کہہ چکے ہیں کہ جہاں تک خلیفہ عبد المجید کی ذات کا تعلق تھا وہ نہایت نیک، نہایت مہذب اور بالکل غیر طامع شخص تھے۔ انھوں نے اپنی طرف سے کبھی آئینی سلطان بننے کی کوشش نہیں کی نہ حکومت کے احکام میں مداخلت کی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی ذات سے چونکہ سازشیوں کو تقویت پہونچ رہی تھی، اور جمہوریہ ترکیہ کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا تھا اس لئے انھیں اپنی ذات کی قربانی دینی پڑی۔ اور نہ صرف انھیں بلکہ سارے

آلِ عثمان کو جلا وطن ہونا پڑا۔ تاکہ آئندہ اس پارٹی کو ترکی میں کوئی سہارا ہی نہ مل سکے جو آئینی سلطان بنا کر ترکی میں پھر اسی پر انے طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتی تھی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ۳۔ مارچ کو جب غازی پاشا نے اسمبلی میں یہ بل پیش کیا تو ایوان نے ذرا بھی مخالفت نہیں کی اور ایک ہی اجلاس میں بالاتفاق اسے منظور کر لیا۔ اس بل کے منظور ہوتے ہی قسطنطنیہ کے گورنر کو تار پر حکم دیا گیا کہ دوسری صبح ہونے سے پہلے خلیفہ عبد المجید ترکی سرحد سے باہر کر دیئے جائیں۔ اسی رات کو گورنر قسطنطنیہ خلیفہ عبد المجید کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے خلیفہ کو انگورا گورنمنٹ کا حکم سُنایا۔ موٹر تیار باہر کھڑی تھی۔ اسی وقت انھیں اس میں سوار کرا کے سوئٹزرلینڈ کی سرحد کی طرف روانہ کر دیا۔ ان کے دو دن بعد آلِ عثمان کے شہزادے اور شہزادیاں بھی سوئٹزرلینڈ روانہ ہوگئیں مزید تعجب یہ ہے کہ آلِ عثمان کا اخراج اس قدر خاموشی سے عمل میں آیا۔ کہ قسطنطنیہ میں ان کے حمایتیوں کی موجودگی کے باوجود ذرا مظاہرہ نہیں ہوا اور نہ کسی طرف سے احتجاج ہوا۔

باب ۲۷

انگورا میں حریف پارٹی کا زور اور کُردوں کی بغاوت

ترکی سے آلِ عثمان کے اخراج کے بعد مذہبی ترکوں اور خود انگورا اسمبلی نے غازی پاشا سے یہ درخواست کی کہ وہ خود خلیفہ بن جائیں ۔ اور ممالکِ اسلام سے بھی اس موقع پر غازی پاشا کی خدمت میں وفد پر وفد آنے شروع ہوئے ۔ کہ وہ اس مذہبی اور تاریخی منصب کا خاتمہ نہ کریں بلکہ خود خلافت کو قبول کر کے اس صدیوں کی مذہبی روایت کو برقرار رکھیں ۔ لیکن ان سب کو غازی پاشا کا ایک ہی جواب تھا :۔

" خلیفہ ، مذہبی پیشوا اور سیاسی حیثیت سے مختار مطلق سمجھا جاتا ہے ۔ کیا میں ان قوموں کی قیادت کر سکتا ہوں جن کے خود اپنے بادشاہ موجود ہیں ؟ اس کے علاوہ خلیفہ کے ہر حکم کی بلا حیل و حجت تعمیل ہونی ضروری ہے ۔ کیا وہ لوگ جو مجھے خلیفہ بنانا چاہتے ہیں سارے عالم اسلام سے میرا حکم منوانے کی بھی طاقت رکھتے ہیں ۔ پھر یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہو گی کہ میں اس خیالی منصب کو اختیار کر لوں جس کا نہ کوئی فائدہ ہے نہ مفہوم اور نہ جس کے دُنیا میں باقی رہنے کا کوئی سبب ہے نہ ضرورت ! "

اس موقع پر غازی پاشا کے مخالف سے مخالف تذکرہ نویس بھی اس پر متفق ہیں کہ خلافت کا منصب قبول کرنے سے انکار کر دینا ان کا انتہائی دانشمندانہ فعل تھا حالانکہ یہ ان کے لئے بہت آسان تھا کہ اپنے خلیفہ اور سلطان ہونیکا اعلان کر دیتے۔ خود مسلمان بھی اس کو جمہوریہ ترکیہ سے زیادہ آسانی سے تسلیم کر لیتے۔ اور قدیم روایات کے مطابق غازی پاشا کے اس اعلان میں مضائقہ نہ سمجھتے۔ اس لئے کہ خاندان عثمان کا بانی بھی پہلے محض ایک معمولی سردار تھا۔ اس نے عثمانی سلطنت کی بنیاد غازی پاشا کی طرح اپنے دست بازو کی قوت سے رکھی تھی اس خاندان کا زمانہ ختم ہوا ان کی جگہ آسانی سے آل کمال لے سکتے تھے لیکن غازی پاشا نپولین بوناپارٹ نہیں تھے۔ وہ اپنے لئے یا اپنے خاندان کے لئے کوئی عارضی اعزاز نہیں چاہتے تھے بلکہ سارے ترکوں کو اپنے خیال کے مطابق من الحیث القوم معزز و ممتاز بنا دینا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ اپنی ذات کیلئے حکومت اور اسلام کے اس سب سے بڑے اعزاز کو قبول کرنے سے انکار کر دینے ہی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترکیہ جمہوریہ میں اپنے اقتدار کی کش مکش غازی پاشا کی اپنی ذات کیلئے نہیں تھی اگر ایسا ہوتا تو ہوس اقتدار کی تکمیل کا یہ موقع وہ ہرگز ہاتھ سے نہ دیتے۔ بلکہ اس ساری سیاسی اقتدار کی کش مکش کا مفہوم یہ سمجھ میں آتا ہے کہ غازی پاشا ترکی کو صرف اپنے ہی بنائے ہوئے نقشہ پر دوبارہ تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اور اس میں وہ کسی سیاسی پارٹی یا مدبر کی مداخلت برداشت نہ کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صدر جمہوریہ بھی تھے، وزراء کی کونسل کی بھی صدارت کرتے تھے، پیپلز پارٹی کے بھی صدر تھے اور ترکی افواج کے کمانڈر انچیف بھی تھے۔ غرض حکومت کے ہر شعبہ میں ان کے اختیارات نہایت وسیع اور قطعی غیر محدود تھے۔ سوائے اسمبلی کے جسے برخواست کرنیکا انہیں

کوئی اختیار نہیں تھا۔ اور نہ اسمبلی کے کسی قانون کو وہ اپنے اختیار سے رد کر سکتے تھے۔ اسی کمزوری کو دور کرنے کیلئے غازی پاشا نے "پیپلز پارٹی" بنائی تھی تاکہ اسمبلی میں بھی ان کی اکثریت قائم رہے۔ اور کوئی قانون ان کی خلاف مرضی پاس نہ ہونے پائے۔

اگرچہ آل عثمان کے اخراج کے موقع پر ملک میں کہیں برائے نام بھی احتجاجی مظاہرہ نہیں ہوا تھا اور نہ خلیفہ کی حمایتی پارٹیوں نے غازی پاشا کے حکم سے سرتابی کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود قسطنطنیہ اور انگورا میں غازی پاشا کے سیاسی حریفوں کی سرگرمیاں بدستور جاری تھیں اور یہ سیاسی اختلاف زیادہ شدید صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس اختلاف کو دبانے کے لئے غازی پاشا نے اسمبلی میں ایک اور مسودہ قانون پیش کیا۔ جس میں فوجی افسروں کو سیاسی خدمتیں اور سیاسی مدبّروں کو فوجی خدمتیں قبول کرنے سے قانونًا روکا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسمبلی کے اکثر فوجی ممبروں کو جن میں کاظم قرہ بکر پاشا اور علی فواد پاشا بھی شامل تھے اسمبلی کی ممبری کی خاطر اپنی اپنی فوجی کمانوں سے استعفے دینے پڑے۔ اس قانون کا جواب حریف پارٹی نے یہ دیا کہ "پارٹی آف ریپبلکن پروگریس"، کے نام سے ایک جدید پارٹی کی بنیاد ڈال دی۔ اس پارٹی کے لیڈر کاظم قرہ بکر پاشا، رؤف بے، علی فواد، رفعت پاشا اور ڈاکٹر عدنان بے تھے۔ مقصد اس پارٹی کا یہ بتایا گیا کہ یہ ترکی پارلیمنٹ میں اعتدال پیدا کریگی۔ اور ملک میں ڈکٹیٹری کو قائم نہ ہونے دیگی۔ قسطنطنیہ کے اخباروں نے پوری سرگرمی سے اس جدید پارٹی کی حمایت کی اور انجمن اتحاد و ترقی کے ممبر بھی جو جنگ عظیم کے بعد گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے اُبھر

آئے اور اس پارٹی کے ساتھ ہو گئے۔ ملک کے اعتدال پسند بھی اس پارٹی کی طرف جھک گئے اور مولویوں اور درویشوں نے بھی اس پارٹی سے اتحاد کر لیا کیونکہ انھیں یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ جمہوریت میں مذہب اسلام کی اچھی طرح حفاظت نہ ہو سکے گی۔ اور غازی پاشا کو اگر اپنے خیالات کی تکمیل میں آزاد چھوڑ دیا گیا تو خود ان لوگوں کا وجود ترکی میں باقی نہ رہے گا۔ اور تو اور غازی پاشا کی بیوی لطیفہ خانم بھی اس پارٹی کی طرف جھکتی جا رہی تھیں۔ یہ بات غازی پاشا کیلئے ناقابلِ برداشت تھی۔ لطیفہ خانم ہمیشہ سے ضدی، خودسر اور آزاد خیال خاتون تھیں ابتداءً انھوں نے ترکی میں صرف آزادیٔ نسواں کی تحریک میں حصّہ لیا تھا۔ اور اس تحریک کو وہ زیادہ تر اپنی ہی مرضی پر چلاتی رہیں۔ غازی پاشا کو اس پر اعتراض نہ تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ لطیفہ خانم کا رجحان عام سیاست کی طرف ہوتا گیا اور اس کے ساتھ ہی غازی پاشا سے ان کی چشمک رہنے لگی۔ دن بھر اپنے سیاسی حریفوں سے مقابلہ کرنے کے بعد تھکے ماندے جب غازی پاشا گھر پہنچتے تو بجائے اس کے کہ وہاں انھیں آرام اور سکون ملتا لطیفہ خانم سے انھیں مسائل پر جنھیں وہ باہر طے کر کے آتے تھے بحث کرنی پڑتی۔ غازی پاشا کیلئے یہ بات بہت تکلیف دہ تھی۔ لیکن جب سیاست میں لطیفہ خانم کی مداخلت بڑھتی ہی چلی گئی اور گھر بھی غازی پاشا کے لئے ایک چھوٹا سا اسمبلی کا ایوان بن گیا تو بالآخر انھوں نے ایک دن انتہائی انقباض کے عالم میں لطیفہ خانم کو طلاق دیدی اگرچہ ایک سال پہلے سمرنا میں غازی پاشا کی والدہ زبیدہ خانم کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور والدہ کے بعد ان کی غم گسار صرف لطیفہ خانم رہ گئی تھیں لیکن غازی پاشا نے اپنی تنہائی کی بھی کچھ پروا نہیں کی اور طلاق کے فوراً بعد لطیفہ خانم کو سمرنا بھیجدیا اور اس کی مختصر سی اطلاع نیشنل اسمبلی اور اخبارات کو کر دی۔

حریف پارٹی کا ذکر تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کی طاقت اس درجہ بڑھ گئی کہ نومبر ۱۹۲۴ء میں جب ترکی پارلیمنٹ کا افتتاح ہوا تو اس نئی پارٹی نے عصمت پاشا وزیر اعظم پر ان کی معاشی پالیسی کو ہدف ملامت بنا کر عدم اعتماد کی تحریک پیش کردی۔ یہ تحریک تو خیر جوں توں رد ہو گئی۔ کچھ غازی پاشا کے اثر سے اور کچھ اس وجہ سے کہ ترکی اور برطانیہ کے تعلقات ابھی تک صاف نہیں ہوئے تھے اور موصل کا قضیہ کسی قدر خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا لیکن اس عدم اعتماد کی تحریک رد ہو جانے کے باوجود حریف پارٹی کی بڑھتی ہوئی مخالفت کو دیکھکر عصمت پاشا کو وزارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ اور انکی جگہ فتحی بے دوبارہ وزیر اعظم بنا دیئے گئے۔ وزارت کیلئے فتحی بے کا دوبارہ انتخاب اور عصمت پاشا کا استعفےٰ حریف پارٹی کی کامیابی کا شاندار ثبوت تھا جس کے بعد اُسے اور زیادہ تقویت حاصل ہوتی گئی۔ اور خود پیپلز پارٹی میں انتشار اور پراگندگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ غازی پاشا نے کاظم پاشا کو اسمبلی کا پریسیڈنٹ نامزد کیا۔ لیکن اسمبلی میں خود پیپلز پارٹی کے اکثر ممبروں نے ان کے خلاف ووٹ دیئے جس کی وجہ سے وہ پریسیڈنٹ نہ ہو سکے۔ ایوان میں ممبر مسلح ہو کر جایا کرتے تھے۔ اور ذرا سے ذرا اختلاف پر جیبوں سے ریوالور نکال لیتے تھے۔ چنانچہ ایک ایسے ہی موقع پر جبکہ کرنل خالد بے انور پاشا کے ایک عزیز عصمت پاشا کے خلاف اسمبلی میں ایک پُرجوش تقریر کر رہے تھے ایک ممبر نے وہیں انھیں ریوالور مار کر ہلاک کر دیا۔ ایک اور موقع پر اسمبلی کے ایک اور ممبر علی شکری نے غازی پاشا کے خلاف نہایت سخت تقریر کی غازی پاشا کے باڈی گارڈ کے افسر عثمان آغا نے دوسرے دن انھیں ہلاک کر دیا۔ اس واقعہ سے انگورا میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ حکومت نے عثمان آغا

کی گرفتاری کا حکم دیدیا۔ لیکن عثمان آغا چاپان کیا میں نظربند ہو گیا اور وہیں کسی سپاہی کی گولی سے ہلاک ہو گیا۔ عثمان آغا کی اس حرکت کا حریف پارٹی غازی پاشا کو ملزم ٹھیراتی ہے لیکن حقیقتاً اس کا کوئی ثبوت نہ مل سکا کہ عثمان کو غازی پاشا نے ایسا کرنیکا حکم دیا تھا۔ علاوہ اس کے اس طرح کی انتہا پسندی کا غازی پاشا کے خلاف اس سے پہلے بھی کوئی ثبوت نہیں تھا اور اس وقت بھی اگرچہ ان کی حریف پارٹی کو عارضی طور پر سیاسی قوت حاصل ہو گئی تھی لیکن چونکہ انقلاب کے بعد ہی سے انگورا میں بالکل اسی طرح قوت و اقتدار کا مدوجزر ہوتا رہا تھا اور ہر موقع پر غازی پاشا سیاست کا جواب سیاست ہی سے دیتے رہے تھے اور انھوں نے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اس میدان میں اپنے حریفوں سے بہت اونچے ہیں، تو اس موقع پر انھیں اس کی ہرگز ضرورت نہیں تھی کہ ایک معمولی سے اسمبلی کے ممبر کو محض ذرا سی مخالفت کے باعث اس طرح ٹھکانے لگا دیتے۔ بلکہ اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حریف پارٹی نے اس وقت حکومت اور غازی پاشا کیخلاف جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی اس نے غازی پاشا کے حمایتیوں اور دوستوں کو بے انتہا مشتعل کر دیا تھا۔ اور ان میں سے بعضوں پر اس کا یہ اثر پڑا تھا کہ سیاسی رواداری کا خیال تک ان کے دماغوں سے محو ہو گیا تھا اور وہ بالکل بے قابو ہو گئے تھے۔ یہ بیشک افسوس ناک حقیقت تھی۔ لیکن اس کا الزام غازی پاشا پر رکھنا صریح بے انصافی ہے۔

فتحی بے کے وزیر اعظم ہوتے ہی حریف پارٹی نے براہ راست غازی پاشا کے اختیارات پر حملہ کر دیا۔ اور اسمبلی میں ان کے اختیارات کو محدود

کرنے کے لئے ایک مسودہ قانون بھی پیش کر دیا۔ لیکن یہ بل پاس نہ ہوسکا انگورا میں یہ سیاسی کش مکش جاری ہی تھی کہ سرحدی "کردوں" نے حکومت جمہوریہ ترکیہ کے خلاف بغاوت کردی اور کردوں کے لیڈر شیخ سعد نے یہ اعلان کیا کہ ترکی جمہوریہ نے چونکہ شریعت کے حکم کے خلاف خلیفہ کو ترکی سے نکال دیا ہے اس لئے کرد ترکوں کی اس لا مذہب حکومت سے جہاد کریں گے اور قسطنطنیہ میں عبدالحمید کے لڑکے سلیم آفندی کو دوبارہ خلیفہ بنائیں گے۔ کردستان کی اس بغاوت کے ساتھ ایک احتمال یہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں اس میں انگریزوں کا ہاتھ نہ ہو۔ اس لئے کہ کردیا تو ترکی علاقہ میں تھے یا موصل کے علاقہ میں اور موصل کے قبضہ کے بارے میں ترکی اور برطانوی حکومت میں برابر کش مکش جاری تھی۔ بلکہ یہ کش مکش نازک صورت اختیار کر گئی تھی۔ اس اعتبار سے جب کردوں نے اعلان بغاوت کیا تو ترکی میں عام طور پر یہی سمجھا گیا کہ برطانیہ نے جمہوریہ ترکیہ کو دبانے کیلئے کردوں کو اُبھار دیا ہے۔ اور ان کی مذہبی جذبات سے کھیلتے ہوئے خلافت کے مسئلے کو پھر تازہ کر دیا ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انگورا کی اندرونی کش مکش کا رُخ اس تازہ مسئلہ کی طرف پھر گیا۔ اور کُردوں کی اس مسلح بغاوت کے خلاف جس سے جمہوریت کا وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا تھا بغیر کسی تاخیر کے فوجی کارروائی شروع کر دی گئی۔ باغی کردوں کو ابتداءً بڑی کامیابی ہوئی اور انھوں نے کچھ ہی دنوں میں "خاربیت"، "بتلس"، اور "مارش"، جمہوریہ ترکیہ کے تین اہم شہر فتح کرلئے اور انگورا سے جو مہم کردوں کی سرکوبی کیلئے فتحی بے کی نگرانی میں بھیجی گئی تھی وہ کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوئی، اس لئے کہ فتحی بے اس بغاوت کو فوجی طاقت سے کچلنے کے بجائے کردوں سے مفاہمت کر لینی چاہتے تھے۔ فتحی بے کی

پالیسی کی اس کمزوری کا نتیجہ یہ ہوا پیپلز پارٹی کے ایک اجلاس میں خود فتحی بے کے ایک حمایتی نے ان کی کمزوری پر شدید نکتہ چینی کی، اور غازی پاشا بھی ایسے وقت میں نکتہ چینی میں ساتھ ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فتحی بے کو اسی وقت اپنی خدمت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ اور چھ مہینے بعد عصمت پاشا دوبارہ وزیر اعظم بنا دیئے گئے۔ عصمت پاشا نے وزیر اعظم ہوتے ہی ساری کابینہ کو بدل دیا۔ اور پوری سختی سے کردستان کی بغاوت کو کچل ڈالا۔ بغاوت کے فرو ہوتے ہی آزاد عدالتیں بیٹھ گئیں۔ جنھوں نے کردوں کے ۴۷ قبائلی سرداروں پر بغاوت میں مقدمہ چلایا اور سب کے سب کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اور سب کے آخر میں کردستان کی بغاوت کے اصلی بانی اور رہنما شیخ سعد کو انگورا کی عدالت العالیہ کے آگے پھانسی دی گئی۔ اس طرح کردستان کی بغاوت جس نے جمہوریہ ترکیہ کی چولیں ہلا دی تھیں ختم کر دی گئی اور کرد اس گوشمالی کے بعد ایسے ٹوٹے کہ چپ چاپ اپنی پہاڑیوں میں واپس چلے گئے۔ اور ان کی ساری مخالفانہ قوت سلب ہو کر رہ گئی۔

باب ۲۸

جمہوریت اور غازی پاشا کیخلاف سازشیں اور سزائیں

کردستان کی بغاوت کے خاتمہ کے بعد ایک دن غازی پاشا نے اسمبلی کے آگے ایک زبردست تقریر کی جس میں کردوں کی بغاوت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے حریف پارٹی کے لیڈروں پر بڑی سختی سے نکتہ چینی کی اوران کی پالیسی کو ترکی جمہوریت کے منافی ٹھیرایا۔ تقریر کے دوران میں غازی پاشا نے ایک خط بھی ایوان کے آگے پیش کیا جو کاظم قرہ بکر پاشا نے کردوں کے لیڈر شیخ سعد کو لکھا تھا۔ اگرچہ یہ نجی خط تھا لیکن اس سے غازی پاشا نے ایوان پر یہ ثابت کیا کہ کردوں کے رہنما اور اس حریف پارٹی کے لیڈر کے نہایت گہرے ذاتی تعلقات تھے۔ اسی کے ساتھ غازی پاشا نے انگلستان کو بھی ملزم ٹھیرایا کہ اس نے کردوں کو ترکوں کے خلاف ابھار کر یہ بغاوت کرائی تھی، غازی پاشا نے کہا کہ جنگ عظیم کے زمانہ میں بھی برطانیہ نے یہی حرکت کی تھی اور کردوں کو ابھار کر ترکی پر پیچھے سے حملہ کروادیا تھا۔ اوران کی اس حرکت کا صلا انھیں یہ دیا تھا کہ معاہدہ سیورے کی رُو سے انھیں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے تسلیم کرلیا تھا۔ اوراب پھر اس نے یہی حرکت کی ہے اس لئے کہ برطانیہ موصل اوراس کے تیل کے چشمے ہضم کرنا چاہتا ہے۔ اوراس کے لئے کردستان اس کا بہترین سیاسی مُہرہ

ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ برطانیہ نے ان کو بڑھا کر جمہوریہ ترکیہ کو پھر شہ دی مقصد یہ تھا کہ اس طرح دبا کر موصل ترکی سے حاصل کر لیا جائے۔ اس تقریر کے آخر میں غازی پاشا نے کہا کہ کردستان کی بغاوت اگرچہ ختم ہو چکی ہے۔ لیکن ملک میں جمہوریت کے غدّار ابھی باقی ہیں۔ جب تک ان سے ملک کو پاک نہ کیا جائیگا اس وقت تک ترکی جمہوریت خطرہ سے باہر نہیں ہو سکتی۔ غازی پاشا کا یہ بیان دراصل آئندہ پروگرام کی تمہید تھی جو بہت جلد ایک بل کی شکل میں ایوان کے سامنے آ گیا، اس بل کی رُو سے عارضی طور پر دستوری حکومت معطل کر دی گئی اور اس کے بجائے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

مارشل لا کے ساتھ ساتھ اسمبلی کے ممبروں کا یہ آئینی حق کہ وہ گرفتار نہ ہو سکیں گے چھین لیا گیا۔ ملک میں نئے سرے سے فوجی عدالتیں قائم ہو گئیں اور حکومت کے مخالف عنصر پر پوری شدت سے جہاد کا اعلان کر دیا گیا سب سے پہلے قسطنطنیہ کو اس عنصر سے پاک کیا گیا اخبارات پر پوری سختی سے سنسر قائم کر دیا گیا۔ اور تقریباً ڈیڑھ سو ترکوں کو جن میں سیاسی اور مذہبی دونوں وضع کے ترک شامل تھے اور جو ترکی میں جمہوریت کے مخالف تھے چھانٹ چھانٹ کر ملک بدر کر دیا گیا۔ رؤف بے، ڈاکٹر عدنان اور ان کی بیوی خالدہ ادیب کو بھی ترکی کی سرزمین چھوڑنی پڑی۔ اسی طرح انگورا اور دوسرے شہروں سے جمہوریت کا مخالف عنصر نکال باہر کیا گیا۔ اسی دَوران میں جبکہ غازی پاشا دورے پر سمرنا جانیوالے تھے ان کے سمرنا پہونچنے سے دو دن پہلے سمرنا کی پولیس نے تین مشتبہ ترکوں کو اس سڑک پر جس پر سے غازی پاشا گذرنے والے تھے گرفتار کیا اور انکی تلاشی لینے پر ان کے پاس سے کئی خطرناک قسم کے بم اور

اس سڑک کا مکمل نقشہ برآمد ہوا۔ اور اس کے ساتھ چند خط بھی ان کے قبضہ سے پولیس نے حاصل کئے۔ جن میں انھیں غازی پاشا پر حملہ کرنے کے متعلق ھدایتیں دی گئی تھیں تحقیقات سے یہ خط مخالف پارٹی کے ایک ممبر سید خورشید کے ثابت ہوئے۔ اس ثبوت کے ساتھ ہی پولیس نے پوری سرگرمی سے اس سازش کا کھوج لگانے کی کوشش شروع کر دی، اس دریافت میں جمہوریت اور غازی پاشا کے خلاف انگورا اور سمرنا میں ایک زبردست سازشی جال کا پتہ چلا۔ اور ترکی کے بہت سے سیاسی مدبر اس سازش میں ملوث پائے گئے ان ہی میں بدقسمتی سے کاظم قرہ بکر، علی فواد اور کرنل عارف بے بھی تھے۔ یہ کرنل عارف وہ ہیں جو غازی پاشا کے نہایت گہرے دوست اور ان کے ہمشبیہ تھے اور لوگوں کو یہ شبہ تھا کہ یہ مصطفےٰ کمال کے عزیز بھی ہیں۔ ان میں سے کاظم قرہ بکر اور علی فواد تو عزت کے ساتھ فوجی عدالت سے بری ہوگئے۔ لیکن غریب کرنل عارف پھانسی پا گیا۔ اس سازش کے سلسلے میں جتنے ترک انگورا اور سمرنا میں گرفتار ہوئے تھے ان کی تحقیقات کیلئے دونوں ہی جگہ انگورا اور سمرنا میں فوجی عدالتیں قائم ہوئیں۔ سمرنا کی عدالت نے دس ملزموں کو مجرم قرار دیا اور ان کے لئے پھانسی کا حکم صادر کر دیا۔ انہی ملزموں میں غازی پاشا کے دوست کرنل عارف بھی تھے اور انگورا کی فوجی عدالت نے بارہ ملزموں کو مجرم گردانا۔ ان میں جاوید بے بھی تھے جو انور پاشا کی حکومت میں وزیر فنانس رہ چکے تھے اور انجمن اتحاد و ترقی کے بانیوں میں سمجھے جاتے تھے جب جاوید بے پر عدالت میں جرم ثابت ہو گیا تو ان کی جان بخشی کی سفارش فرانس کے وزیر امور سوریت نے غازی پاشا سے کی تھی لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ پھانسی پا گئے۔

ترکی جمہوریت اور غازی پاشا کی ذات کے خلاف سازش کے الزام میں ان سزا پانے والوں میں تین سابق وزیر، تین اسمبلی کی مخالف پارٹی کے ممبر اور سترہ فوجی افسر تھے۔ ان سزایابیوں سے انگورا کی سیاسی حریف پارٹی کا بالکل ہی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے لیڈر اور ممبر جو باقی رہ گئے تھے وہ ترکی سے بھاگ گئے اس کے دفتر پر قفل ڈال دیا گیا۔ اور اس کے بعد سے ترکی میں صرف ایک ہی سیاسی پارٹی رہی جس کا نام پیپلز پارٹی تھا اور جس کے صدر خود غازی پاشا تھے۔ یہ پارٹی اسمبلی کیلئے اپنے ممبر خود ہی نامزد کرتی ہے اور وہی ترکی پارلیمنٹ میں اپنے اپنے حلقہائے انتخاب کے ووٹوں سے منتخب ہو جاتے ہیں۔ جو ممبر بیکار ثابت ہوتے ہیں، جن کا چال چلن پارلیمنٹ کے باہر اچھا نہیں ثابت ہوتا یا جو اپنے حلقہ انتخاب کی خدمت کیلئے نا قابل ثابت ہوتے ہیں انھیں دوبارہ پارٹی کی طرف سے منتخب نہیں کیا جاتا۔ اور نہ وہ دوبارہ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہو سکتے ہیں۔

ترکی انقلاب اور استحکام جمہوریت کی تاریخ میں یہ ایک ہی باب ایسا ہے جو ۲۲ مختلف الخیال ترکی فرزندوں کے خون سے رنگین نظر آتا ہے۔
یہ لوگ بلاشبہ ترکی سیاست پر اپنی ایک مستقل رائے بھی رکھتے تھے، اور اپنے نقطہ خیال کے مطابق محب وطن بھی تھے۔ اور سب سے زیادہ تکلیف دہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر وہ تھے جنھوں نے ترکی کو غیر ملکی اقتدار سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں پوری سرگرمی سے غازی پاشا کا ساتھ بھی دیا تھا۔
غازی پاشا کے سیاسی حریف اور ان کی طرز حکومت کے مخالف حضرات

اس واقعہ سے ان کی ہوس اقتدار پر دلیل لاتے ہیں اور یہ اصرار یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ترکی کو اپنے سیاسی حریفوں اور اپنے ذاتی دشمنوں اور مخالفوں سے پاک کرنے کیلئے غازی پاشا نے یہ چال چلی تھی اور دُنیا کو دھوکا دینے کیلئے جمہوریت اور اپنی ذات کے خلاف سازش کے انکشاف کا یہ افسانہ گھڑا تھا۔

ہمیں اس جگہ خواہ مخواہ غازی پاشا کی صفائی مقصود نہیں ہے البتہ ان کے سوانح نگار کی حیثیت سے ہم اسے اپنا فرض ضرور سمجھتے ہیں کہ اس وقت کے حالات اور واقعات کی روشنی میں غازی پاشا کے سیاسی حریفوں کے اس الزام کی تحقیق کریں اور یہ دیکھیں کہ اس خونی واقعہ سے غازی پاشا کی ذات کو متہم کرنے میں حریف پارٹی کس حد تک حق بجانب ہے۔

غازی پاشا کی ذاتی مخالفت اور ترکی جمہوریت کے اُلٹنے کی سازش کو محض افسانہ بتانا ہماری رائے میں درست نہیں اس لئے کہ جب سے غازی پاشا نے اپنے ساتھیوں اور بعض مددگاروں کو ترکی سے متعلق اپنے آئندہ پروگرام کی ایک جھلک دکھائی تھی، اسی وقت سے ان کے اکثر ساتھیوں اور بعض دوستوں کو ان سے دلچسپی باقی نہیں رہی تھی، کیونکہ ترکی کے اس نقشے میں جو غازی پاشا نے بنایا تھا وہ رنگ نہیں تھا جو ان کے سیاسی حریف دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ غازی پاشا اور ان کے طرز حکومت کی مخالفت کی ابتدا تھی۔ لیکن اس کے بعد جب غازی پاشا نے خلافت اور سلطنت کو ایک دوسرے سے جدا کیا ہے تو ان کے یہ مختلف الخیال ساتھی اور مددگار کھلم کھلا ان کے ذاتی مخالف اور علانیہ ان کے سیاسی حریف بن بیٹھے، یہ بھی اختلاف کا درمیانی درجہ تھا، اور اس نوبت پر بھی جمہوریت کے ساتھ ان کی

مفاہمت کا امکان باقی تھا۔ لیکن یہ اختلاف انتہا پر اس وقت پہونچا اور غازی پاشا اور ان کے سیاسی حریفوں میں مفاہمت کا امکان اس وقت ختم ہوا جب ان کے سیاسی حریف قسطنطنیہ پہونچے۔ اور انھوں نے خلیفہ عبدالمجید کو ابھار کر اور ساری ترکی میں غازی پاشا کی ذات اور ان کی طرز حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کر کے ترکی جمہوریت کو الٹ دینا چاہا۔

غازی پاشا کے حریفوں کی اس جد وجہد کو اخلاقی حیثیت سے چاہے جو نام دے لیجئے لیکن سیاسی زبان میں ایسی کوششوں کو جو ایک منظم حکومت کے خلاف کی جاتی ہیں غالباً ایک ہی نام دیا جا سکتا ہے اور وہ "سازش" ہے۔

یہاں اس بحث کا کوئی موقع نہیں ہے کہ ترکی میں آئینی سلطان کے ماتحت ڈموکراٹک طرز کی حکومت مناسب تھی یا ایک خاص طرز کی جمہوریت؟ البتہ اس مسئلہ میں صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ طرز حکومت کے ان مدارج سے ایک خاص طبقہ ہی کی دلچسپیاں وابستہ ہوتی ہیں عوام کیلئے یہ محض بے معنی بحثیں ہیں۔ وہ تو صرف اس طرز حکومت سے مانوس ہو سکتے ہیں اور دل سے اس حکومت کا ساتھ دیتے ہیں جس میں ان کے مفاد کی پوری پوری حفاظت کی گئی ہو اور جس میں انھیں زیادہ سے زیادہ مطمئن اور خوش حال بنانے کی گنجائش رکھی گئی ہو۔ عام اس سے کہ وہ ڈموکراٹک طرز کی حکومت ہو یا جمہوری، غازی پاشا کی حکومت ہو، یا خلیفہ عبدالمجید کی!

چنانچہ عام ترکوں نے جنھوں نے خلیفہ کی حکومت کا بھی مزا چکھا تھا

اور غازی پاشا کی طرز حکومت سے بھی مانوس ہو چکے تھے، غازی پاشا اور ان کے سیاسی حریفوں کی کش مکش میں مطلق دخل نہیں دیا۔ حالانکہ غازی پاشا کے سیاسی حریفوں نے خلیفہ عبد المجید کو آگے کر کے ان کی قدیم مذہبی روایت کو تازہ کرنے اور ان کے جذبات کو مشتعل کرنیکا بھی کافی سے زیادہ اہتمام کیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ عام ترکوں کو غازی پاشا کی حکومت سے کوئی شکایت اور بے اطمینانی نہیں تھی جو اس سیاسی کشمکش سے انھیں دلچسپی پیدا ہوتی یا وہ خلیفہ اور غازی پاشا کی حکومت کے موازنہ کی زحمت میں پڑتے ــــــــ نتیجہ یہ نکلا کہ غازی پاشا اور ان کی طرز حکومت کے خلاف ان کے سیاسی حریفوں کی یہ جد وجہد' چند جاہ طلب افراد کی ذاتی مخاصمت بن کر رہ گئی۔

گویا چند مخصوص اور اقتدار پسند افراد کی طرف سے یہ ایک منتظم حکومت کی مخالفت تھی۔ یا ایک غرض پرست جماعت کی طرف سے ترکی جمہوریہ کو الٹنے کی منظم ــــــــ "سازش"!

ہوس اقتدار کا الزام غازی پاشا پر بے شک درست معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے انھوں نے حکومت کے ہر شعبہ میں اپنے اختیارات غیر محدود رکھے اور کبھی اپنے اصول اور خیالات کی مخالفت کو برداشت نہیں کیا۔ وہ برائے نام ترکی جمہوریہ کے صدر ہیں ورنہ فی الحقیقت وہ ترکی کے ڈکٹیٹر یا مختار مطلق کہے جا سکتے ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ غازی پاشا میں اقتدار کی یہ ہوس اپنی ذات کیلئے تھی۔ انھوں نے بیشک اپنے ذاتی

اور اپنی حکومت کے مخالفوں کو ترکی سے نکال باہر کیا۔ لیکن اس لئے نہیں کہ انھیں بے کھٹکے حکومت کرنیکا موقع مل جائے کیونکہ اگر غازی پاشا کو اس موقع کی تلاش ہوتی تو ان کے لئے اس سے زیادہ قطعی شخصی اختیارات کے ساتھ خلیفہ اور سلطان بن جانا بہت آسان تھا۔ بلکہ ترکی سے اس مخالف عنصر کو خارج کر دینے اور اپنے اختیارات کو حکومت کے ہر شعبہ میں پوری وسعت اور جامعیت کے ساتھ مصروف کار رکھنے کی ایک اور صرف ایک ہی وجہ تھی، اور وہ یہ کہ وہ جدید ترکی کو پچھلے یعنی سلطانی عہد کی حریفانہ سیاست سے علیحدہ رکھکر اپنے ہی بنائے ہوئے نقشے پر اس کی تعمیر کرنی چاہتے تھے۔ اور جو انقلابی پروگرام انھوں نے اپنی جدید ترکی کیلئے سوچ رکھا تھا اس کے لئے ڈموکراٹک طرز حکومت کسی طرح مناسب بھی نہ تھا۔ انھیں ایک نئی ترکی بنانی تھی، بنی بنائی ترکی کو چلانے کا سوال ان کے پیش نظر نہ تھا۔ اور اس جدید ترکی کی تعمیر کا جو پروگرام غازی پاشا نے تیار کیا تھا اس کی کامیاب تکمیل صرف اسی وقت ہو سکتی تھی کہ خود غازی پاشا حکومت کے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لیکر کھڑے ہو جاتے۔ چنانچہ ترکی سے مخالف عنصر کے اخراج کے بعد غازی پاشا نے جدید ترکی کو جس انداز سے تعمیر کیا اور سیاسی اور تمدنی حیثیت سے اُسے جہاں پہونچا دیا اس کا آج ان کے مخالف اور ان کے موافق دونوں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اور ان ہی شواہد کے بعد ان کے کسی سخت سے سخت مخالف کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ غازی پاشا نے اُن اختیارات کا ناجائز استعمال کیا جو انھوں نے اپنے سیاسی حریفوں کو ترکی سے خارج کر کے حاصل کر لئے تھے۔

اصل میں ابتدا ہی سے غازی پاشا کو یہ دُھن تھی کہ میں ترکی قوم کو ہر حیثیت سے آزاد دیکھوں، متحد اور منظم دیکھوں، غیور اور خود دار دیکھوں، مہذب اور ترقی یافتہ دیکھوں، صفِ اوّل کی یورپین اقوام میں اس کی نشست دیکھوں، اور صدیوں کی ان سب سیاسی اور سماجی کمزوریوں سے آزاد دیکھوں جس نے ترکی ذہنیت، ترکی آداب اور ترکی اخلاق کو پامال کر رکھا ہے!

وہ اسے اپنی زندگی کا ایک مقدس مشن سمجھتے تھے، اور ہمیشہ ان کو اس کا یقین رہا کہ وہ اپنے مشن میں پوری طرح کامیاب ہوں گے۔ اور یہ در اصل اسی یقین اور خود اعتمادی کی کارفرمائیاں ہیں کہ غازی پاشا ہر سیاسی اور فوجی مہم میں از اول تا آخر کامیاب رہے۔ اور نہایت خوبی اور کامیابی سے اپنے زندگی کے مشن کو پورا کر دیا۔

"ڈگو یرٹ لکھتا ہے :-

ہر انقلاب کے بعد اس طرح کے واقعات پیش آنے لازمی ہیں۔ فرانس میں قیامِ جمہوریت کے وقت تو ایسے کئی اور انتہائی افسوس ناک واقعے پیش آئے (جن میں سیکڑوں فرزندانِ وطن کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا)۔ اور رُوس میں بھی انقلاب کے بعد لینن کو (اپنے دوستوں اور مددگاروں

تنک کے خلاف، یہی عمل کرنا پڑا تھا ـــــــــــ

ان شواہد کے مقابلہ میں ترکی جمہوریت کا قیام دُنیا کی تاریخ جمہوریت میں سب سے کم خوں ریز سمجھا جاتا ہے ـــــــــــ اور اس میں ذرا جھوٹ نہیں ـ

باب ۲۹

انقلابی اصلاحات اور تعمیر کا دور

ترکی میں حریفانہ سیاست کو ختم کر کے اور ایک خاص طرز کی جمہوریت کو مستحکم بنیادوں پر قائم کر چکنے کے بعد غازی پاشا، تمدنی اور سماجی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ جمہوریت کے قیام سے بھی زیادہ مشکل کام تھا، قیام جمہوریت کے سلسلہ میں تو انھیں صرف ایک پارٹی ہی سے دست و گریبان ہونا پڑا تھا لیکن تمدنی اور سماجی اصلاح کے سلسلہ میں ان کا ساری ترکی قوم سے مقابلہ تھا۔ ترکوں کی صدیوں کی تمدنی روایات اور قرنوں کی سماجی عادات و اطوار کو یکسر بدل دینا۔ ان کی ذہنیت، ان کے طرز رہائش اور آداب معاشرت میں انقلاب پیدا کر دینا سیاسی انقلاب سے بہت زیادہ اہم اور انتہائی نازک بلکہ خطرناک مسئلہ تھا۔ جس کی تکمیل میں ذرا سا تشدد، اور عوام کی مرضی پر ادنیٰ سا دباؤ بھی ملک کو ایک جوابی انقلاب کے بھنور میں پھنسا دیتا۔ جمہوریت کا بالکل ہی خاتمہ ہو جاتا اور حریف پارٹی ملک پر قابض ہو جاتی۔ دوسری طرف، اصلاح اور تعمیر کے راستے میں ملک کی معاشی حالت بُری طرح حائل نظر آتی تھی، کامل بیس برس کی فوجی مہمات اور سیاسی بحران نے ترکی حکومت کو ترکی کی عام معاشی حالت سے بالکل بے خبر اور بڑی حد تک بے پروا بنا رکھا تھا۔ اناطولیہ جہاں اس نئی ترکی نے جنم

لیا تھا اور جو ترکوں کا قومی وطن بھی تھا۔ اس میں شک نہیں زرعی پیداوار کے اعتبار سے بڑا زرخیز علاقہ تھا لیکن اس کی زرخیزی اور شادابی محض خام پیداوار کی صورت میں تھی، اور وہ بھی غیر منظم حالت میں، نہ کوئی قومی صنعت و حرفت تھی اور نہ قابل ذکر تجارت۔

اصلاحات اور پھر انقلابی اصلاحات کیلئے روپیہ اور بے دریغ روپیہ کی ضرورت تھی۔ اور ملک کی خستہ حالی اس نوبت پر پہونچ گئی تھی کہ اس کی قلیل ترین ضروریات کی تکمیل میں بھی حیرانی اور پریشانی محسوس ہونے لگی تھی۔ ان حالات میں اگر غازی پاشا کے بجائے کوئی اور ہوتا تو غالباً وہ اپنے سماجی پروگرام کو غیر معین مدت تک کے لئے ملتوی کر دیتا۔ لیکن غازی پاشا جنھیں ابتدا ہی سے یہ دُھن تھی کہ میں ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے ترکی کو منقلب دیکھوں، ان انتہائی مایوس کُن حالات سے بھی مطلق نہ گھبرائے۔ اور جس طرح جنگ کے زمانہ میں وہ اپنے سے چہار چند زیادہ طاقتور فوجوں سے مقابلہ کے وقت اپنی فوجوں کو منظم اور مرتب کرنے میں سرگرمی دکھاتے تھے اسی سرگرمی سے اس سماجی مہم کو سر کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اور اپنی انقلابی اصلاحات پر بے دھڑک جمہوریت کی بازی لگا دی۔

جمہوریت کو خطرے کے اندیشے نے تو غازی پاشا کو ذرا بھی متاثر نہیں کیا۔ البتہ ملک کی معاشیات کی طرف سے وہ آنکھیں بند نہ کر سکے۔ کیونکہ اصلاحات کو ترکی میں کامیاب بنانیکا صرف یہی ایک وسیلہ ہو سکتا تھا اگر اسے وہ نظر انداز کر دیتے تو اپنی اصلاحی اسکیم کو ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکتے تھے چنانچہ انھوں نے ہر پہلو پر کافی غور و خوض کے بعد یہ طے کیا کہ ترکی

کی معاشی اور سماجی تعمیر ساتھ ساتھ شروع ہونی چاہیئے ۔ یہ ایک ایسا زبردست عزم تھا کہ جب غازی پاشا نے اس کا اعلان کیا تو یورپ نے اس کا مذاق اڑایا اور غازی پاشا کے سیاسی حریفوں نے ترکی کے مخالف حالات کا اندازہ کرتے ہوئے اسے غازی پاشا کا ایسا خواب بتایا جس کی کبھی تعبیر ہی نہ نکل سکے ۔ بلکہ خود انگورا میں ایسے سیاسی مدبّر موجود تھے جنھیں ترکی میں ایک ہی وقت میں اس دوہری اصلاح کی کامیابی میں شبہ تھا ۔ لیکن دشمنوں کے استہزا مخالفوں کے اعتراض اور دوستوں کی بے اعتنائی کے باوجود غازی پاشا نے اپنی اصلاحی اسکیم نافذ کردی ، اور دن رات ایک کرکے اس کی تکمیل میں مصروف ہو گئے ۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی مشکل جو غازی کے راستے میں حائل ہوئی وہ نقد روپے کی کمی تھی ۔ اگر وہ چاہتے تو کسی یوربین سلطنت سے روپیہ قرض لے سکتے تھے ۔ لیکن ایک تو وہ سلطانی عہد کی اس بنیادی غلطی کا دوبارہ اعادہ نہیں چاہتے تھے اور نہ قرض کی آڑ میں کسی غیر ملکی اقتدار کی ترکی جمہوریت میں مداخلت وہ برداشت کر سکتے تھے ۔ ان کے نزدیک یہ انتہائی بے غیرتی تھی کہ ترکی قوم اپنی تعمیر میں غیر اقوام سے مالی امداد حاصل کرے ۔ غازی پاشا کا قول تھا " وہ روپیہ جو قرض حاصل کیا جائے روپیہ نہیں ہوتا بلکہ ایک لعنت ہوتی ہے جو اس صورت میں قوم پر مسلّط ہو جاتی ہے "

چنانچہ غیر اقوام سے قرض حاصل کرنے کے خیال کو الگ کرنے کے بعد غازی پاشا کے پاس اپنی اسکیم کے لئے فوری نقد روپیہ فراہم کرنے کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی ۔ اور وہ یہ کہ ترکی کی تعمیر کیلئے خود ترکوں سے روپیہ لیں ۔ اناطولیہ ایک دولت مند علاقہ بلاشبہ تھا لیکن اس کی گڑی ہوئی دولت کو باہر نکالنے کا سوال بہت ٹیڑھا اور حکومت کو سخت

آزمائش میں ڈال دینے والا تھا۔ کیونکہ ترکوں سے روپیہ حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ غازی پاشا نفاذ سے پہلے اپنی انقلابی اسکیم ملک کے آگے پیش کر دیں اور اس طرح اصلاحات کے مخالفین کو یہ موقع بہم پہونچا دیں کہ وقت سے پہلے ہی وہ اپنی رجعت پسندانہ قوتوں کو منظم کر کے غازی پاشا کے مقابلہ کی تیاریاں کر لیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ معاشی اور سماجی اصلاح کے متعلق ترکی رائے عامہ کو معلوم کرنیکی ایک نہایت مؤثر صورت بھی تھی۔ چنانچہ ہر خطرے سے بے پرواہو کر غازی پاشا نے قومی قرضہ کا اعلان کر دیا۔ ترکوں نے اپنے روایتی جوش وخروش سے غازی کی آواز پر لبیک کہی۔ اور معینہ وقت سے پہلے ہی جس قدر روپیہ غازی نے مانگا وہ ان کے آگے ڈھیر کر دیا۔ اور اس طرح ترکوں نے ساری دُنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ پوری طرح غازی پاشا کی انقلابی اسکیم کے حامی اور ان کے مددگار ہیں۔

روپیہ ملتے ہی غازی پاشا نے اناطولیہ میں بندرگاہوں سے اندرونی شہروں تک ریلوے اور سڑکوں کی تعمیر کا ایک زبردست جال بچھادیا، اس کے بعد زراعت کی طرف توجہ کی، بنجر زمینوں کو قابل کاشت اور ملک کی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ طاقت ور بنانیکا کام پوری سرگرمی سے شروع کر دیا۔ کسانوں کو سودخواروں سے بچانے کیلئے سرکاری بنک جاری کئے خام پیداوار کی نکاسی کیلئے جرمنی، آسٹریا، بلجیم، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ سے تجارتی معاہدے کئے اور اناطولیہ کے جنگلات کو ترکی کے لئے مخصوص کر کے باہر سے لکڑی کی درآمد کو بالکل بند کر دیا۔

غرض اصلاح میں صنعتی اور حرفتی ادارے کھولے گئے۔ وسیع پیمانہ پر

اُونی اور سوتی کپڑے کے کارخانے قائم ہوئے ۔ جن کی پیداوار ملک میں غیر ملکی درآمد کی جگہ لیتی جا رہی ہے ۔ غیر ملکی تجارتی کمپنیوں کو یا تو بالکل ہی ترکی سے نکال باہر کیا یا ان پر سخت ترین قیود عائد کر دیں تاکہ ترکی سرمایہ باہر نہ جانے پائے ۔ اناطولیہ کے ہر بڑے شہر میں تجارتی بینک قائم کئے گئے کوآپریٹیو سوسائٹیاں قائم ہوئیں ۔ اور ترکی تجارت نئے اصول اور جدید طرز پر ترقی کرنے لگی ۔

ان معاشی اصلاحات کے دوش بدوش غازی پاشا نے سماجی اصلاح کی طرف توجہ دی ۔ غازی پاشا کی یہ خواہش جنون کی حد تک پہونچ گئی تھی کہ مشرق کی ساری قدیم اور فرسودہ روایات کو ایک ایک کر کے ترک کر دیں ، اور ترکوں کو ہر حیثیت سے مہذب اقوام کے پہلو بہ پہلو لا بٹھائیں ۔ وہ ترکوں کا لباس ، ان کے رہنے سہنے کا انداز ، ان کی صحبتوں کے آداب ، ان کے قدیم اور بے معنی رسم و رواج ، غرض ہر اس مہمل اور بے معنی روایت کو ترکی زندگی سے خارج کر دینا چاہتے تھے جس نے ترکوں کی ذہنیت میں ایک قسم کی پستی سی پیدا کر دی تھی ۔ لیکن وہ ان سب کمزوریوں کو ترکی جمہوریہ کے دشمنوں یا آل عثمان کی طرح فی الفور ترکی حدود سے باہر نہیں نکال سکتے تھے ۔ اس لئے سب سے پہلے انھوں نے ترکوں کے قومی لباس کے مسئلہ کو لیا ۔ پڑھے لکھے ترکوں نے مدت سے کوٹ پتلون کو اپنا قومی لباس بنا لیا تھا ، لیکن ٹوپی ان کی " رومی ،، ہوا کرتی تھی ۔ یہ رومی جسے آج ترکی ٹوپی بھی کہتے ہیں اصل میں صدیوں پہلے ترکوں نے یونانیوں سے لی تھی ۔ یونانیوں نے تو بعد کو اسے اپنے لباس سے خارج کر دیا لیکن ترکوں نے اسے قبول کر لیا اور رفتہ رفتہ یہ ترکوں کے قومی لباس کا ایک اہم جزو بن گئی ۔ غازی پاشا نے اس

رومی ٹوپی کو جو ترکوں کا قومی نشان بن گئی تھی ترکی لباس سے خارج کر دیا ابتداءً انھوں نے خود ہیٹ اوڑھی، اور اپنے باڈی گارڈ کو رومی ٹوپیوں کے بجائے چھجے دار ٹوپیاں دیں۔ پھر رفتہ رفتہ ساری فوج میں چھجے دار ٹوپیوں کو رواج دیدیا۔ جب فوج سے فارغ ہوئے تو عام ترکوں میں ہیٹ رائج کرنیکی طرف متوجہ ہوئے۔ اس اصلاحی پروگرام کی تکمیل کیلئے ترکی کے دور دراز شہروں اور دیہاتوں تک کا غازی پاشا نے دورہ کیا اور خود ہیٹ اوڑھ کر لوگوں کو اس کی ترغیب دی۔ جگہ جگہ تقریریں کر کے رومی ٹوپی اور ہیٹ کا فرق نمایاں کیا۔ لیکن اس تگ ودو کے باوجود غازی پاشا کو ہیٹ رائج کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ ترک اس کو اپنا قومی نشان سمجھتے تھے بلکہ وہ اس کو اسلامی ٹوپی سمجھنے لگے تھے۔ اور ہیٹ کو وہ کافروں کی نشانی سمجھتے تھے۔

غازی پاشا کیلئے ترکوں کے اس مذہبی اعتقاد کا مقابلہ کرنا بڑا مشکل کام تھا لیکن انھوں نے قانون کے ذریعہ اس کا بھی مقابلہ کیا۔ چنانچہ دورہ سے واپس آکر غازی پاشا نے رومی ٹوپی کے خلاف ایک مسودہ قانون پیش کیا جس میں ترکی حدود میں 'رومی ٹوپی اوڑھنے کو قانوناً جرم اور اس کے بجائے ہیٹ کو جمہوریہ ترکیہ کا لباس قرار دیا۔ اسمبلی نے فوراً یہ مسودہ قانون منظور کر لیا اور اس منظوری کے دو دن بعد ترکی کے عرض وطول میں پولیس کو یہ حکم بھجوا دیا کہ رومی ٹوپیاں جہاں نظر آئیں ضبط کر لی جائیں۔

اس قانون نے سارے ملک میں آگ لگا دی، مذہبی ملاؤں نے اس آگ پر تیل ڈالا۔ اور وہ ترک جنھوں نے خلافت سے سلطنت کی علیحدگی

اور بعد کو ترکی سے آلِ عثمان کے اخراج پر کان تک نہ ہلایا تھا، اس ٹوپی کے
مسئلہ پر حکومت سے لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے۔ جگہ جگہ اس قانون کے خلاف
احتجاجی جلسے ہوئے۔ سرکاری افسروں پر حملے کئے گئے۔ خود اسمبلی میں جنرل
نورالدین پاشا نے اس قانون کے خلاف احتجاج کیا۔ غرض اکثر پڑھے لکھے اور
عام بے پڑھے لکھے ترک ٹوپی کے معاملہ میں حکومت کے خلاف صف آرا ہو گئے
لیکن غازی پاشا نے عام مخالفت کے باوجود اس قانون کو واپس نہیں لیا اور
نہ تعمیل حکم میں ڈھیل دی۔ ان لوگوں پر جنھوں نے پولیس کے افسروں اور
دوسرے سرکاری عہدیداروں پر حملہ کیا تھا مقدمے چلائے گئے اور انھیں سزائیں دی
گئیں۔ فسادیوں کو لمبی مدت کے لئے جیل خانہ بھیج دیا گیا۔ اور ہر بڑے
شہر میں ایسے مقدمات کے تصفیہ کے لئے سرسری عدالتیں قائم کر دیں۔
نتیجہ یہ ہوا کہ چند دنوں میں ترکوں کا جوش و خروش کم ہو گیا، دیہاتوں اور
شہروں میں ہر جگہ سے حکومت کی پولیس نے رومی ٹوپیاں اکٹھی کر لیں اور
ان کے بجائے ترکوں کے سروں پر ہیٹ اور چھجے دار ٹوپیاں نظر آنے لگیں
عام حکم یہ تھا کہ مسجد میں ہیٹ اتار کر داخل ہوں یا اگر چھجے دار ٹوپی اوڑھیں
تو نماز کے وقت اس کا چھجہ پیچھے کو کر لیں تاکہ سجدہ میں آسانی رہے۔ اس
حکم کی بے چون و چرا تعمیل ہونے لگی۔ لیکن اس سلسلہ میں ابھی ایک قباحت
یہ باقی تھی کہ مذہبی ملّاؤں نے اس حکم کی ابھی تک تعمیل نہیں کی تھی، جس سے
عام ترکوں میں ایک دفعہ پھر ہیٹ کے خلاف اشتعال پیدا ہونے کا امکان
باقی تھا۔ علاوہ اس کے یہ مسجد کے کٹھ ملّا اب غازی پاشا کے لئے بہت تکلیف
دہ ہوتے جا رہے تھے۔ مسجدیں اور خانقاہیں جہاں ریاضت اور نفس
کشی کے چرچے ہونے چاہئیں اب ان میں ترکی کی سماجی اور مذہبی زندگی پر

بحثیں ہونے لگی تھیں۔ اور چپکے چپکے ترکی جمہوریہ اور سماجی اصلاحات کیخلاف ایک محاذ تیار ہوتا شروع ہو گیا تھا۔ اصل میں غازی پاشا کی ان انقلابی اصلاحو سے سب سے زیادہ مذہبی ملاؤں کو خطرہ تھا۔ انھیں اندیشہ یہ تھا کہ اگر ان سرگرمیوں کو روکا نہیں گیا تو پھر ان کا وجود ہی ترکی سرزمین میں بے سود ثابت ہو گا اور انھیں بھی ایک دن آل عثمان کی طرح ترکی حدود سے باہر ہو جانا پڑیگا۔ چنانچہ ایک طرف ترکی کے ملا اپنی بقا اور سلامتی کیلئے ترکی جمہوریہ اور غازی پاشا کیخلاف اپنے پیروں اور معتقدوں میں زہر پھیلا رہے تھے اور دوسری طرف غازی پاشا ان کی چالوں کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملاؤں کا وجود ترکی جمہوریہ میں ناقابل برداشت ہو گیا۔ اسمبلی نے ان کے خلاف بھی ایک قانون منظور کر ڈالا۔ خانقاہیں اور پیری مریدی کے آستانے توڑ دیئے گئے اوقاف بحق جمہوریہ ضبط کر لئے گئے۔ اور ان ملاؤں کو جو جھوچھکا یا پیری مریدی کے ذریعہ اپنا پیٹ پالا کرتے تھے یا جن کی اوقاف پر گذر تھی۔ یہ حکم دیدیا گیا کہ عام ترکوں کی طرح محنت مزدوری کریں، اور ترکی جمہوریہ کے ایک شریف شہری کی طرح زندگی بسر کریں۔ اسی کے ساتھ غازی پاشا نے مذہبی مدارس قائم کر دیئے۔ اور سلطنت میں مذہبی خدمات حاصل کرنے یا وعظ و تلقین کا منصب اختیار کرنے کے لئے ان مدرسوں کی سند ضروری قرار دی۔ علاوہ اس کے مذہبی لباس پہن کر سڑکوں پر نکلنے کی بھی ممانعت کر دی۔ البتہ مسجدوں اور مدرسوں میں فرائض مذہب ادا کرتے وقت یا درس و تدریس کے سلسلہ عبا و قبا زیب تن کرنیکی اجازت تھی۔

ترکی میں ہر اسلامی ملک کی طرح عوام پر ملاؤں کا زبردست اثر و اقتدار تھا۔ اور یہ ملا ترکوں کی زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں بری طرح دخیل ہو گئے تھے۔

ان لتمیہ یا بزرگوں کے وجود سے جو صدیوں سے ترکی پر سوار تھے، اور سلطنت کے ہر مسئلہ میں اپنی ایک رائے بھی رکھتے تھے، ترکی جمہوریہ کی بقا اور سلامتی کی خاطر ترکی سرزمین کو پاک کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ ان بزرگوں نے مذہب کے نام پر احدی نکموں کا ایک گروہ اپنے گرد جمع کر لیا تھا جو خیرات کی روٹیوں پر پلتا اور مذہب کے نام پر اپنی شورہ پشتی کے باعث ترکی کی پُر امن زندگی میں فساد بپا کر دیا کرتا تھا۔ ترکی سے اس مذہبی گروہ کا اخراج دراصل اسی دلیل کی ماتحت عمل میں آیا کہ بے معنی مذہبی تفاخر کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اور ملک میں احدی اور نکموں کی پرورش کو قانون اور اخلاقی جرم قرار دیا جائے۔

باب ۳۰

ترکی میں جدید اصلاحات کا نفاذ، انگورہ کی از سر نو تعمیر

ترکی سر زمین کو ملاؤں کے وجود سے پاک کر کے سماجی اور تمدنی اصلاح کے سلسلہ میں غازی پاشا نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ ترکی کے دیوانی، فوجداری اور تجارتی قوانین بالکل بدل ڈالے۔ تجارتی قانون انھوں نے جرمنی سے لیا، فوجداری قانون تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اٹلی کا لے لیا اور دیوانی قانون جوں کا توں سوئٹزرلینڈ سے لیکر ملک میں نافذ کر دیا۔

سوئٹزرلینڈ کے قانون دیوانی کے رواج سے ترکی کا قانون وراثت جس کی بنیاد 'فقہ اسلامی' پر تھی بالکل بدل گیا۔ وراثت میں عورتوں کا بلا تخصیص مساوی درجہ تسلیم کر لیا گیا۔ ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کرنیکا اختیار مردوں سے چھین لیا گیا۔ برقعہ اور نقاب کا ایشیائی پردہ اٹھا دیا گیا۔ اور ترکی عورتوں کو بھی جمہوریہ ترکیہ کے آزاد شہری کی حیثیت سے زندگی کے ہر شعبہ میں نمود حاصل کرنیکی آزادی دیدی گئی۔

ترکی میں ان انقلابی اصلاحات کے نفاذ سے یورپ کی بعض حریف قوتوں کو ترکی جمہوریہ اور غازی پاشا کی ذات کے خلاف بے دینی اور لا مذہبی کے پروپیگنڈے کا موقع ہاتھ آگیا جسے غازی پاشا کے ذاتی مخالفوں نے بھی خوب ہوا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس غلط پروپیگنڈے سے اسلامی ممالک میں

غازی پاشا اور ان کی حکومت کے خلاف عام طور پر بدظنی سی پیدا ہو گئی۔ اسی دوران میں مصر کے ایک اخبار نویس نے غازی پاشا سے ملاقات کی اور ان اصلاحات کے سلسلہ میں غازی پاشا کا نقطۂ نظر معلوم کرنا چاہا۔ غازی پاشا نے اس کے جواب میں ایک طویل بیان دیا جس میں انھوں نے تفصیل سے یہ بتایا کہ وہ ترکی میں ان انقلابی اصلاحات کے نفاذ میں کس اصول کی پابندی کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا۔

"ہمارا تعلق جس قدر ایشیا سے ہے اسی قدر یورپ سے ہے۔ اور ہمارا اصول یہ ہے کہ ہم ان دونوں میں مساوات قائم رکھیں۔ جو خوبیاں ہمیں ایشیا میں ملیں گی ہم ایشیا سے لیں گے اور جو بھلائیاں ہمیں یورپ میں نظر آئیں گی یورپ سے لیں گے لیکن ہر صورت میں اپنی آزادی اور انفرادیت کو برقرار رکھیں گے۔ ہم ہر مسئلہ کو ترکی نقطۂ نظر سے حل کریں گے اور ہمارے پیش نظر صرف ترکی مفاد ہوگا۔"

جدید قوانین کے نفاذ کے بعد غازی پاشا نے ترکی کو ہر حیثیت سے ترکی بنانے کی کوشش شروع کر دی اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے ترکی

زبان پر توجہ کی۔ ترکی زبان میں آدھے سے زیادہ لفظ فارسی اور عربی کے مستعمل تھے۔ ان الفاظ کو ترکی زبان سے خارج کرنے کے لئے ترکی ادیبوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اور اخباروں کو یہ حکم دیا کہ عربی اور فارسی الفاظ کے بجائے اس کمیٹی کے منظور شدہ ترکی بدل قبول کریں اور انھیں ملک میں مقبول بنائیں۔ اس مہم کو سر کرنے کے بعد غازی پاشا نے حکم دیا کہ قرآن بے سوچے سمجھے عربی میں پڑھنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ اس کا ترجمہ ترکی میں کیا جائے تاکہ عام ترکوں کو اس کے مطالب اور مفہوم پر بھی عبور حاصل ہو سکے۔ اسی کے ساتھ نماز اور اذان بھی ترکی زبان میں ہونے لگی۔

غیر ملکی مدارس، خاصکر وہ جو عیسائی مبلغوں کے انتظام اور نگرانی میں تھے بند کر دیئے گئے۔ ابتداءً مدرسوں میں صرف ترکی زبان میں تعلیم دینے کا حکم دیا اور سکنڈری مدارس میں ترکی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا۔ باہر کے جو اونچے درجہ کے مدارس ترکی میں باقی رہ گئے تھے انھیں حکم دیا کہ ان میں عیسائی مذہب کی تبلیغ نہ ہوا کرے۔ اور ایسے مدرسوں میں ترکی استادوں کا تناسب ۶۰ فیصدی رکھا جائے۔ اور ترکی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔

ترکی کے اکثر پیشوں اور تجارتی شعبوں میں سے غیر ملکیوں کو نکال باہر کیا گیا اور ہمیشہ کیلئے انھیں ترکی میں ملازمت حاصل کرنیکی قانوناً ممانعت کر دی گئی۔ باہر کی کمپنیوں اور بڑی بڑی فرموں کو حکم دیا گیا کہ وہ ترکی سرمایہ لگائیں اور اپنی فرمونکے ترکی ڈائریکٹر مقرر کریں۔ اپنی کمپنیوں پر ترکی نشان لگائیں، ترکی ملازموں سے کام لیں، ترکی میں خط کتابت کریں اور ترکی ہی میں حساب کتاب رکھیں یا ترکی سے باہر نکل جائیں۔

درآمد پر محصول چہار چند کر دیا۔ غیر ممالک کی مصنوعات کو ترکی میں داخلہ حاصل کرنے کیلئے طرح طرح کی شرطوں کا پابند کر دیا۔ لیکن ترکی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے خود حکومت نے سرمایہ لگایا۔ اور عام ترکوں میں ترکی مصنوعات کی ترویج کیلئے نہایت سرگرمی سے پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔

ان بڑی بڑی انقلابی اصلاحات کے ساتھ ساتھ غازی پاشا نے ترکی زندگی میں سیکڑوں چھوٹی چھوٹی اصلاحیں کر ڈالیں۔ مدت سے ترکی میں یہ رواج تھا کہ مسلمانوں کو جمعہ کی، یہودیوں کو ہفتہ کی اور عیسائیوں کو اتوار کی چھٹی ہوا کرتی تھی، غازی پاشا نے سب کے لئے صرف ایک جمعہ کی سرکاری چھٹی قرار دی۔ سرکاری دفاتر کے آداب مقرر کئے، اور ملک کے عام رواج میں تبدیلی کر دی، حتیٰ کہ بات چیت اور رہنے سہنے کے ڈھنگ تک بدل ڈالے۔ قمری مہینوں کے بجائے شمسی مہینوں کو قبول کیا۔ دن جو پہلے ترکی میں بارہ گھنٹے کا گنا جاتا تھا اسے دن اور رات میں برابر کا تقسیم کر کے ۲۴ گھنٹے کا مقرر کر دیا۔

سڑکوں اور گلیوں سے بھک منگوں اور فقیروں کی گداگری کو قانوناً جرم قرار دیا۔ معذوروں اور محتاجوں کیلئے شہر کے باہر محتاج خانے بنوا دیئے۔ اور شادی کے وقت دولہا دولھن کے صحت کی تصدیق ضروری قرار دی۔

ان اصلاحات کے ساتھ ساتھ ترکی جمہوریہ کے پایہ تخت انگورا کی از سرِ نو تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا۔ جس وقت مصطفےٰ کمال نے اس شہر کو ترکی کا پایہ تخت بنانا چاہا تو ماہرین صحت و تعمیرات نے اس کی شدید مخالفت کی تھی، اس لئے کہ یہ شہر نشیب میں آباد تھا۔ بارش میں یہاں ہر سال ملیریا کا زور ہوا کرتا تھا

اور گرمیوں میں سخت بگولے اٹھا کرتے تھے۔ اور آب و ہوا کے اعتبار سے بھی یہ مقام قسطنطنیہ سے بہتر نہیں تھا۔ لیکن ان میں سے ایک قباحت بھی غازی پاشا کے عزم کو متزلزل نہ کر سکی۔ انھوں نے برلن سے ماہر تعمیر پروفیسر جینسن کو اور ویانا سے پروفیسر آرنے کو انگورا بلوایا۔ اور اپنی نگرانی میں جدید پایہ تخت کا نقشہ ان دونوں سے بنوا ڈالا۔ اسمبلی نے جدید تعمیر کے اخراجات کی منظوری دیدی۔ اور یہ کام پوری سرگرمی سے شروع کر دیا گیا۔

انگورا سے ملیریا کو دور کرنے کیلئے مچھر پیدا کرنیوالے جوہڑوں کو خشک کیا گیا اور نشیبی مقامات پر خوبصورت پارک بنوا دیئے۔ شہر کی آب و ہوا صاف کرنیکو کروڑوں گلاب کے اور لاکھوں درخت سیب کے نصب کر دیئے۔ سڑکیں نہایت وسیع بنائی گئیں اور ان پر عالی شان مکان کوٹھیاں، محل ہوٹل، اسکول، ہسپتال بنوا ڈالے۔ ان سب عمارتوں کو فن تعمیر کے جدید ترین اصول پر بنایا گیا۔ قدیم ایشیائی مذاق رخصت ہوا اور اس کی جگہ پوری تکمیل کے ساتھ یورپین طرز تعمیر نے لے لی۔ جس وقت انگورا اس جدید نقشے پر تیار ہوا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایشیا کے صحرا میں ایک اعلیٰ درجہ کا یورپین شہر آباد ہے۔

تعمیر کے اس عام نقشہ میں قسطنطنیہ کو بھی شامل کر لیا گیا۔ باسفورس پر ایک جدید بندرگاہ کی تعمیر کی طرح ڈال دی گئی۔ ایک زبردست درس گاہ اور موسیقی کا مدرسہ اور ایک تھیٹر قسطنطنیہ میں بنوایا گیا۔ اور ان کے ساتھ بڑی بڑی سڑکوں پر جو عمارتیں تھیں ان کے روکار بدل دیئے۔ سنٹ صوفیا کا ایک حصہ جس میں قدیم بازنطینی اشیاء محفوظ تھیں عجائب خانہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ قدیم شاہی عمارتوں کی درستی کرائی گئی۔ اور باسفورس کے

ساحل پر سلاطین ترکی کا جو شان دار محل تھا اسے ایک عالی شان ہوٹل میں
بدل دیا۔

"چانکیا" انگورا سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ غازی
پاشا نے ابتدا ہی سے اس کو اپنی سکونت کیلئے پسند کر لیا تھا۔ یہاں ایک مختصر
سا بالکل سادی وضع کا ایک منزلہ مکان یا کوٹھی میں غازی پاشا رہا کرتے تھے
اس کوٹھی کے گرد جو قابل کاشت زمینیں تھیں ان کو غازی پاشا نے ماڈل فارم
کی صورت میں بدل دیا۔ اس فارم میں جدید ترین آلات سے کاشت کی جاتی ہے
اور زمین کو زیادہ سے زیادہ طاقتور اور قابل کاشت بنانے کے تجربے ہوا
کرتے ہیں۔

یہ ماڈل فارم غازی پاشا کی اپنی ملک ہے۔ جب حکومت کے جھگڑوں
اور بکھیڑوں سے وہ گھبرا جاتے ہیں تو اس فارم میں ایک کسان کی حیثیت سے
کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اور اس وضع میں انھیں اس قدر اطمینان اور
خوشی نصیب ہوتی ہے کہ ان کی ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔ انھوں نے
یہ طے کر لیا ہے کہ سیاست سے کنارہ کش ہو جانے کے بعد وہ ایک کاشتکار
ترک کی حیثیت سے زندگی بسر کریں گے۔

اسی فارم میں غازی پاشا نے پانی کا ایک دست ترد ائر بھی بنوایا ہے جس کی
شکل بالکل بحیرۂ مارمورا کی سی رکھی ہے اور اس کا پیمانہ بھی میلوں کو گزوں
کی شکل میں بدل کر وہی رکھا ہے۔ یہ ریزروائر جرمنی کی ایک کمپنی Holtz-
mann کے انجنیر موسیو شکے نے بنوایا ہے۔ اور اس پر ایک لاکھ ترکی پونڈ
کے قریب لاگت آئی ہے۔ لیکن اس کی تعمیر کا سب سے بڑا فائدہ جو انگورا

کو پہونچا وہ یہ تھا کہ شہر میں پانی کی قلت دُور ہوگئی۔ اور اطراف کی زمینیں بھی سیراب نظر آنے لگیں۔ اور انگورا کی صحتِ عامہ میں ایک نمایاں فرق محسوس ہونے لگا۔

مصوری، بُت تراشی اور موسیقی کو ترکی میں سلاطین آلِ عثمان کے زمانہ میں کبھی فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ ان فنوں کی ترویج اسلامی فقہ کے خلاف تھی لیکن غازی پاشا کا زاویہ نظر اس مسئلہ میں اور تھا، وہ فن کو فن کی حیثیت سے رواج دینا پسند کرتے تھے، اور اس معاملہ میں مذہبی یا اخلاقی نقطۂ نظر کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے انگورا اور قسطنطنیہ میں مصوری، بُت تراشی اور موسیقی کے زبردست ادارے قائم کئے اور ترکوں کے دماغوں سے اس مذہبی خیال کو محو کرنے کیلئے جو صدیوں سے بُت تراشی اور مصوری کے خلاف جڑ پکڑ گیا تھا سب سے پہلے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بُت (اسٹیچو) بنوائے اور انھیں انگورا، قسطنطنیہ اور سمرنا میں جگہ جگہ بڑی بڑی شاہراہوں پر نصب کرادیا۔

مصوری کے اسکول اور کالج قائم کئے اور ان طالب علموں کو جن کا رجحان مصوری کی طرف پایا گیا ترغیبی وظیفے دیئے گئے۔ ویانا اور پیرس میں ترکوں کو اس فن کی تکمیل کیلئے بھیجا گیا۔ اور ترکی میں اس فن کی ترقی کے لئے وہ سب وسائل اختیار کئے گئے جو ضروری تھے۔

مصوری کی طرح موسیقی کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ ترکی موسیقی کو مغربی اصول اور مغربی راگ راگنیوں پر ڈھالا گیا، اور ترکی باجوں کی جگہ یورپین ارغنوں کو دی گئی۔ اور ایشیائی رقص کے بجائے مہذب اقوام کی

مختلف طرز کے رقص قبول کر لئے گئے۔

فنون لطیفہ کی طرف اس سرگرمی سے توجہ کرنے کے متعلق غازی پاشا کی دلیل یہ تھی کہ اس سے قوم میں جمالیات کا صحیح ذوق پیدا ہوتا ہے۔ تخیل میں رفعت نزاکت اور بلندی پیدا ہوتی ہے، اور مزاج میں نفاست آجاتی ہے۔

ترقی نسواں کے سلسلہ میں غازی پاشا نے پہلا قدم یہ اٹھایا تھا کہ ایشیائی پردہ ممنوع قرار دیدیا تھا، قانونی طور پر عورتوں اور مردوں کی حیثیت مساوی تسلیم کر لی تھی، اور تعدد ازدواج کو قانوناً جرم قرار دیا تھا۔ دوسرا قدم اس سلسلہ میں انھوں نے یہ اٹھایا کہ انگورا میں لڑکیوں کا ایک زبردست کالج "عصمت اینونو انسٹیٹیوٹ" کے نام سے قائم کیا۔ جس میں لڑکیوں کی تعلیم کے ساتھ جدید اصول پر تربیت کا بھی پورا التزام رکھا۔ اس مدرسہ میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ انھیں گھرداری کے طریقے بھی بتائے جاتے ہیں۔ لڑکیوں کا یہ کالج ہر اعتبار سے اس قدر مکمل ہے کہ یورپ کے بہت کم گرلز کالج اس کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ ترقی نسواں کے مسئلہ میں ابتداءً لطیفہ خانم اور خالدہ ادیب نے غازی پاشا کی مدد کی تھی، اس کے بعد غازی کی بہن مقبولہ اور منہ بولی بیٹی عفت نے غازی کا ہاتھ بٹایا۔ اس کالج کے علاوہ ان دونوں کی مدد سے انگورا میں لڑکیوں کے بیسیوں ابتدائی مدارس کھولے اور لڑکوں کی طرح لڑکیوں کیلئے بھی ابتدائی تعلیم لازمی قرار دی۔ اس کے علاوہ ان دونوں نے چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کے، ہوٹلوں، چائے خانوں، اور سینماؤں میں ملازمت حاصل کرنے کے خلاف اسمبلی میں ایک قانون بھی منظور کروادیا تاکہ قوم کے بچوں کے اخلاق بگڑنے نہ پائیں۔ اسی کے ساتھ

انھوں نے ہر مہینے بچوں کے لئے ایک نمائش کا انتظام کیا جس میں بچوں کی اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں کی نمائش کی جاتی اور طرح طرح کی تعلیمی کھیل تماشوں سے انھیں پڑھائی کی ترغیب دی جاتی۔

ترکی خواتین جو اعلیٰ تعلیم سے مزین ہوکر باہر آتیں اور سلطنت کے کسی شعبہ سے تعلق پیدا کرنیکی خواہش مند نظر آتیں ان کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جاتی۔ سرکاری دفاتر اور بڑی بڑی فرموں میں بہ حیثیت سکریٹری، کلرک یا ٹائپسٹ کے ان کو بے تکلف جگہ دی جاتی۔ میونسپل انتخابوں میں ان کو ووٹ دیئے جاتے۔ اسمبلی کیلئے بھی بہ حیثیت امیدوار کھڑے ہونیکی ان کو ترغیب دی جاتی۔ چنانچہ آج انگورا میں کئی خواتین ڈاکٹر اور وکیل ہیں۔ اور دو عورتوں کو غازی پاشا نے حکومت کی طرف سے جج مقرر کیا ہے۔ اور چار خواتین قسطنطنیہ کی میونسپل کونسل کی رکن منتخب ہوئیں۔ اور اکثر خواتین اس وقت انہی حقوق کے ساتھ جو مردوں کو حاصل ہیں "پیپلز پارٹی" کی ممبر بھی بنیں۔ ایک ایسے ملک میں جس میں صدیوں سے ایشیائی پردہ رائج تھا اور جہاں خواتین گھر کی چاردیواری سے نکلنا معیوب سمجھتی تھیں جمہوریہ کے قائم ہونے کے صرف سات برس بعد عام خواتین کا ہر اعتبار سے اس قدر ترقی کر جانا حقیقتاً تعجب انگیز ہے۔

اسی سال یعنی یکم نومبر ۱۹۲۷ء کو غازی پاشا دوسری مرتبہ چار برس کیلئے صدر جمہوریہ ترکیہ منتخب ہوئے۔ اگرچہ گرینڈ نیشنل اسمبلی نے یہ چاہا تھا کہ غازی کو ساری عمر کیلئے ترکی جمہوریہ کا صدر نامزد کر دے لیکن غازی پاشا نے اسے منظور نہیں کیا۔

باب ۳۱

ترکی رسم الخط میں تبدیلی اور جہالت کیخلاف منظم جہاد

غازی پاشا نے ترکی میں پے در پے انقلابی اصلاحات تو نافذ کرنی شروع کردیں۔ لیکن چونکہ اس سارے انقلابی پروگرام کی کامیاب تکمیل صرف اسی وقت ہو سکتی تھی جب عام ترکوں میں اس کے قبول کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے۔ اور ملک میں تعلیم کے ذریعہ اس قدر روشن خیالی بڑھ جائے کہ پھر اس اصلاحی پروگرام کو رجعت قہقہری کا مطلق اندیشہ نہ رہے جس وقت غازی پاشا نے اپنا اصلاحی پروگرام جاری کیا ہے اس وقت سارے ترکی میں پڑھے لکھوں کی تعداد صرف پندرہ فی صدی تھی، اور یہ ملک کی عام جہالت کا ایسا خوفناک ثبوت تھا کہ اس کی موجودگی میں کسی پروگرام کے تکمیل کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اپنی اصلاحی اسکیم کے ساتھ ہی ساتھ غازی پاشا نے ملک کی عام جہالت کے خلاف بھی منظم جہاد شروع کر دیا۔ دیہات اور قریوں تک میں بچوں اور بڑوں کیلئے سیکڑوں ابتدائی مدارس قائم کر دئیے اور ہر ترک کیلئے تعلیم کو لازمی قرار دیدیا۔ تعلیم کا پچھلا نصاب بدل گیا۔ اور اس کے بجائے نہایت آسان اور سہل نصاب تعلیم رائج کر دیا گیا۔ اور ان ترکوں کیلئے جو دن کو فکر معاش میں مصروف رہا کرتے تھے ملک کے طول و عرض میں نائٹ اسکول کھول دیئے اور ان سب مدرسوں اور نائٹ اسکولوں کی

لیٹن حروف کی مشق

آتاترک کی یادگار قسطنطنیہ میں
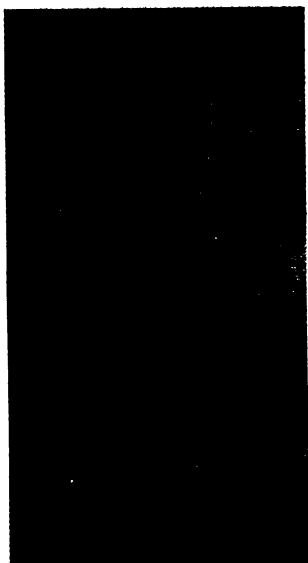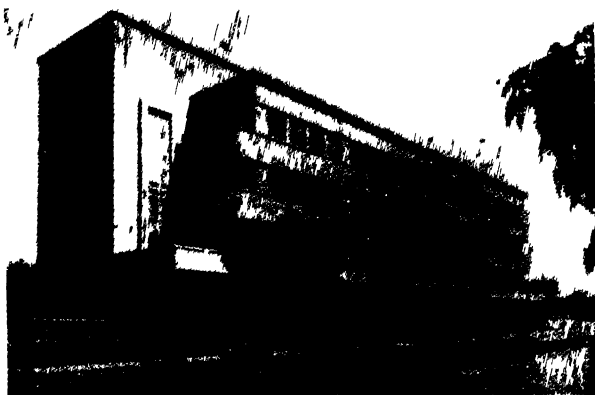
عصمت اینونو گرلز اسکول انقرہ

انقرہ میں آتا ترک کا اسٹیچو
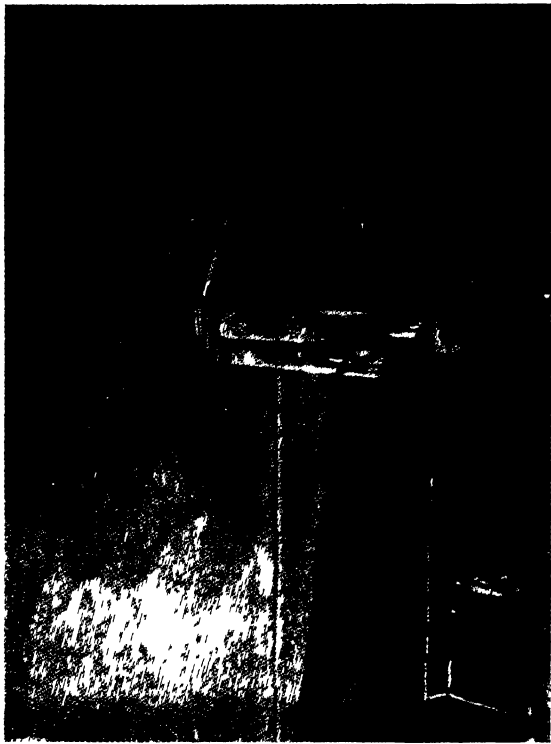
نگرانی اور انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا۔ غازی پاشا کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر اصلاحی تحریک کی بذاتِ خود رہنمائی کرتے اور اپنی شخصی نگرانی میں اسے پروان چڑھتا ہوا دیکھتے۔ ان مدرسوں اور اسکولوں کی نگرانی کا کام بھی انھوں نے اپنے ہی ہاتھ میں لیا، جگہ جگہ دَورے کیے، طالب علموں کا وظیفوں اور انعاموں سے دل بڑھایا۔ پڑھانے والے اسٹاف پر اپنے فرائض کی تکمیل کے سلسلہ میں بہت سختی سے نگرانی رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہی برس کی سرگرم کوششوں کے بعد ترکی میں پڑھے لکھوں کا تناسب بقدر پانچ فیصدی بڑھ گیا۔ لیکن غازی پاشا جو برق صفت تیزی سے ہر تحریک کو کامیاب دیکھنا چاہتے تھے اس نتیجہ سے مطمئن نہیں ہوئے انھیں تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں کوئی ایسی خامی اور خرابی محسوس ہوئی جس کی وجہ سے نتیجہ اس قدر کمزور رہا۔ سوچتے سوچتے انھیں محسوس ہوا کہ ترکی کی ابجد اور ترکی کا رسم الخط یہ دونوں تعلیم کی عام نشر و اشاعت میں حارج ہیں۔ کیونکہ اول تو خود ترک بچوں کیلئے اپنے رسم الخط اور ترکی ابجد پر حاوی ہوتا بہت مشکل ہوتا ہے اور جب مہینوں ریاض کے بعد اس مشکل پر قابو پاکر وہ رسم الخط اور ابجد سے واقف ہو جاتے ہیں تو انھیں دوسری یورپین زبانوں کے حاصل کرنے میں ان کے اپنے رسم الخط سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے ان کو ترکی زبان حاصل کرنے کیلئے مشقت کرنی پڑتی ہے اور اس کے بعد انھیں دوسری زبانوں کے حروف اور رسم الخط سے مانوس ہونے کیلئے پھر ابتدا سے محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس دوہری محنت میں ایک تو عمر عزیز کا ایک بڑا حصّہ ضائع ہو جاتا ہے۔ دوسرے ترکی اور یورپین زبانوں کے رسم الخط کی اجنبیت انھیں صحیح معنوں میں کسی خاص سمت میں ترقی نہیں کرنے دیتی۔ ترکی زبان میں وہ بیشک طاق ہو جاتے ہیں لیکن کسی یورپین

زبان سے اس حد تک مانوس نہیں ہوتے کہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اس کے علاوہ رسم الخط کی اس اجنبیت سے ترکوں میں اپنے مشرقی نژاد ہونیکا احساس بھی تازہ رہتا ہے۔ جس کے باعث وہ یورپ کی مہذب اقوام، ان کی زبان، ان کے رسم ورواج، ان کے تمدن اور معاشرت کی خوبیوں سے بے تکلف نہیں ہوسکتے۔ اس خیال کے آتے ہی غازی پاشا نے ترکی زبان کیلئے ایک موزوں رسم الخط تجویز کرنے کے لئے ترکی ادیبوں کی ایک کمیٹی بنا ڈالی۔ اور انھیں حکم دیا کہ وہ اس مسئلہ میں جلد سے جلد حکومت کے آگے اپنی رائے پیش کریں۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں وسطی ایشیا میں روس کی ماتحت چھوٹی چھوٹی جمہوریتوں کی "باکو" میں ایک لسانی کانفرنس ہوئی تھی اور اس کانفرنس میں تاتاری اقوام فی تاتاری النسل زبانوں کیلئے لاطینی رسم الخط منظور کرلیا تھا۔ چنانچہ غازی پاشا نے ترکی ادیبوں کو یہ ہدایت کی کہ وہ باکو کانفرنس کے فیصلوں کو بنیاد قرار دیکر ترکی زبان کی ابجد کے لئے "لاطینی" کے متناسب بدل تجویز کردیں۔ کئی دن تک غازی پاشا کی صدارت میں ان ترکی ادیبوں کی کانفرنس ہوتی رہی۔ اور غازی پاشا خود روزانہ کئی گھنٹے نئی ترکی ابجد کے تعین کے لئے کام کرتے رہے۔ تاآنکہ ابجد مکمل ہوگئی اور غازی پاشا اس نئے رسم الخط کے استاد اول کی حیثیت سے عام ترکوں کو از سر نو ترکی زبان پڑھانے کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔

رسم الخط کے متعلق غازی پاشا کے اس فیصلہ نے ابھی عملی صورت اختیار نہیں کی تھی کہ اسلامی ممالک میں غازی پاشا کے اس فیصلہ پر پھر کسی قدر

بے چینی کا اظہار ہونے لگا۔ ان ممالک کی دلیل یہ تھی کہ ترکی میں انتہائی انقلابی اصلاحات کے نفاذ کے باوجود رسم الخط کی یکسانیت کے باعث ترکی کا ممالک اسلامیہ سے ایک رشتہ ضرور قائم تھا، لیکن اس فیصلہ کے بعد وہ آخری رشتہ بھی منقطع ہو چلا جو ترکی کو عالمِ اسلام سے جوڑے ہوئے ہے۔
لیکن غازی پاشا کے پاس لاطینی رسم الخط کی حمایت میں ایک اور صرف ایک دلیل تھی۔ اور وہ یہ کہ "اب ترکی مذہبی تعلقات اور جذبات سے علیحدہ ہو کر اپنا وجود دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں ان کا اپنا نقطۂ نظریہ ہے کہ بیرونی اثر سے علیحدہ ہو کر ہر مسئلہ میں صرف ترکی مفاد کا خیال رکھیں"
غازی پاشا کی اس مضبوط دلیل کے بعد اسلامی ممالک میں پھر ایک دفعہ خاموشی چھا گئی۔ اور اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

ترکی میں نئے لاطینی رسم الخط کو روشناس کرانے کیلئے غازی پاشا نے ۱۹۲۸ء کی گرمیوں کا موسم اور ترکی کے قدیم پایہ تخت قسطنطنیہ کو پسند کیا۔ چنانچہ غازی پاشا نے حکم دیا کہ سارے سرکاری دفاتر اب کی گرمیوں میں عارضی طور پر قسطنطنیہ میں منتقل ہو جائیں۔
۱۹۱۹ء کے بعد غازی پاشا پہلی مرتبہ قسطنطنیہ پہونچے تھے، لوگ جوشِ محبت میں دیوانے ہو گئے۔ ترکی کے نجات دہندہ کے اعزاز میں جگہ جگہ کمانیں بنائی گئیں، رنگ برنگ کی بیرقوں سے عمارتوں اور دکانوں کو سجایا گیا۔ اور آرائش وزیبائش سے سارے شہر کو دلھن بنا دیا۔ باسفورس کے ساحل پر قدم رکھتے ہی غازی پاشا کے اعزاز میں ایک سو ایک توپوں کی سلامی ہوئی اور

ساحل سے قصر دولمہ باغچہ تک جو ترکی سلاطین کی پرانی قیام گاہ تھی، اور جس میں غازی پاشا کے قیام کا انتظام تھا، سڑک کے دونوں طرف لاکھوں ترکوں نے قطار در قطار غازی کی پذیرائی کی۔

قسطنطنیہ پہونچنے کے دو دن بعد غازی پاشا نے قسطنطنیہ کے ہر طبقہ کو دعوت نامے بھیجے۔ محل کے بڑے ہال میں ان سب کی نشستوں کا انتظام کیا گیا۔ ان میں اسمبلی کے ممبر، حکومت کے افسر، اخباروں کے نامہ نگار۔ اسکولوں کے ماسٹر، سوسائٹی کی خواتین، جج، وکیل اور تاجر سب ہی موجود تھے۔ ہال کے ایک سرے پر ایک پلیٹ فارم بنایا گیا تھا۔ اس پر عصمت پاشا مع اپنے ماتحت وزیروں کے بیٹھے تھے۔ بیچ میں غازی پاشا کی نشست تھی ان کی داہنی طرف مارشل فیضی اور بائیں جانب کاظم پاشا صدر اسمبلی بیٹھے ہوئے تھے۔ اور پلیٹ فارم کے ایک سرے پر ایک کالا بورڈ اور ایک چاک کا ڈبہ رکھا ہوا تھا۔ جب سب لوگ ہال میں اپنی اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھ گئے تو غازی پاشا نے کھڑے ہو کر پہلے تو مختصر طور پر وہ مقصد بیان کیا جس کے ماتحت قسطنطنیہ کے ہر طبقے کو جمع کیا گیا تھا۔ اس کے بعد عربی رسم الخط کے مقابلہ میں لاٹن رسم الخط کی خوبیاں بتائیں۔ اور بورڈ پر لاٹن رسم الخط میں ترکی ابجد لکھکر حاضرین کو سمجھایا کہ قدیم رسم الخط کے مقابلہ میں اس کا سیکھ لینا کس قدر آسان اور اعلیٰ تعلیم کی تکمیل میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد حاضرین میں سے دو اشخاص کو غازی پاشا نے پلیٹ فارم پر طلب کیا۔ اور نئے رسم الخط میں انھیں بورڈ پر اپنے نام لکھنے کی ھدایت کی۔ ابتدائی تجربہ مکمل ہو گیا عصمت پاشا نے اس موقع پر مزاحاً کہا کہ فوجی جنرل نے اب ھیڈ ماسٹر کا روپ بھر لیا ہے۔"

رسم الخط کی اس تبدیلی کو پڑھے لکھے ترکوں نے فوراً قبول کرلیا۔ اور انھیں اس میں آسانی بھی تھی ۔ اس لئے کہ لاطن رسم الخط سے یہ لوگ ناواقف نہیں تھے ۔ البتہ اُن طبقوں میں جو یورپین زبانوں سے واقف نہیں تھے اس جدید رسم الخط کی ترویج میں کسی قدر دیر لگی ۔ لیکن غازی پاشا کا اصلی مشن یہی تھا کہ ترکوں کے جاہل طبقوں کو بھی اس جدید رسم الخط سے مانوس کردیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی فطری سرگرمی سے اس جدید تحریک کی تبلیغ شروع کردی ۔ اور اپنے سیاہ بورڈ سمیت قریہ قریہ گاؤں گاؤں دَورہ کرکے انھوں نے دیہاتی ترکوں تک میں اس رسم الخط کے سیکھنے کی تحریص پیدا کردی ۔ اس بارے میں غازی کی سرگرمیاں اس قدر پُرجوش اور مخلصانہ تھیں کہ بچے تو بچے جوان اور بوڑھے ترک بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے اور اپنی فرصت کے اوقات میں مسجدوں کے گوشوں، سڑکوں کے کناروں، پارکوں، قہوہ خانوں غرض ہر جگہ سلیٹ پر نئے رسم الخط کی مشق کرتے ہوئے نظر آنے لگے ۔ اور ترکی کے عرض وطول میں ایک نئی سرگرمی اور ایک نیا جوش وخروش پایا جانے لگا ۔ آج تک غازی پاشانے ترکی میں جتنی انقلابی اصلاحیں نافذ کی تھیں ان سب میں زیادہ رسم الخط کی اس تبدیلی کو ترکوں میں مقبولیت حاصل ہوئی اور ترکوں کو یہ یقین ہوگیا کہ حقیقتاً یہ تبدیلی قوم پر دولت وتہذیب کے دروازے کھول دیگی ۔ غازی پاشانے کچھ دنوں قوم کو اس نئے رسم الخط کی مشق کرنیکی مہلت دیدی ۔ اس کے بعد ایک تاریخ مقرر کرکے یہ اعلان کیا کہ اس تاریخ کے بعد ترکی دفاتر، تجارتی کمپنیاں خانگی ادارے، اخبار، غرض خانگی اور سرکاری اداروں میں " ترکی " لاطن رسم الخط میں لکھی جایا کرے ۔ اسی کے ساتھ اسمبلی میں غازی پاشانے ایک قانون منظور کروایا ۔ جس میں لاطن رسم الخط کو سرکاری رسم الخط تسلیم کرلیا ۔ اور

اور ہر سرکاری ملازم کیلئے اس کا جاننا ضروری قرار دیدیا گیا۔

سرکاری خرچ سے جگہ جگہ ایسے ادارے قائم کر دیئے گئے جہاں مصروف اشخاص فرصت کے اوقات میں رسم الخط کی مشق کر سکیں۔ پولیس کو خاص طور پر ھدایت ہوئی کہ بے پڑھے لکھے ترک جہاں کہیں مل جائیں انھیں پکڑ کر ان قومی اداروں کے حوالہ کر دیں۔ جیل کے افسروں کو حکم دیا گیا کہ کوئی قیدی اس وقت تک نہ چھوڑا جائے جب تک وہ ترکی کے جدید رسم الخط سے مانوس نہ ہو جائے۔ اس طرح غازی پاشا نے ترکی سے جہالت کو مار بھگایا۔ آج ترکی کے عرض وطول میں ایک قلی ایک چمار بھی ایسا نظر نہیں آتا جو لٹن رسم الخط سے مانوس نہ ہو۔

اسمبلی نے غازی پاشا کے اس کارنامہ کا اعتراف رسم الخط کے جدید قانون کی پہلی دفعہ میں اس طرح کیا ہے۔

"ترکی قوم کے استاد اوّل، صدر جمہوریہ ترکیہ اعلیٰحضرت غازی مصطفےٰ کمال ہیں"

اخباروں اور رسالوں نے اس جدید رسم الخط کا اس طرح استقبال کیا کہ جدید رسم الخط میں جمہوریہ ترکیہ کے پنج سالہ کارنامے پوری شرح و بسط کے ساتھ پبلک کے آگے پیش کر دیئے۔ اور جنگ سقاریہ کے بعد سے غازی کی قیادت میں ترکوں کی تمدنی، سیاسی اور معاشری ترقیوں کا مفصل نقشہ کھینچ دیا۔ شاعروں اور ادیبوں نے اس موقع پر غازی پاشا کی شان میں قصائد عرض کئے۔ بادی النظر میں یہ اگرچہ پرانے شاہی وقتوں کے سے تکلفات معلوم ہوتے ہیں لیکن انہی سے غازی پاشا کی طرف ترکوں کے

صحیح رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس موقع پر ترکی گرینڈ نیشنل اسمبلی کے نائب صدر نے بھی غازی پاشا کی شان میں ایک قطعہ کہا تھا اور لاطینی رسم الخط میں لکھکر غازی کے حضور میں پیش کیا تھا۔ اس قطعہ کا اُردو ترجمہ یہ ہے :-

غازی جب سپہ سالار تھے اور قوم مُسلح تھی
ہم نے فتح دشمن کے ہاتھوں سے چھین لی
اور اب کہ غازی استاد اور قوم شاگرد ہے
ہم نے جہالت کو ملک سے مار بھگایا !

باب ۳۲

کردوں کی دوسری بغاوت اور ملاؤں کی شورش

اندرونی اور بیرونی شورشوں کو کچل ڈالنے کے بعد صرف تین برس یعنی ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک کا زمانہ غازی پاشا کو ایسے اطمینان کا مل سکا کہ وہ اپنے بنائے ہوئے نقشے پر ترکی کی دوبارہ تعمیر پر متوجہ ہو سکے۔ اور اس ذرا سے عرصہ میں حیرت انگیز مہارت اور معجزانہ تیزی سے اناطولیہ جیسے ٹھیٹ ایشیائی حصہ میں نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے انقلابی پروگرام کی داغ بیل ڈالدی اس عرصہ میں غازی پاشا نے اناطولیہ میں سیکڑوں معاشی اور تمدنی اور ہزاروں چھوٹی بڑی اصلاحیں کر ڈالیں۔ اور اس کامیابی کے ساتھ کہ انگورا اور اس کا نواح منقلب اور ایک اعلیٰ درجہ کا متمدن یوربین علاقہ معلوم ہونے لگا۔

لیکن غازی پاشا کی ان مسلسل کامیابیوں سے اگر ایک طرف یورپ اور ایشیا میں ان کی ذات اور ان کی طرز حکومت کے مداحوں کا حلقہ بڑھتا جارہا تھا تو دوسری طرف ان کے دشمنوں اور مخالفوں کے دلوں میں حسد کی آگ بھی پوری تیزی سے بھڑکنے لگی تھی۔ غازی کو ہمہ تن اصلاحات کی طرف متوجہ دیکھکر انھوں نے غازی کی ذات اور ترکی جمہوریہ کو اُلٹنے کی ایک آخری اور منظم کوششیں شروع کردیں۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء کے آخر میں کردوں

نے پھر خلافت کا سوال اٹھایا۔ اور ایرانی اور ترکی سرحد پر ترکی جمہوریت کے خلاف پوری تیزی سے بغاوت کی آگ بھڑکنے لگی۔ کردوں کی بغاوت کے ساتھ ہی شام کی سرحد پر جو فرانس کے زیر اقتدار تھی ارمنوں نے سر اٹھایا اور ترکی کے علاقہ میں اپنی سازش کا جال بچھا دیا۔ دوسری طرف کمیونسٹوں نے جن کو غازی پاشا نے ابتدا ہی میں کچل دیا تھا اور جو سمرنا میں چپکے چپکے زور پکڑے جا رہے تھے، مزدوروں کو ترکی جمہوریت کے خلاف ابھار دیا اور ان سے سمرنا کے کارخانوں میں ہڑتالیں کرا دیں۔ ان ہنگاموں سے فائدہ اٹھا کر انجمن اتحاد و ترقی کے ممبر اور غازی پاشا کے ذاتی مخالف جو ۱۹۲۶ء کی دارو گیر سے بچ رہے تھے۔ پھر میدان میں اتر آئے اور اب کے درویشوں اور ملّاؤں کی فوج بھی اپنے ساتھ لائے۔ جن کا مشن یہ تھا کہ وہ قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں دورہ کر کے ترکوں کے مذہبی جذبات کو غازی پاشا کی ذات کے خلاف بھڑکائیں اور ترکی جمہوریت کو الٹ کر ترکی میں خلافت کا دوبارہ قیام ممکن بنا دیں[1]۔

غرض اس مرتبہ ترکی جمہوریت کیخلاف ہر طرف سے ایک ایسا شدید طوفان اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی کہ ترکی جمہوریہ کا وجود صحیح معنوں میں خطرہ میں پڑ گیا۔

---

[1] اس موقع پر یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریہ ترکیہ کے خلاف اس مرتبہ نہایت منظم طور پر شورش برپا کی گئی تھی۔ اور ارمنوں کے سرمایہ کی قوت نے بڑے بڑے مقدسین کوں کے قدم بھی ڈگمگا دیئے تھے۔ ارمنوں نے اپنے روپیہ سے نہ صرف مذہبی ترکوں کو خرید لیا تھا۔ بلکہ مفلس کردوں کو بھی باہر سے ترکی جمہوریہ پر حملہ کر دینے پر آمادہ کر لیا تھا۔

دسمبر ۱۹۳۰ء کا ایک واقعہ ہے کہ اناطولیہ کے ایک شہر "ممنن" میں ایک درویش شیخ محمدؒ نے اپنے مہدی ہونیکا دعویٰ کیا۔ اور اعلان کیا کہ وہ ترکی اور ترکوں کو اس لامذہب جمہوریت سے آزادی دلائیگا۔ اس نے اپنا اس مشن کی اطراف کے دیہاتوں میں خوب خوب تبلیغ کی۔ اور تھوڑی ہی دنوں میں اپنے مریدوں کا ایک اچھا خاصا جتھا تیار کر لیا۔ ایک دن یہ درویش شیخ محمد "ممنن" کے ایک میدان میں غازی پاشا اور ترکی جمہوریت کے خلاف تقریر کر رہا تھا کہ ایک پولیس افسر نے اسے ٹوکا۔ شیخ محمد کے ساتھیوں نے اس افسر کو پکڑ لیا۔ اور خود شیخ محمد نے بھرے جلسے میں اس افسر کو ایک کُند تلوار سے ذبح کر ڈالا۔ چنانچہ خود ساختہ مہدی کی اس حرکت کے بعد ہی انگورا حکومت کو ہوش آیا اور شورش کی صحیح صورت حال کا اسے احساس پیدا ہوا۔

اصل میں ملاؤں اور درویشوں کے اس حد تک زور پکڑ جانیکی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ غازی پاشا نے ان اصلاحات کے نفاذ کے ساتھ ہی ملک میں پریس اور پلیٹ فارم کی بھی پوری آزادی دیدی تھی، اور ترکی پارلیمنٹ میں بھی ایک حریف پارٹی (Republican Lebrol) قائم کر دی تھی جس کے لیڈر فتحی بے تھے۔ ان کی قیادت میں یہ پارٹی پارلیمنٹ میں آزادی کے ساتھ حکومت پر نکتہ چینیاں کرتی تھی اور پریس پوری آزادی سے ان کی حمایت میں پروپیگنڈا کرتا تھا۔ اور بعض صورتوں میں خود غازی پاشا "ریپبلیکین لبرل" کے ممبروں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ چنانچہ اس پارٹی میں نہ صرف غازی پاشا کے اکثر دوست شریک تھے بلکہ ان کی بہن مقبولہ اور منہ بولی صاحبزادی عفت بھی شریک تھیں۔ لیکن عام ترکوں میں اصلاحات سے مانوس ہونے کے باوجود اتنی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ سیاست کے مختلف نظریوں

پر رواداری سے غور کرتے۔ غازی پاشا کی اس رواداری اور ڈیموکریٹک طرز حکمرانی کو وہ حکومت کی کمزوری سمجھے اور غازی پاشا کے مخالفوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر درویشوں کی مدد سے جو پہلے ہی سے غازی پاشا اور ترکی جمہوریہ سے جلے ہوئے تھے۔ عوام میں حکومت کے خلاف بدگمانی پھیلانی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگورا اور اس کا نواح تو محفوظ رہا۔ لیکن اناطولیہ کے اندرونی حصہ میں انھیں اپنے پروپیگنڈے کا موقع مل گیا اور قونیہ سے ادالیہ اور سمرنا تک دیہاتوں اور شہروں میں حکومت کے خلاف باقاعدہ شورش پیدا ہوگئی جس سے ارمنوں اور کردوں کی بغاوت کو بہت مدد ملی۔

غازی پاشا نے جب دیکھا کہ ملک میں شورش خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے اور ارمنوں اور کردوں کو اس سے کافی مدد پہونچ رہی ہے اور ملک کا معمولی قانون ان فسادیوں کے انسداد میں ناکام ثابت ہو رہا ہے تو انھوں نے ایک دفعہ پھر دستوری حکومت کو معطل کر کے ملک میں مارشل لا جاری کر دیا۔ اور حکومت کے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ کردوں کی سرکوبی کیلئے جنرل صالح پاشا کی کمان میں پندرہ ہزار ترکی فوج بھیجی۔ جس نے اس مرتبہ کردوں کو پوری طرح کچل کر رکھدیا۔ اور پھر پلٹ کر اس فوج نے شام کی ترکی سرحد سے ارمنوں کا صفایا کر دیا۔ اسی کے ساتھ غازی پاشا نے سمرنا کے سارے کمیونسٹوں کو گرفتار کر کے انھیں جیل خانہ بھیجدیا۔ "ممن" کے خود ساختہ مہدی اور اس کے ۲۸ ساتھیوں کو گرفتار کر کے قسطنطنیہ میں پھانسی دیدی۔ بغاوت اور شورش کا پوری طرح خاتمہ ہو گیا۔ جب تبریزی

سے ترکی جمہوریہ کے خلاف یہ طوفان اٹھا تھا اسی تیزی سے دب گیا۔ ترکی سرحدیں ہمیشہ کیلئے دشمنوں سے صاف ہوگئیں۔ اناطولیہ کے دیہات فسادی درویشوں اور سازشی مخالفوں سے پاک ہو گئے۔ اور ملک میں ایک مرتبہ پھر امن و امان قائم ہوگیا۔ اس سے فارغ ہوتے ہی غازی پاشا نے "پیپلز پارٹی" کی طرف توجہ کی اس پارٹی کے اکثر ممبر بوڑھے ہو چکے تھے اور بہت سے نالائق اور نا اہل جمع ہوگئے تھے۔ ان سب کو غازی پاشا نے نکال باہر کیا۔ پیپلز پارٹی ان کے نزدیک نہ صرف ایک پارلیمنٹری پارٹی تھی بلکہ یہ ملک کی ایک اصلاحی جماعت بھی تھی۔ اور اس کا فرض تھا کہ وہ پارلیمنٹ کے باہر عوام میں اپنے اصلاحی پروگرام کو جاری رکھے اور عوام کو اس سے مانوس کرے۔ اس اعتبار سے غازی پاشا اس پارٹی میں صرف ایسے ہی ممبر رکھنا چاہتے تھے جو قابل بھی ہوں، اصلاحی اسکیم کو کامیاب بنانے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں اور پارلیمنٹ کے اندر نہایت اچھے مقنن بھی ثابت ہوں۔

پیپلز پارٹی کی اصلاح سے فارغ ہوکر غازی نے اسمبلی کی طرف توجہ کی۔ مارشل لا کی مدت ختم ہو چکی تھی اور ملک میں پھر دستوری حکومت قائم ہوگئی تھی۔ غازی پاشا نے پرانی اسمبلی کو تحلیل کر دیا اور نئے اسمبلی کے انتخابات کا حکم دیا۔ اس انتخاب میں پیپلز پارٹی کے علاوہ مزدور ممبروں، پیشہ وروں کے نمائندوں اور تاجروں کے لئے بھی گنجائش رکھی۔ اور ایسے آزاد ممبروں کو کھڑے ہونے کا موقع دیا جو پیپلز پارٹی سے متفق نہ تھے۔ اور ان ممبروں کو حکومت پر نکتہ چینی کرنے کی پوری پوری آزادی دیدی اور حکومت کی مشین بالکل ڈموکریٹک طرز پر پھر نہایت اطمینان سکون اور ہم آہنگی سے چلنے لگی۔

باب ۳۴

دول یورپ سے دوستانہ معاہدات

(سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۳۲ء تک)

کردوں اور ارمنوں کی بغاوت اور ملاؤں کی شورش کو پوری طرح کچل دینے کے بعد غازی پاشا نے سلطنت کے داخلی اور خارجی استحکام کی طرف توجہ کی۔ خلیفہ عبدالعزیز کے زمانہ سے ترکی دول یورپ کا مقروض چلا آرہا تھا۔ ان میں سے اکثر قرضے غازی پاشا نے تسلیم کر لئے اور قرض خواہ ملکوں کی قسطیں مقرر کر دیں۔ اور باقی سارے پُرانے حسابوں کو چاک کر کے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اس طرح ترکی پُرانے قرضوں اور قرضوں کے ساتھ دول یورپ کی مداخلت سے ہمیشہ کیلئے آزاد ہو گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر غازی نے ترکی کے خارجی معاملات پر توجہ دی۔ اب ترکی کی کسی سے لڑائی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ یونان سے بھی اُسے کوئی پرخاش نہیں رہی تھی۔ اور روس جو صدیوں سے ترکی کا مانا ہوا دشمن چلا آتا تھا وہ اب غازی پاشا اور ترکی جمہوریہ کا نہایت گہرا دوست تھا۔

غازی پاشا کے سیاسی تدبّر اور بلند شخصی کیریکٹر کا یہ نہایت تابناک ثبوت تھا کہ ابھی جنگ اناطولیہ کی گونج فضا میں اچھی طرح تحلیل نہ ہونے پائی تھی اور وہ زخم جو وحشی یونانیوں نے ترکی پر لگائے تھے ابھی پوری طرح

مندمل بھی نہونے پائے تھے کہ خود غازی پاشا نے مصامامضاکہہ کر یونان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ اور ترکی پرس اور پلیٹ فارم سے یونانیوں کیخلاف ہر قسم کی نشر واشاعت کی سختی سے ممانعت کر دی، اناطولیہ کے میدانوں سے وہ نشانات تک مٹا ڈالے جو یونان کی ہزیمت اور قومی ذلت کے مظاہر تھے اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک امریکن مدبّر نے جو ترکی ہیں سیاحت کے لئے آیا ہوا تھا غازی سے میدان سقاریہ دیکھنے کی خواہش کی جہاں یونانیوں سے وہ عظیم الشان جنگ لڑی گئی تھی جس نے نہ صرف ترکی بلکہ سارے ایشیا کی قسمت کو پلٹ دیا تھا لیکن غازی نے یہ کہکر اُسے روک دیا،۔

"اب یونان کی دوستی ھمارے نزدیک ان جنگی

یادگاروں سے زیادہ عزیز اور قیمتی ہے"

غازی پاشا کا یہی وہ عدیم المثال شریفانہ احساس تھا جس نے یونان کو غازی کا بندۂ بے دام بنا دیا۔ اگلی پچھلی ساری ناگوارشکایتیں دُھل گئیں۔ اور یونان نے نہ صرف ترکی سے معاہدۂ مودّت کر لیا بلکہ اپنے آپ کو پوری طرح ترکی کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء کے بعد سے دول یورپ نے حیرت کے ساتھ یہ تماشا دیکھا کہ لیگ اقوام میں ترکی اور یونان کا نمائندہ ایک ہے۔

یونان کے بعد غازی نے ریاستہائے بلقان سے معاہدے کئے۔ اور بلقان فیڈریشن کی ایک اسکیم تیار کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ آئندہ سے ریاستہائے بلقان اپنے اختلافات خود ہی مل بیٹھ کر طے کر لیا کریں گے۔ اور ان کے اندرونی جھگڑوں میں دولِ یورپ کو مطلق مداخلت کا موقع نہ دیا جائیگا۔

اور رفتہ رفتہ ریاستہائے بلقان کو ترکی سے مانوس کرنیکی پالیسی اختیار کی گئی۔ ترکی سرحدیں چونکہ برطانیہ اور فرانس کے زیر اقتدار علاقوں سے ملی ہوئی واقع ہیں اس لئے ان دونوں سے بھی دوستانہ تعلقات قائم کئے گئے۔ اسی کیساتھ ممالک اسلامیہ میں عراق، ایران، مصر اور افغانستان سے بھی دوستی قائم کی گئی۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۰ء میں والی افغانستان امان اللہ خاں بھی اپنی سیاحت یورپ کے سلسلہ میں غازی پاشا سے ملنے اور ترکی اور افغانستان کی دوستی پر مہر مودت ثبت کرنے آئے اور یہیں سے وہ افغانستان کی سماجی اصلاح کا خیال اپنے دماغ میں لے گئے تھے۔ لیکن افسوس کہ وہ افغانستان کے درویشوں کو زیر نہ کرسکے بلکہ خود اُن کا شکار ہو گئے اور ان ہی اصلاحات کی بدولت انھیں افغانستان کا تخت چھوڑنا پڑا۔ والئ افغانستان کی طرح والئ ایران رضا شاہ پہلوی نے بھی غازی پاشا سے تعارف حاصل کرنے کیلئے ترکی کا سفر کیا تھا۔ اور یہ بھی ان سے ملاقات کے بعد معاشری اور سماجی اصلاح کا خیال اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ رضا شاہ پہلوی البتہ ایران کی اصلاح میں امان اللہ خاں سے زیادہ کامیاب رہے اور بڑی جد وجہد کے بعد انھوں نے ایران کو غازی پاشا کی چند انقلابی اصلاحات سے مانوس کرڈالا۔

ان اسلامی تاجداروں کے علاوہ یونان اور ریاستہائے بلقان کے ذمہ دار وزراء بھی غازی کے سلام کو انگورا حاضر ہوئے تھے اور عصمت پاشا ترکی حکومت کی طرف سے یونان گئے تھے جہاں یونانیوں نے نہایت شان سے ان کا جلوس نکالا۔ اس طرح غازی پاشا نے اپنی خارجی حکمت عملی

کی بدولت ہر طرف اخلاص اور دوستی کی فضا پیدا کر دی۔ بلکہ سیاسی اعتبار سے ترکی کو اس درجہ معزز بنا دیا کہ کبھی سلاطین عثمان کے زمانے میں بھی اس کی دول یورپ میں یہ رفعت و عزت نہیں ہوئی تھی۔

---

۴ مئی ۱۹۳۱ء کو تیسری مرتبہ قوم نے غازی پاشا کو صدر جمہوریہ منتخب کیا اور ترکی نظم و نسق کی اصلاح کیلئے کلی اختیارات دیدیئے۔ غازی پاشا نے ایک طرف تو عالم اسلام اور دول یورپ سے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے دوسری طرف ترکی فوج اور ترکی پولیس کی تنظیم کی طرف توجہ کی۔ ترک ایک جنگ جو قوم ہے۔ لیکن صدیوں سے یہ جذبہ ان میں سویا ہوا تھا۔

یونانیوں سے جنگ کے زمانہ میں غازی نے ترکوں میں پہلی مرتبہ اس جذبہ کو جگایا اور اس کے بعد جب ترکی جمہوریہ متشکل اور مستحکم ہو چکی تو انھوں نے ساری ترک قوم میں جنگی جذبہ کو برقرار رکھنے کیلئے ایک قانون بنا ڈالا جس کی رُو سے ہر نوجوان ترک کیلئے تین برس کی فوجی تربیت ضروری قرار دی۔ مقصد اس تحریک کا یہ تھا کہ اگر ترکی کو جنگ کی ضرورت پیش آ جائے تو ہر ترک باشندہ سپاہی ثابت ہو سکے۔

باقاعدہ ترکی سپاہیوں کی از سر نو تنظیم شروع کی انھیں جدید آلات حرب کے استعمال کی مہارت دلائی گئی۔ نئی اور شاندار وردیاں ان کیلئے تجویز کیں۔ اور ہر قسم کے نئی طرز کے اسلحہ سے مسلح کر کے ان میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا گیا۔ اسی کے ساتھ فضائی اور بحری بیڑوں کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ سلطان وحیدالدین کے زمانہ میں ترکی بیڑہ برائے نام رہ گیا تھا۔ غازی پاشا نے متعدد جنگی اور تجارتی جہاز برطانیہ سے خریدے

اور ترکی بیڑے کی باقاعدہ تشکیل کردی۔ ہوائی جہاز جرمنی سے خریدے اور رفتہ رفتہ ان کا بھی ایک مؤثر مدافعتی بیڑہ قائم کردیا۔ ترکی نوجوانوں کے لئے فضائی اور بحری بیڑوں کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا گیا اور انگورا اور سمرنا میں فوجی کالج کھولے گئے جن میں فضائی اور بحری خدمات کے لئے ترکوں کو سندیں دی جاتی ہیں۔ فوجی تعلیم کا نصاب زیادہ مکمل اور زیادہ بلند کردیا گیا۔ اور ابتدائی فوجی مدرسوں اور کالجوں میں ایسی وطنی فضا پیدا کردی کہ ہر ترک سپاہی اور افسر ایک نئے نشے میں سرشار نظر آنے لگا۔ ترکی فوجوں کی تنظیم اور جنگی مہارت کا تجربہ کرنے کے لئے ہر سال ترکی میں مصنوعی جنگ ہوا کرتی ہے۔ جسے غازی خود ملاحظہ فرمایا کرتے ہیں۔

فوج کے ساتھ پولیس کی تنظیم کا کام بھی بہت سرگرمی سے شروع ہوا اور اس کی تنظیم بھی فوجی لائنوں پر کی گئی۔ پولیس پر غازی کے نزدیک دوہری ذمہ داریاں تھیں۔ ایک ملک کا انتظام قائم رکھنا دوسرے جنگ کی صورت میں فوج کے ساتھ غنیم سے لڑنا اس لئے جدید طرز پر اس کی ترتیب کا انتظام ہوا اور فرائض اور ذمہ داریوں سے پوری طرح واقف اور باخبر رکھنے کے لئے نئے ٹریننگ اسکول کھولے جس میں پولس کے ہر شعبہ کی مکمل اور انتہائی تعلیم کا انتظام رکھا گیا۔ اس ٹریننگ اسکول کی سند بغیر کوئی ترک پولیس میں داخلہ حاصل نہیں کرسکتا۔ ۱۹۳۲ء کے آخر میں ایک انگریز سیاح نے جو ترکی کی نئی حکومت اور اس کا داخلی انتظام دیکھنے انگورا آیا تھا ترکی پولس کے متعلق یہ رائے ظاہر کی کہ "انگورا کی پولس اپنے فرض شناسی کے اعتبار سے اسوقت یورپ کی اکثر تربیت یافتہ سلطنتوں کی پولس سے بہتر ہے"

باب ۳۴

ترکی نام اور زبان کی اصلاح

۱۹۳۴ء سے لیکر ۱۹۳۷ء تک یعنی چار سال کا زمانہ امن وسکون اور اطمینان اور فارغ البالی کے ساتھ گذرا۔ اندرونی یا بیرونی ہر قسم کی شورش سے بیفکر ہو کر غازی پاشا پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ، ملک کے نظم ونسق کی درستی حکومت کے مختلف شعبوں کی اصلاح اور اپنے انقلابی پروگرام کی تکمیل میں مصروف رہے۔ غازی پاشا کی ان ساری اصلاحات کا مقصد ایک اور صرف ایک تھا۔ اور وہ یہ کہ ترکی ہر اعتبار سے صرف ترکوں کیلئے مختص رہے اور اپنی امتیازی شان کے ساتھ صحیح معنوں میں ترکوں کا وطن بن جائے۔ اور انھیں اپنے اس خیال پر اس درجہ اصرار تھا کہ وہ ترکی آداب ومعاشرت اور رسم ورواج تک میں مانگے تانگے کا کوئی حقیر سے حقیر جز بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ترکی زبان تک کو بھی جس میں صدیوں سے ایرانی اور عربی زبانوں کے بیشتر الفاظ گھل مل چکے تھے اور ایسے الفاظ جن کے بدل ترکی میں نہ مل سکتے تھے غازی پاشا نے غیر ملکی الفاظ سے پاک کر دیا۔ اور ان الفاظ کے ترکی ہی میں نئے اور عام فہم بدل وضع کر ڈالے۔ اس معاملہ میں غازی پاشا کو سو فیصدی کامیابی اصل میں اپنے وفادار دوست اور جاں نثار ساتھی مارشل فیضی اور جنرل عصمت پاشا کی ذاتی سرگرمیوں کے باعث ہوئی جو خود بھی نہایت سخت متعصب ترک واقع

ہوئے تھے اور غازی کی طرح ترکی سے ہر غیر ملکی عنصر کو خارج کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں عصمت پاشا کے متعلق یہ لطیفہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے پارلیمنٹ میں ایسی ٹھیٹ ترکی زبان میں تقریر کی کہ پارلیمنٹ کے اکثر ممبران کی صورت ہی دیکھتے رہ گئے اور ایک لفظ بھی اس تقریر کا ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ غرض رفتہ رفتہ ترکی زبان سے عربی اور ایرانی الفاظ کو خارج کرنیکا کام کامیابی سے مکمل ہو چکا تھا اور جو لفظ خارج کر دیئے گئے تھے ان کے ٹھیٹ ترکی بدل بھی اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ ملک میں مقبول بنائے جا چکے تھے۔ لیکن ترکوں کے نام اور سلطانی زمانہ کے ایرانی اور عربی خطاب ابھی تک ترکی میں باقی تھے۔ بالآخر انکی طرف بھی غازی پاشا کی توجہ ہوئی اور ۲۶۔ نومبر ۱۹۳۴ء کو ترکی پارلیمنٹ نے ایک نیا قانون منظور کیا۔ جس کی رُو سے آغا، مختار، پاشا اور بے کے خطابوں کا استعمال ممنوع قرار دیدیا گیا۔ اور عربی الاصل ناموں کو بدل دینے کی ھدایت کی گئی۔ گویا ترکی جمہوریہ کا ہر مرد "بے" اور ہر خاتون "بیگم" ہو گئی "خانم" کا استعمال ترک کر دیا گیا۔ اس قانون کی تعمیل سب سے پہلے غازی نے کی اور اپنا سارا نام اور سارے خطاب جس کا ہر ہر لفظ عربی الاصل تھا ترک کر دیئے۔ البتہ کمال کا ہم مخرج ایک ترکی لفظ موجود تھا جس کے معنی "فولاد" یا "مسلح" کے تھے اس لئے صرف وہ باقی رکھا گیا۔ جس دن غازی نے اپنا نام اور خطاب ترک کرنیکا اعلان کیا۔ اسی دن گرینڈ نیشنل اسمبلی نے قوم کی طرف سے ایک ترکی خطاب "اتاترک" غازی کی خدمت میں بکمال عقیدت اور ممنونیت پیش کر دیا جس کو غازی نے نہایت خوشی سے قبول کر لیا۔ اس دن کے بعد سے ترکی جمہوریہ کا صدر 'کمال اتاترک' کہلاتا ہے۔ 'اتاترک' کے لغوی معنی ہیں۔

'بڑا ترک'۔ اور اصطلاحاً یہ لفظ سردار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

صدر جمہوریہ کے نام کے بعد ترکی کے موجودہ پایہ تخت کا نام ترکی بنا لیا گیا اور وہ انگورا سے "القرہ" ہوگیا۔ دول یورپ اور ایشیا کو نام کی تبدیلی کی باقاعدہ اطلاع دی گئی۔ اور عام طور پر یہ اعلان کر دیا گیا اگر کسی خط پر اس اعلان کے بعد بھی انگورا لکھا ہوگا تو وہ مکتوب الیہ کو تقسیم نہ کیا جائیگا بلکہ ضائع کر دیا جائیگا۔ اسی کے ساتھ کچھ دنوں بعد افراد کے ناموں کے ساتھ ایک معین خاندانی نام بھی اختیار کرنیکی ھدایت کی گئی جسے ترکی جمہوریہ کے ہر باشندے نے بخوشی منظور کر لیا۔

۲۔ مارچ ۱۹۳۵ء میں چوتھی مرتبہ ترکی پارلیمنٹ کا انتخاب ہوا۔ اور اتاترک چوتھی مرتبہ قوم کی مرضی سے صدر جمہوریہ منتخب ہوئے۔ یہ انتخاب ہر اعتبار سے کامیاب اور با اصول سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس دفعہ کا انتخاب میں ترکوں کو ہر طبقہ سے اپنے نمائندے منتخب کرنیکی پوری پوری آزادی حاصل تھی "پیپلز پارٹی" ہی کے ممبروں کو منتخب کرنیکی کوئی قید نہیں تھی۔ چنانچہ اس دفعہ ترکی کے ہر طبقہ کے آزاد نمائندے ترکی پارلیمنٹ میں پہونچ گئے۔ اور پہلی مرتبہ ترکی پارلیمنٹ میں سترہ ترکی خواتین بھی بحیثیت ممبر ایوان میں داخل ہوئیں۔ جن کا کمال اتاترک نے اپنی افتتاحی تقریر میں بڑے پُرجوش انداز میں خیر مقدم کیا۔ پریس پر سے ہر قسم کی پابندیاں جو پچھلے چند برسوں میں عائد کر دی گئی تھیں اٹھالی گئیں، پارلیمنٹ میں باقاعدہ حریف پارٹی کی تشکیل بھی ہوگئی جسے حکومت کے نظم ونسق پر قاعدہ میں سخت سے سخت نکتہ چینیاں کرنے کی پوری

پوری آزادی حاصل تھی۔ یہی اتاترک کے حریف بھی چاہتے تھے۔ البتہ فرق صرف یہ تھا کہ اتاترک کے سیاسی حریف فی الفور نظم حکومت میں اصلاح چاہتے تھے اور جمہوریت کے بجائے آئینی سلطان کو برقرار رکھنے کے خواہشمند تھے۔ اور اتاترک کو ہمیشہ سے جمہوریت پر اصرار رہا اور طرز حکومت وہ رفتہ رفتہ بدلنا چاہتے تھے۔ تاکہ ترکوں کے ہر طبقہ میں اپنی سیاسی اور سماجی ذمہ داریوں کا صحیح احساس پیدا ہو جائے۔ اور اپنے سیاسی حقوق سے وہ مفید کام بھی لے سکیں۔ چنانچہ جب اتاترک نے دیکھا کہ انکی انقلابی اصلاحات کو ترکوں نے ہضم کر لیا اور وہ اپنی نئی زندگی سے مانوس ہو گئے۔ اور ان میں اتنی سمجھ اور روشن خیالی بھی آ گئی کہ ملک کے مفاد اور مضرات کو اچھی طرح سمجھنے لگے تو انھوں نے فی الفور پریس اور پلیٹ فارم پر سے ہر قسم کی پابندی اٹھالی۔ اور ترکوں کو اپنے انداز پر حکومت کرنے اور ترکی جمہوریہ کی رہنمائی کرنے کیلئے آزاد چھوڑ دیا۔ اہل دانش خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس معاملہ میں اتاترک اور انکے سیاسی حریفوں میں کس کا اصول زیادہ مدبرانہ اور مصلحت اندیشانہ تھا۔

باب ۳۵

درِ دانیال پر ترکی قبضہ

۱۹۳۵ء میں یورپ کی فاسسٹ سلطنتوں اٹلی اور جرمنی نے بغیر کسی خاص وجہ اور سبب کے بڑے پیمانہ پر فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ دیکھکر دولِ یورپ کو بھی اپنی دفاعی پالیسی پر نظر ثانی کرنی پڑی جس کی وجہ سے یورپ کے سیاسی مطلع پر آثار تکدر پیدا ہونے لگے۔ اس موقع پر اتاترک نے ترکی فوجوں کی نئے سرے سے تنظیم کرنی شروع کر دی، فضائی قوت کی طرف خاص طور پر توجہ کی۔ اور بحری بیڑے کو بھی مضبوط بنایا۔ دوسری طرف لیگ اقوام میں اسلامی قوتوں کا ایک جتھا تیار کرنیکی کوشش شروع کر دی۔ اس جتھہ میں ایران، عراق اور افغانستان کو شامل کر لیا۔ اور ایران اور عراق کی سرحدی نزاعوں کو طے کرا دینے کی غازی نے خود ذمہ داری لے لی۔

لوزان کانفرنس میں اور تو سب باتیں اتاترک کی مرضی کے مطابق طے ہو گئی تھیں اور ترکی کو وہ سب کچھ مل چکا تھا جس کا اس نے مطالبہ کیا تھا۔ لیکن دردانیال کے قلعوں پر اس کانفرنس نے ترکی قبضہ تسلیم نہیں کیا تھا۔ اور ابناؤں کو غیر جانبدار قرار دیکر یورپ کی ہر قوم کو ان میں جہاز رانی کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس وقت تو اتاترک نے اس کو منظور کر لیا تھا لیکن یہ فیصلہ انھیں ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکا کرتا تھا اور وہ موقع اور وقت کے منتظر

تھے کہ جیسے ہی انھیں موقع ہاتھ آئے وہ لوزان کانفرنس کے اس فیصلے کو ٹھکرا دیں۔ یہ موقع انھیں جلد ہاتھ آگیا "سار" کے قصہ سے نپٹ کر نازی جرمنی نے ایک طرف آسٹریا میں اپنے اقتدار کو قائم کرنا چاہا اور دوسری طرف رائن لینڈ پر جو معاہدہ ورسائی کے بعد سے فرانس اور جرمنی کے درمیان آزاد علاقہ قرار دے دیا گیا تھا اپنا قبضہ جمانے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ ادھر اٹلی نے بغیر کسی وجہ اور سبب کے حبشہ کی آزاد اور صدیوں کی پرانی سلطنت پر حملہ کر دیا تو اتاترک نے بھی یورپ کے اس سیاسی بحران کو دیکھکر آبناؤں کی حفاظت کا سوال اٹھایا۔ اور ساتھ ہی دردانیال کی دوبارہ قلعہ بندی شروع کر دی۔ جرمنی اور اٹلی کی طرف سے معاہدۂ ورسائی کی صریح خلاف ورزی کے بعد اتاترک کے اس بالکل جائز اور ہر اعتبار سے صحیح مطالبہ کو رَد کر دینا دَول یورپ کے امکان سے باہر تھا۔ چنانچہ لیگ اقوام نے ترکی کے اس مطالبہ کی اہمیت کو تسلیم کر لیا اور معاہدۂ لوزان پر نظر ثانی کرنے کیلئے "مانٹرے" میں معاہدہ لوزان پر دستخط کرنیوالی قوتوں کی ۱۹۳۶ء میں ایک کانفرنس بلائی جس نے دردانیال پر ترکی اقتدار کی توثیق کر دی۔ اس موقع پر ترکی جمہوریہ کے وزیر خارجہ توفیق رشید آراس نے کانفرنس کے سارے ممبروں کو اپنی حکومت کی طرف سے اس جدید معاہدہ پر دستخط کرنے کیلئے سونے کے قلم تقسیم کئے اور انہی قلموں سے اس معاہدہ پر دستخط کئے گئے۔ جیسے ہی اس معاہدہ پر دستخط ہوئے اور دردانیال پر ترکی حکومت تسلیم کر لی گئی، ترکی فوج جو اس غیر جانب دار علاقہ کے دونوں طرف منتظر کھڑی تھی خوشی کے نعرے مارتی ہوئی دردانیال کے قلعہ میں در آئی اور چوبیس برس بعد پھر اس قلعہ کی چوٹی پر ترکی پھریرا لہراتا ہوا نظر آنے لگا۔

جولائی ۱۹۳۶ء میں برطانیہ کے سابق شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم اتاترک سے ملنے ترکی تشریف لائے۔ ترکی قدیم کے پایہ تخت قسطنطنیہ میں اتاترک نے نہایت خلوص اور تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا اور ترکوں نے پورے جوش و خروش سے اپنے مہمان جلیل القدر کو ہاتھوں ہاتھ لیکر یہ ثابت کردیا کہ اب جبکہ ترک ہرطرح آزاد اور اپنا کھویا ہوا وقار واپس حاصل کرچکے ہیں انھیں یورپ کی کسی قوم سے کوئی شکایت نہیں رہی بلکہ اب وہ سب سے مساویانہ تعلقات کے خواہاں ہیں۔ قسطنطنیہ میں ایڈورڈ ہشتم کی تشریف آوری اگرچہ محض تفریحاً تھی اور اس کو مطلق سیاسی حیثیت حاصل نہ تھی تاہم ان کی اس بے تکلف آمد کا ترکوں اور انگریزوں دونوں پر بہت گہرا اثر پڑا اور ان دونوں قوموں کی دوستی پر گویا مہر تصدیق ثبت ہوگئی۔

۲۹۔ اکتوبر کی تاریخ ترکی کے طول و عرض میں قومی عید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس دن ترک نہایت اہتمام سے ترکی جمہوریہ کی سالگرہ منایا کرتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں یہ تاریخ ترکی کے لئے ایک نیا پیام مسرت لائی تھی اس سال آبناؤں پر ترکی حکومت تسلیم ہوجانے کے بعد ترکی کو جنگ عظیم کا مرتبہ حاصل ہوچکا تھا۔ اب گویا ترکی اپنی سرحدوں میں ہرطرح آزاد خودمختار اور سلطانی زمانہ سے زیادہ با اقتدار اور باوقار ہوچکی تھی۔ چنانچہ ترکوں نے اس دن نہایت جوش و خروش اور ایک نئے جذبۂ تفاخر کے ساتھ قومی جشن منایا۔ ترکی کی ساری مسجدوں میں اتاترک اور ترکی جمہوریہ کی سلامتی کی دعائیں مانگی گئیں۔ علی الصبح انگورا کے پریڈ کے میدان میں اتاترک ایک سفید گھوڑے پر سوار کھڑے تھے۔ اور قدیم فوجی دستے جنھوں نے سقاریہ

میں اتاترک کے زیر کمان ترکی کی قسمت کا پانسہ پلٹ دیا تھا اپنے قدیم علم اٹھائے اور فوجی بینڈ کے ساتھ جو "سفاریہ مارچ" بجا رہا تھا اپنے سردار کو جوشِ عقیدت اور وفورِ مسرّت کے ساتھ سلامی دیتے ہوئے گذر رہے تھے۔

باب ۳۶

ترکی جمہوریہ ۱۹۳۸ء میں

۱۹۲۴ء میں اتاترک نے ترکی کی از سرِ نو تعمیر کیلئے جو قومی پروگرام مرتب کیا تھا اس کے دس اجزا رکھے :۔

(۱) ترکی تمدن و معاشرت کی اصلاح
(۲) وسائل اور ذرائع معاش میں اضافہ
(۳) داخلی اور خارجی تجارت کی تنظیم
(۴) ترکی معدنیات کی دریافت اور ان سے استفادہ
(۵) جدید ریلوں اور سڑکوں کی تعمیر
(۶) ملکی مالیہ کا استحکام
(۷) بحری اور فضائی بیڑوں کی از سرِ نو تنظیم
(۸) ترکی فوجوں کی جدید اصول جنگ کے مطابق ترتیب
(۹) جہالت اور توہم پرستی کے خلاف منظم جہاد
(۱۰) آرٹ اور ورزشی کھیلوں کی تعمیم

۱۹۲۴ء سے اس قومی پروگرام کے ہر ہر جزو کی تکمیل پوری سرگرمی سے جاری رہی ۔ اور ۱۹۳۸ء میں ترکی جمہوریہ یہ دعوے کرنے کے قابل ہو گئی ہے کہ پچھلے تیرہ برس میں (جس میں شورش اور بے چینی کا زمانہ بھی شامل ہے)

اس نے اتاترک کا بنایا ہوا پروگرام نہایت کامیابی سے مکمل کر لیا۔

ان داخلی ترقیوں کے ساتھ ساتھ اسی سال ترکی کی خارجی پوزیشن کو بھی یورپ اور ایشیا میں بڑی زبردست تقویت حاصل ہوئی۔

معاہدہ اسد آباد اور معاہدہ ریاستہائے بلقان اسی سال تکمیل کو پہنچے اور اسی سال جمہوریہ ترکیہ لیگ اقوام سے شام کے صوبہ اسکندرونہ پر ترکی سیادت تسلیم کرانے میں کامیاب ہوئی۔

یہاں اس کا موقع نہیں کہ ہم اتاترک کی پچھلی اصلاحی سرگرمیوں کی روشنی میں ترکی کی موجودہ مادی، سیاسی، معاشری اور معاشی ترقیوں کی مفصل اور سیر حاصل روئداد مرتب کر دیں۔ البتہ قارئین محترم کی خاطر ۱۹۳۸ء کی ترکی کا ایک مجمل سا خاکہ پیش کئے دیتے ہیں۔ جو پچھلے ابواب کے مطالعہ کے بعد غالباً موجودہ ترکی کو صحیح طور پر سمجھنے میں مدد دے سکے گا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ترکی کی تعلیمی ترقیوں کا ذکر زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سرکاری طور پر لاطینی رسم الخط اختیار کر لینے کے بعد ملک کی جہالت کے خلاف عام جہاد شروع ہوا۔ گاؤں گاؤں، قریہ قریہ ابتدائی مدارس قائم ہوئے۔ نئے کورس تجویز ہوئے اور ترک بچوں کیلئے جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھیں بالترتیب تین اور پانچ برس کی ابتدائی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔

بڑے بڑے شہروں میں ہائی اسکول اور کالج قائم کئے گئے۔ ان کے

علاوہ نارمل ہائی اسکول، انجینرنگ ہائی اسکول، فنون لطیفہ کے مدرسے، زرعی مدارس اور ٹریننگ کالج کھولے گئے، اور لڑکیوں کیلئے "انقرہ" میں ہر اعتبار سے ایک مکمل کالج قائم کیا گیا جو "عصمت انونو" کالج کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۳۷ء تک ترکی میں صرف ایک استنبول یونیورسٹی تھی لیکن ۱۹۳۸ء میں "انقرہ" میں ایک اور یونیورسٹی کا افتتاح ہوا اور ۱۹۳۹ء میں سمرنا میں تیسری یونیورسٹی کا افتتاح ہوگا۔

موجودہ ترکی یونیورسٹی کے اساتذہ اور پروفیسروں کے متعلق ایشیاٹک ریویو اپنی دسمبر ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں لکھتا ہے :-

"استنبول یونیورسٹی کے اساتذہ میں ایسے اصحاب ہیں جو اپنے علم وفضل کی وجہ سے یورپ بھر میں مشہور ہیں۔ ان میں سے بیشتر جرمن ہیں جن کو نازی حکومت نے ملک بدر کر دیا ہے۔ لیکچر بالعموم جرمن یا فرانسیسی زبان میں ہوتے ہیں اور نوجوان ترک پروفیسر جو غیر ملکی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہیں ان کا ترجمہ ترکی زبان میں کر دیتے ہیں۔ ان اساتذہ سے یہ معاہدہ ہے کہ چار برس بعد ترکی زبان میں لیکچر دیا کریں گے۔"

سلاطین آل عثمان کے زمانہ میں ترکی عدالتیں کافی بدنام تھیں۔ اور قیام جمہوریت کے وقت بھی عدالتوں کا کوئی باقاعدہ نظم ونسق اور تنظیم و ترتیب نہ تھی لیکن ۱۹۳۸ء کی ترکی عدالتیں یورپ کے کسی مہذب ملک کی عدالتوں سے کسی حیثیت سے بھی پیچھے نہیں ہیں۔ مقدمات میں بیجا طوالت

اور ججوں کی رشوت ستانی کی داستانیں اب قصہ پارینہ ہیں ، نہ صرف اب مقدمات کے انفصال میں بے وجہ تعویق غیر آئینی قرار دی جاتی ہے بلکہ ایسے فیصلوں پر بھی جو اپیل میں ٹوٹ جاتے ہیں ججوں پر کافی نگرانی ہوتی ہے اور یہ جانچا جاتا ہے کہ کوئی جج استحصال ناجائز کیلئے عمداً غلط فیصلے کرنیکا تو عادی نہیں ہے ؛ ترکی میں ججوں پر یہ ایسی پابندی ہے کہ اس کی نظیر سارے یورپ میں نہیں مل سکتی ۔ اس نگرانی کا اثر یہ ہے کہ آج ترکی میں انصاف کوڑیوں کے مول اور منٹوں میں حاصل ہو جاتا ہے ۔ جس سے ترکوں کی اخلاقی حالت پر نہایت اچھا اثر پڑا ہے ۔

جیل خانے اور تادیب خانے یورپ کے مہذب سے مہذب ملک میں بھی زندہ جہنم سمجھے جاتے ہیں ۔ لیکن ترکی جمہوریہ نے قید خانوں اور تادیب گاہوں میں بھی اصلاحات نافذ کی ہیں اور یہ ایسی اصلاحات ہیں کہ ان کی نظیر یورپ کے کسی شہر میں پیش نہیں کی جا سکتی ۔

ترکی جیلوں کے اندر قیدیوں سے بالکل آزاد شہریوں کی طرح سلوک کیا جاتا ہے ۔ انھیں جیل خانہ کے اندر اپنے ذاتی صنعت و حرفت کے کارخانے قائم کرنے ، مصنوعات کی دکانیں لگانے ۔ کاروباری ادارے کھولنے کی عام اجازت ہے ، تاکہ ان میں کاروبار سے دلچسپی اور محنت سے کمانے کا جذبہ پیدا ہو جائے ۔ اور وہ بدنصیب جو بری صحبتوں یا اتفاقات کی بدولت زندانوں میں ڈال دیئے گئے ہیں پھر سے نیک معاش شہری بن کر جیلوں سے نکلیں اور اپنی قوم کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ نہ بنے رہیں ۔

قیدیوں کی اصلاح کا پروگرام یورپ کے اکثر ممالک میں اس وقت رائج ہے۔ لیکن جس قدر کامیابی سے جیل کی اصلاحیں ترکی میں رائج ہیں ان کی نظیر آج کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتی۔ ایک انگریز سیّاح کا بیان ہے کہ :۔

"جیل کی ان اصلاحوں نے ترکی کے مجرمین کے دماغوں پر جو اثر کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ترکی میں برابر ہر سال سات سے دس فیصدی مجرموں کی کمی ہوتی جارہی ہے۔"

جمہوریہ ترکی کے قبضہ میں مجرمین کا ایک جزیرہ بھی ہے جس میں لمبی میعاد کے قیدی بھیجدیئے جاتے ہیں۔ یہاں اس وقت چارسو قیدی ہیں اوران قیدیوں پر صرف دو سپاہی نگراں ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جیل کی اصلاحات ترکی میں کس حد تک کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔

ترکی ہمیشہ سے ایک زرعی ملک سمجھا جاتا ہے لیکن قیامِ جمہوریہ کے بعد سے اتاترک نے اس کو صنعتی حیثیت سے بھی ترقی دینی شروع کی اور ۱۹۳۴ء میں ملک کے آگے ایک مکمل پانچ سالہ صنعتی پروگرام پیش کر دیا اوراس پروگرام کی تکمیل کیلئے سرکاری خزانہ سے باقاعدہ اور مستقل امداد دینی منظور کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومی صنعت میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ تاآنکہ ابھی اس پروگرام کے پانچ سال ختم نہیں ہونے پائے ہیں کہ ملک کی مصنوعات نے ڈیڑھ کروڑ ترکی آبادی کی پچاس سے اسّی فیصدی تک ضروریاتِ زندگی پوری کرنی شروع کر دیں۔

اتاترک کا پانچسالہ قومی صنعتی پروگرام ذیل کے پانچ حصوں پر منقسم تھا:۔

(۱) پارچہ بافی کے کارخانے (جو سوتی، ریشمی اور اونی کپڑے بنایا کریں)۔

(۲) کاغذ بنانے والے کارخانے (جن میں ہر قسم کا کاغذ اور سلولائڈ بنا کرے)۔

(۳) کھانڈ بنانے والے کارخانے (جن کے سپرد گنے کی کاشت بھی کردی گئی)۔

(۴) بلّور بنانے والے کارخانے (جو گلاس بوتلیں اور شیشے کے دیگر ظروف بنائیں)۔

(۵) کیمیائی مصنوعات بنانے والے کارخانے (جن میں دوائیں اور دیگر قیمتی مرکبات بنا کریں)۔

ان صنعتی اسکیموں کو سرمایہ کی امداد دینے کا کام "سومر بنک" کے سپرد ہوا۔ سومر بنک کو ترکی میں سرکاری بنک کی حیثیت حاصل ہے یہ ۱۹۳۳ء میں قائم ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ ترکی کی صنعت و حرفت کو ترقی دینے میں امداد کرے۔ اس بنک کا اصلی سرمایہ دو کروڑ ترکی پونڈ تھا لیکن حکومت نے ۱۹۳۴ء میں اس کا سرمایہ بڑھا کر سوا چھ کروڑ ترکی پونڈ کردیا۔ اور جب تک صنعتی پروگرام ختم نہ ہولے اس وقت تک مزید چھ لاکھ ترکی پونڈ کی سالانہ امداد سے دینی منظور کرلی۔ اس بنک کی ماتحتی میں دوسرے ہی سال کپڑے اور کاغذ کے آٹھ زبردست کارخانے قائم ہوگئے جن سے اس وقت ترکی کی اسی فی صدی ضرورت پوری ہورہی ہے۔ اسی طرح کاغذ کے جو کارخانے قائم ہوئے تھے

ان سے ترکی کی پچاس فیصدی ضروریات پوری ہونے لگیں اور کھانڈ کے کارخانوں نے تو اتنی ترقی کی کہ اب ترکی کو اپنے خرچ کیلئے باہر سی کھانڈ درآمد کرنے کی مطلق ضرورت نہیں رہی۔ ان کارخانوں کے قیام سے ایک طرف ترکی کی ضروریات زندگی پوری ہو رہی ہیں۔ دوسری طرف ملک میں بیکاروں کا نام ونشان باقی نہیں رہا ہے۔

اس صنعتی پروگرام کے ساتھ ساتھ اتاترک نے ترکی معدنیات کی دریافت اور قومی ضروریات کیلئے ان سے استفادہ کا کام بھی شروع کر دیا۔ معدنیات کیلئے بحر مارمورا کے کنارہ کا علاقہ جو "ولایت زنگل ڈگ" کہلاتا ہے بہت مشہور ہے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں اس علاقہ سے ۲۲ لاکھ ۸۸ ہزار ٹن کوئلہ حاصل کیا گیا جس کی مقدار ہر سال برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے بعد تانبا، پیتل، لوہا، سیسہ اور گندھک کی کانیں دریافت ہوئیں۔ یہ کانیں زیادہ تر ترکی کے مشرقی علاقہ میں پائی جاتی ہیں۔ خاصکر تانبے کی کانیں بہت قیمتی ثابت ہو رہی ہیں۔ اور توقع ہے کہ ان کانوں سے ہر سال پندرہ لاکھ ۲۰ ہزار ٹن تانبا حاصل کیا جا سکے گا۔ اس وقت صرف تانبے سے ترکی حکومت کو ۲۸ لاکھ ترکی پونڈ سالانہ حاصل ہو رہے ہیں۔ لیکن امید ہے کہ یہ رقم بہت جلد دوگنی ہو سکے گی۔ تانبہ کے بعد گندھک کا نمبر ہے۔ چنانچہ اس وقت ۱۵ لاکھ ٹن گندھک اس علاقہ سے حاصل کی جا رہی ہے۔

اس صنعتی ترقی اور معدنی دریافت کے پہلو بہ پہلو ترکی کی زرعی ترقی بھی حیرت انگیز ہے۔ قابل کاشت زمینیں جو قیام جمہوریہ کے وقت مشکل سے

ایک کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ پر مشتمل تھیں۔ اس وقت ان کی تعداد تین کروڑ ایکڑ ہے۔ جنگل جہاں سے نہایت قیمتی لکڑی۔ ترکی کو حاصل ہوتی ہے ایک کروڑ ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے اور دو کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ چراگاہوں کیلئے وقف ہے۔ ترکی پیداوار میں گیہوں، جو اور رتبا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ زیتون کے علاوہ ترکی علاقہ میں باغات بھی ہیں۔ یہاں کے پھل باہر بکثرت برآمد ہوتے ہیں۔ اور جمہوریہ ترکی کو اس سے بہت کچھ مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے پھلوں کی کاشت میں ۱۹۳۴ء کے بعد سے ۵۰ فیصدی اضافہ ہو گیا ہے۔ اور توقع ہے کہ اس میں اور زیادہ اضافہ ہو گا۔

جدید ریلوں کی تعمیر پر ۱۹۳۵ء کے آخر تک جمہوریہ ترکیہ نے ۲۰ کروڑ ترکی پونڈ خرچ کئے اور ۶۰۰۷ کیلومیٹر لائنیں بنائیں۔ ۱۹۴۰ء تک یہ تعداد ۹۲۰۷ کیلومیٹر ہو جائیگی۔ اس وقت سوائے ایک ریلوے لائین کے ترکی کی ساری ریلوے لائنیں جمہوریہ کی ملک ہیں۔ سڑکوں کی تعمیر پر اس وقت تک جمہوریہ ۷ کروڑ ترکی پونڈ خرچ کر چکی ہے۔ اور اس وقت ۳۰ ہزار کیلومیٹر کی نہایت اچھی سڑکیں ترکی میں موجود ہیں۔ ان میں ایک سڑک ایسی بھی ہے جو استنبول سے بذریعہ خشکی بندرگاہ کیلئے تک جاتی ہے۔

ترکی جمہوریہ میں ان جدید ریلوں اور سڑکوں کا جال سا بچھ گیا ہے اور ان کی تعمیر سے تجارتی رسل و رسائل میں بھی بیحد سہولت ہو گئی ہے۔ اس سے زراعتی مشینوں کو شہروں اور دیہاتوں تک پہنچانے میں مدد ملتی ہے اور دیہاتی کاشتکار بھی آلات جدید سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت ترکی کی عام پیداوار میں جو معتدبہ اضافہ دکھائی دیتا ہے وہ ان ہی

ریلوں اور سڑکوں کی بدولت ہے۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں بس سروس اور موٹر سروس کا سلسلہ قائم کر دیا گیا ہے۔ تاکہ کاروباری ضرورتوں کیلئے لوگوں کی آمدورفت میں دیر اور دقت نہ ہوا کرے۔

باقاعدہ ترکی فوج، جدید آلاتِ حرب سے مسلح اور اعلیٰ تربیت یافتہ دو لاکھ جوانوں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ وہ فوج ہے جس کا اندراج حکومت کے رجسٹروں میں موجود ہے۔ ورنہ ترکی کا آج ہر فرد ایک تربیت یافتہ سپاہی ہے اتاترک کے اس اعلان کے بعد کہ ہر نوجوان ترک کیلئے دو برس کی فوجی تربیت لازمی ہے۔ آج ترکی کی ایک کروڑ ستر لاکھ کی آبادی میں کوئی نوجوان ترک ایسا نہیں بستا جو فوجی نظم وضبط اور سپاہیانہ زندگی سے بیگانہ محض ہو۔ دو لاکھ باقاعدہ ترکی فوج کے ساتھ ۷۰۰ جنگی ہوائی جہاز اور آٹھ ہزار نوجوان ہوا باز ترک بھی جمہوریہ ترکیہ کے پاس موجود ہیں۔ لیکن اتاترک یورپ کی موجودہ فضا کو دیکھتے ہوئے ترکی کی موجودہ ہوائی قوت سے مطمئن نہیں تھے چنانچہ انھوں نے اکتوبر ۱۹۳۷ء کے پارلیمنٹری اجلاس میں ترکی کی ہوائی تنظیم اور جدید ہوائی جہاز خریدنے کیلئے گیارہ لاکھ ترکی پونڈ کی منظوری کی تجویز پیش کی تھی جسے ترکی مجلس ملیہ نے منظور کر لیا۔ اس گیارہ لاکھ کی خطیر رقم سے جمہوریہ ترکیہ نے اپنے فضائی بیڑے کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اور اٹلی اور انگلستان کے کارخانوں کو اس نے بہت سے ہوائی جہازوں کا آرڈر بھی دیدیا ہے۔ اس رقم کے علاوہ ترکی بجٹ میں ستر لاکھ پونڈ فوجی مصارف کیلئے منظور ہوئے ہیں اور ۴۵ لاکھ پونڈ اسلحہ کی خریداری کیلئے علیحدہ نکالے گئے۔

موجودہ ترکی کے تعلقات اپنے پڑوسیوں سے نہایت خوشگوار ہیں ۔ سوئٹ روس سے معاہدہ مودت ہے ۔ حال ہی میں مصر سے بھی باہمی دوستی کا پیمان ہو چکا ہے ۔ بلقان اور اٹلی سے بھی دوستی ہے ۔ اسی سال معاہدہ اسد آباد کے ذریعہ ایران ، عراق اور افغانستان سے بھی رشتہ اتحاد قائم ہو چکا ہے ۔ غرض خارجی طور پر بھی ترکی کی پوزیشن نہایت مضبوط ہے اور دول یورپ اور ایشیا دونوں میں ترکی جمہوریہ اپنا ایک خاص اثر اور اقتدار بھی رکھتی ہے ۔

۱۹۳۶ء کے آخر میں البتہ فرانس اور ترکی میں اسکندرونہ کے معاملہ پر کچھ بدمزگی پیدا ہو گئی تھی اور خیال تھا کہ دونوں حکومتوں کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے لیکن یہ قضیۂ ۱۹۳۸ء کے شروع میں بحسن و خوبی طے ہو گیا اور دونوں حکومتوں کے درمیان تلخی بڑھنے نہ پائی ۔

اسی سال یعنی ۱۹۳۷ء میں ترکی میں دو اور قابل ذکر واقعے گذرے ایک یہ کہ کردوں کے ایک خاص قبیلے نے جن کا سردار شیخ رضا تھا ، جمہوریہ ترکیہ کے خلاف پھر اعلان جہاد کر دیا ۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں انھوں نے حکومت کے خلاف سر اٹھایا لیکن چونکہ کردوں کے دوسرے قبائل ان کے ساتھ نہیں تھے اس لئے یہ بغاوت بڑھنے نہ پائی اور سردار قبیلہ شیخ رضا اور اس کے پندرہ ساتھیوں کو حکومت نے گرفتار کر کے فوجی عدالت کے سپرد کر دیا اور اس طرح اس شورش کا بغیر شور و غل کے نہایت آسانی سے خاتمہ ہو گیا ۔

دوسرا واقعہ جنرل عصمت انونو کے استعفے کا ہے ۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں اتاترک نے عصمت انونو کو چھ ہفتہ کی چھٹی دی اور ان کی جگہ عارضی طور پر

جلال بایار کو جو عصمت کی کیبنٹ میں قومی مالیہ کے وزیر تھے وزیر اعظم مقرر کردیا۔ ابتداءً یہ انتظام عارضی تھا لیکن بعد میں جلال بایار مستقل طور پر ترکی جمہوریہ کے وزیر اعظم مقرر کر دیئے گئے۔ اور انھوں نے اپنی نئی کیبنٹ بنالی۔

عصمت انو نو اتاترک کے نہایت پرانے ساتھی، معتمد دوست اور مددگار ہیں۔ قیام جمہوریہ کے بعد یہ ترکی حکومت کے پہلے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ لیکن کچھ دنوں بعد رؤف بے کیلئے انھوں نے جگہ خالی کر دی۔ لوزان کانفرنس کے بعد انھیں دوبارہ وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اب کے مخالف پارٹی کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے انھوں نے فتحی کے حق میں استعفیٰ دیدیا۔ تیسری مرتبہ یہ ۱۹۲۵ء میں وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ اور اس وقت سے برابر ترکی جمہوریہ کے وزیر اعظم اور اتاترک کے وفادار دوست رہے۔ آخری مرتبہ سات برس تک اتاترک کے ساتھ کام کرنے کے بعد ان کے مستعفی ہونے کے اسباب یہ بتائے جاتے ہیں کہ ستمبر ۱۹۳۷ء میں جب غیر جانب دار کمیٹی کی طرف سے اسپینی بندرگاہوں کی مجوزہ نگرانی کے دوران میں دو روسی تجارتی جہازوں کو کسی "نامعلوم" آبدوز کشتی نے بحر روم میں ڈبو دیا اور اس سلسلہ میں روس اور اٹلی کے درمیان تنازعہ بڑھا تو عصمت انو نو کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں دردانیال میں روس اور اٹلی کی بحری جھڑپ نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ روسی بحری بیڑے کے بحر مارمورا سے بحیرۂ روم میں نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ دردانیال تھا۔ اگر اس راستہ کے آگے اٹلی نے اپنا بحری بیڑہ لا ڈالا تو ظاہر ہے کہ دردانیال کے اندر ہی لڑائی شروع ہو جائیگی اور ترکی غریب کو مفت خدا جنگ میں گھسٹنا پڑیگا۔ یہ اندیشہ پیدا ہوتے ہی عصمت انو نو نے دردانیال کو بند کر دینے کی تجویز پیش کی اور اتاترک کی رائے کے خلاف اسکی تیاری

بھی شروع کردی۔ یہ حرکت اتاترک کی مرضی کے سراسر خلاف تھی جو چاہتے تھے کہ نہایت خاموشی سے حالات کا مطالعہ کیا جائے اور جب تک حالات کا اچھی طرح اندازہ نہ ہولے اس وقت تک کوئی عملی قدم اس سلسلہ میں نہ اٹھایا جائے کیونکہ اس سے خواہ مخواہ ترکی کے عزیز دوست روس کو شکایت پیدا ہوتی اور ترکی کے وقار کو صدمہ پہونچتا۔

چنانچہ بعد کے حالات نے بتایا کہ اتاترک نے صورت حال کا نہایت صحیح اندازہ لگایا تھا اس لئے کہ اٹلی اور روس کی تکرار تو تو میں میں سے آگے نہ بڑھی اور معاملہ دب گیا۔

کہا جاتا ہے کہ اتاترک نے عصمت انونو کی اسی گھبراہٹ کو وجہ قرار دیکر انھیں آرام کرنے کیلئے چھ ہفتہ کی چھٹی دیدی تاکہ ان کا "دماغی انتشار" دور ہوجائے۔ اور ان کے تعجیلی فیصلوں سے ترکی وقار کو نقصان نہ پہونچے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس چھٹی کے بعد عصمت انونو اور اتاترک کے تعلقات ہمیشہ کے لئے خراب ہوگئے۔ اس لئے کہ قیام جمہوریہ کے بعد سے اس قسم کے سیاسی اختلافات اکثر پیدا ہوئے ہیں اور دور بھی ہوتے رہے ہیں لیکن اس سے عصمت اور اتاترک کے ذاتی تعلقات میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ چنانچہ عصمت انونو چھٹی پر جانے سے پہلے اتاترک کی خدمت میں میں حاضر ہوئے تھے۔ اور انھیں یقین دلایا تھا کہ وہ اتاترک کے ہمیشہ وفادار رہیں گے۔ اور اتاترک جو خدمت ان کے سپرد کریں گے اسے وہ بہ خوشی بجالائیں گے۔

جمہوریہ ترکی کے نئے وزیر اعظم جلال بایار پہلے ایک جرمن بنک میں ملازم تھے۔ بعد میں سومر بنک کے قیام کے سلسلہ میں ترکی حکومت نے ان کی خدمات حاصل کیں۔ سومر بنک کے علاوہ ترکی میں تین اور بنک جلال بایار نے قائم کئے اور ان کو ملک کیلئے مفید بنایا۔ ۱۹۳۳ء میں یہ عصمت انونو کی کیبنٹ میں قومی مالیہ کے وزیر مقرر ہوئے۔ اور اس وقت سے برابر نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

جلال بایار اس وقت ترکی میں سب سے بڑے ماہر اقتصادیات سمجھے جاتے ہیں اور اتاترک کو ان کی اقتصادی قابلیتوں پر پورا پورا اعتماد ہے یہ توقع کی جارہی ہے کہ جلال بایار کی نگرانی میں ملک ہر قسم کی معاشی اور اقتصادی کمزوریوں سے پاک ہو جائیگا۔

سوائے عصمت انونو کے ترکی کابینہ میں اور کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی اور اس تبدیلی سے بھی ترکی کی داخلی اور خارجی حکمت عملی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ترکوں کا ایک نصب العین ہے اور اتاترک سے لیکر ایک معمولی کاشتکار تک اپنے اسی نصب العین تک پہونچنے کی کوشش کر رہا ہے کہ ملک میں برابر اصلاح اور ترقی ہوتی جائے۔ اور باہر ترکی کی عزت اور وقار بڑھتا جائے۔

۱۹۳۸ء کی ترکی جمہوریہ کا یہ سرسری خاکہ ہے جسے کمال اتاترک کی پندرہ برس کی جدوجہد کا حاصل یا اس خواب کی تعبیر کہنا چاہیئے جو اتاترک نے ۱۹۲۰ء کے انتہائی مایوس کن حالات میں انقرہ کے زرعی مدرسہ میں دیکھا تھا۔ اس وقت ان کے مخالفوں نے اس کا مذاق اڑایا تھا اور ساتھیوں نے ان کے آہنی عزم کے اعتراف میں بخل سے کام لیا تھا۔ لیکن آج ترکی جمہوریہ

جس انداز سے اتاترک کی قیادت میں اپنی پچھلی روایات کے مقابلہ میں بہت زیادہ معزز اور سربلند حیثیت میں ایشیا اور یورپ کے درمیان کھڑی نظر آرہی ہے اس کو دیکھکر ان کے ساتھی تو ساتھی غالباً ان کے بدترین دشمن بھی اتاترک کی عملی صلاحیتوں کے اعتراف اور انکی شخصیت کے احترام میں اپنا سر جھکانے پر مجبور رہیں ۔

باب ۳۷

یورپ کی موجودہ متلاطم سیاست اور ترکی

۱۹۳۵ء کے آخر میں، حبشہ پر اٹلی کے حملہ کے بعد سے، یورپین سیاست میں ایک تلاطم سا برپا ہے۔ نازی جرمنی اور فاشیت اٹلی کی ہنگامہ آرائیوں نے یورپ کی چھوٹی بڑی "امن پسند" ڈموکراٹک حکومتوں کا خواب و خور حرام کر رکھا ہے۔ لیگ اقوام جس کی "ساکھ" پہلے بھی یورپ کی سیاسی منڈیوں میں کچھ اچھی نہ تھی، پوری طرح دیوالیہ ہو چکی ہے۔ قوموں کی "خواہش امن" انفرادی طور پر اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اجتماعی طمانیت اور "ستاتیو والے" کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنیکا اصول عملاً غلط ثابت ہو چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والے قدیم اصول پر بیدھڑک عمل ہو رہا ہے۔ اور سارے یورپ میں نفسی نفسی پڑی ہوئی ہے۔

جنگ سے گریز اور قیام امن کے جذبے کی شریفانہ حیثیت سے کسی انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ موجودہ حالات میں یورپین قوموں کا یہ جذبہ کہ ہر قیمت پر جنگ سے گریز کیا جائے "مجرمانہ کمزوری کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اور اٹلی اور جرمنی کے قسمت آزما "ڈکٹیٹر" اس کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے محض دھونس ہی دھونس میں یورپ اور ایشیا کا نقشہ بدلتے چلے جا رہے ہیں۔

اٹلی کو نوآبادیات کی اور جرمنی کو خام اشیا کی ضرورت ہے۔ مسولینی "رومن ایمپائر" کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اور ہٹلر وسطی یورپ میں پھر سے "جرمن سلطنت" قائم کرنی چاہتا ہے۔ اس خواہش مشترک کا ظہور "روم برلن محور" کی صورت میں ہوا۔ جو اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ سارے یورپ کو اس کے گرد گھومنے پر مجبور کیا جا سکے۔ اسی کے ساتھ پچھلے سال اس محور کا ایک تیسرا سرا بھی قائم کیا گیا ہے۔ اور یہ تیسرا سرا ٹوکیو ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ یورپ کو "روم برلن محور" کے گرد اور دنیا کی سیاست کو "روم برلن ٹوکیو" کے محور پر گھمایا جائیگا۔

خواہ یہ دعوے کبھی شرمندۂ تکمیل ہو سکے یا نہ ہو سکے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس انتہائی اشتعال انگیز اور جارحانہ سیاست نے خاصکر وسطی یورپ اور مشرق بعید میں ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اور چھوٹی بڑی قوموں کو اس "شیطانی اتحاد" سے اپنے مستقبل کے متعلق سخت خطرہ محسوس ہونے لگا ہے۔"

اسی سال یعنی ۱۹۳۸ء میں "چیمبرلین اور مسولینی" کے دوستانہ معاہدے کے بعد مسولینی کی یہ خواہش پوری ہو چکی ہے کہ اطالوی افریقی مقبوضات کی حفاظت کی خاطر، بحیرۂ روم اور سوئز کنال پر اسے بھی برطانیہ کے ساتھ مساوی اقتدار حاصل ہو جائے۔ اور بظاہر اس معاہدہ کے بعد مسولینی کی ہوس ملک گیری کی تسکین بھی ہو چکی ہے۔ تاہم اگر مسولینی کی ہر دم بدلنے والی حکمت عملی میں پھر کوئی تبدیلی ہوئی تو اس کی زد براہ راست برطانیہ اور فرانس پر ہوگی۔ اور غالباً یہ دونوں سلطنتیں مل ملا کر اس کو بھگت بھی لیں گی۔

لیکن ہٹلر کی تاخت جو وسطی یورپ میں جاری ہے اس کی یہ صورت نہیں ہے
آسٹریا کو چُپ چاپ ہضم کر چکنے کے بعد اب اس کی زد مغربی یورپ کی چھوٹی
چھوٹی قوموں کے ساتھ، بلقان کی ریاستوں اوران ریاستوں سے گذرکر
ترکی جمہوریہ پر پڑنی شروع ہوگئی ہے۔ چیکوسلوبکیا اور ہنگری جو اب آسٹریا
کے خاتمہ کے بعد جرمنی کے قریب ترین ہمسایہ ہیں ان کا مستقبل تو ہے ہی
تاریک لیکن رومانیہ، بلغاریہ اور ترکی بھی نازی شہ سے محفوظ نہیں ہیں کیونکہ
ہنگری کی دیوار منہدم ہونے کے بعد ریاستہائے بلقان کا نازیوں سے سامنا
ہونا ناگزیر ہے۔ اور ریاستہائے بلقان کا سیاسی لیڈر چونکہ جمہوریہ ترکی ہے
اس لئے اس نازی سیلاب کو روکنے کی ساری ذمہ واری عملاً ترکی پر
آپڑتی ہے۔

یورپ کے موجودہ حالات کا یہی منطقی نتیجہ ہو سکتا ہے جو ہم نے اوپر
کی سطروں میں پیش کیا۔ لیکن ابھی اس نتیجہ کے ظہور پذیر ہونے میں بہت
سی ایسی موانعات بھی ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یوربین قوموں کا بگڑا ہوا توازن بہت دنوں قائم نہیں رہ سکتا۔
اور نہ ہٹلر اور مسولینی کی دھونسیں زیادہ دنوں کامیاب ہوسکتی ہیں۔ حالات
اب اس نوبت پر پہونچ گئے ہیں کہ اٹلی اور جرمنی کی طرف سے ہلکی سے ہلکی
بے اعتدالی بھی بارود میں چنگاری کا کام دے سکتی ہے۔ اور یورپ میں پھر
ایک دفعہ جنگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آسکتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو یورپ
کی چھوٹی چھوٹی قوموں کی بغیر لڑے بھڑے قدرتی طور پر حفاظت ہو جائیگی
اور اس وقت ان کے وجود کو جو خطرہ پیدا ہو گیا ہے وہ بڑی خوبی سے ٹل جائیگا۔

آتا ترک کشتی کھے رہے ہیں

مارشل فیضی کمانڈر انچیف افواج جمہوریہ ترکیہ

توفیق رشید آراس سابق وزیر خارجہ ترکی

یہ قیاس ان داؤں گھاتوں پر مبنی ہے جو اس وقت یورپ کی بڑی بڑی قوتوں کے درمیان ہو رہے ہیں اور کچھ زیادہ دور از فہم نہیں ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ترکی جمہوریہ کا بیدار مغز صدر جس کی ساری کامیابیاں ہمیشہ سے ٹھوس منطقی احکام کی منّت پذیر رہی ہیں اس موقع پر بھی کسی قریب از فہم اور قرین قیاس نتیجہ پر حصر کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔

یورپ کے موجودہ حالات کا جو قدرتی نتیجہ ہو سکتا ہے اس کا اتاترک نے صحیح اندازہ کرلیا ہے۔ اور اسی اندازہ کے ماتحت ترکی کے وزیر اعظم جلال بایار اور وزیر خارجہ ڈاکٹر رشدی آراس کو مئی کے دوسرے ہفتہ بلغاریہ بھیجدیا ہے تاکہ ریاستہائے بلقان کو آنیوالے خطرات کے مقابلہ کے لئے ابھی سے تیار کرنا شروع کردیں[1]۔

ریاستہائے بلقان ترکی کا قدیم یورپین جتھا ہے۔ جسے ایک معاہدہ کے ذریعہ متحد کرکے اور اس کی مدافعانہ قوت کو بڑھاکر اتاترک نے جنوبی یورپ کی ایک مؤثر طاقت بنانیکا عزم کیا تھا، چنانچہ یہ اسی عزم کا نتیجہ ہے کہ بلقان کی ریاستیں اس وقت بلا کسی استثناء کے پوری طرح متحد ہو چکی ہیں۔ اور

---

[1] یہ مسودہ جون ۱۹۳۸ء میں مکمل ہو چکا تھا جب اتاترک زندہ اور اپنی قوم کی قیادت فرما رہے تھے۔ لیکن حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ ۱۹۳۹ء سے پہلے اس کے چھپنے کی نوبت نہ آسکی اور اب جبکہ یہ مسودہ پریس کو جارہا ہے میں ان سطروں کو قلم زد نہیں کرنا چاہتا اس لئے کہ اب بھی میرے نزدیک اتاترک ہی ترکی کی قیادت فرمارہے ہیں۔ اگرچہ وہ اس وقت دنیا میں باقی نہیں ہیں لیکن ترکی میں وہی روح کام کررہی ہے جو وہ پیدا کرگئے تھے۔ (مرتب)

ترکی قیادت میں ان کی فوجی تنظیم بھی جاری ہے جو وقت پر کسی یورپی حملہ آور کے مقابلہ میں یقیناً اپنے وجود کی حفاظت کر سکیں گی۔

ترکی کی اس حکمت عملی سے نہ صرف بلقانی ریاستوں کے بقا کی ضمانت ہو گی بلکہ خود ترکی کی یوریپین سرحدیں بھی حملہ آوروں سے محفوظ ہو گئیں اور وسطی اور جنوبی یورپ میں ترکی کی ساکھ بھی بڑھ گئی۔

ریاستہائے بلقان کی طرح آتا ترک نے مشرق میں بھی ایک حلیف "اسلامی جتھا" قائم کیا ہے۔ چنانچہ پچھلے سال معاہدۂ اسد آباد کی تکمیل کے بعد افغانستان، ایران اور عراق ترکی کے ساتھ ایک رشتۂ اخوت و مودت میں منسلک نظر آنے لگے ہیں۔ لیکن اس اتحاد شرق کے پہلو میں ایک 'خار' بھی ہے جو کچھ دنوں سے برابر کھٹک رہا ہے اور یہ "وحدت عربیہ" کا تخیل ہے۔ جس کی موجودہ رفتار سے بجا طور پر یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر اس خیال کے مبلغین نے زیادہ احتیاط اور ہوشمندی سے کام نہ لیا تو آگے چل کر یہ شاید عرب اور غیر عرب مسلمانوں کے درمیان افتراق کی مستقل خلیج بن جائیگا۔ اور اتحاد شرق کی پالیسی کو سخت نقصان پہونچائیگا۔

"وحدت عربیہ" کا تخیل دراصل یوریپین دماغوں بلکہ زیادہ صحیح یہ کہ خالص برطانوی دماغوں کی پیداوار ہے۔ جنگ عظیم میں جب نوجوان ترک جرمنی کی طرف جھک گئے تو برطانیہ نے ترکی کی قوت کو توڑنے کے لئے عرب میں "وحدت عربیہ" کے نام سے ایک چال بازانہ تحریک شروع کی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ "اتحاد عرب" کے نام سے عربوں کو ترکی سلطنت کی خلاف اُبھارا جائے۔ اور "ریاستہائے متحدہ عربیہ" کا سبز باغ دکھا کر

اس "وحدت اسلامیہ" کے ٹکڑے اُڑا دیئے جائیں جو مدت سے ترکی سلطنت کے زیر سایہ (خواہ برائے نام ہی سہی، بہرحال) قائم تھی۔ اور جس کا نام لے لیکر ترک سلاطین جو خلیفۃ المسلمین بھی کہے جاتے تھے۔ اکثر یورپ کو ڈرایا کرتے تھے۔

برطانیہ کو اپنے اس مقصد میں بہت جلد اور بڑی آسانی سی کامیابی ہوگئی۔ اس لئے کہ عرب خون میں یہ جراثیم پہلے سے موجود تھے۔ اور جنگ عظیم ہی کے دوران میں حجاز، شام، فلسطین، عراق اور شرق اردن ترکی اقتدار سے آزاد ہو گئے۔ اور جنگ کے بعد ان علاقوں میں برطانیہ اور فرانس کے ماتحت برائے نام عربی ریاستیں قائم کردی گئیں۔ لیکن فلسطین پر برطانیہ نے اپنا انتداب قائم رکھا تاکہ ۱۹۱۶ء میں برطانیہ نے یہودیوں سی اس ارض مقدس کے متعلق جو وعدہ کرلیا تھا اُسے پورا کیا جاسکے۔ قصّہ طویل ہے مختصراً یوں سمجھئے کہ ترکی کی حیاتِ نو، اور ان عربی ریاستوں کے قیام کے بعد "وحدت عربیہ" کی تحریک جو حقیقتاً ان عربی ریاستوں کو ترکی سلطنت سی علیحدہ کرنیکی باقی ہوئی تھی، خود ان نومولود ریاستوں کی اندرونی سیاست میں الجھ کر غائب ہوگئی۔ اور ایسی غائب ہوئی کہ کسی کو یہ یاد بھی نہیں رہا کہ ایسی کوئی تحریک کبھی عالم وجود میں آئی بھی تھی۔ شامیوں میں البتہ اس تحریک کا نام کبھی کبھی سننے میں آتا تھا وہ بھی فرانس کے مقابلہ میں اور اپنی داخلی سیاست کی اصلاح کے سلسلہ میں ورنہ جنگ عظیم کے بعد "وحدت عربیہ" کی تعمیری کوشش سنجیدگی کے ساتھ کسی عرب علاقہ سے شروع نہیں کی گئی۔

لیکن ۱۹۳۵ء میں جب اتاترک نے اپنا "اتحاد شرق" کا پروگرام اسلامی ممالک کے آگے پیش کیا۔ اور جنیوا لیگ میں اپنی زیر قیادت ایک مشرقی

جتھا قائم کرنا چاہا اور اس مطلب کیلئے عراق ، ایران اور افغانستان کے نمائندوں سے بغداد میں گفت وشنید بھی شروع کر دی ۔ تو دنیا نے حیرت کے ساتھ یہ تماشہ دیکھا کہ " وحدت عربیہ " کی تحریک ، جس کو بھولے ہوئے بھی لوگوں کو ایک مدت ہو گئی تھی حجاز کے " حضرت جلالۃ الملک " کو یکا یک یاد آ گئی ، جنھوں نے اپنی پچھلی بھول کے کفارے کے طور پر اس تحریک کو " اتحاد شرق کے مقابلہ میں تازہ دم ہو کر خوب خوب ہوا دی ۔ اور اس معاملہ میں جو کمی ان سے رہ گئی تھی اسے شام نے پورا کر دیا ۔ شام کے عربوں اور ترکوں میں پہلے ہی سے کچھ رنجش چلی آتی تھی ، اس تحریک نے اس کی بڑھانی میں خاصی مدد دی ۔ اور اتحاد شرق پر تو اس کا کچھ اثر ہوا نہیں البتہ شام اور ترکی جمہوریہ کے تعلقات ہمسایہ ہونے کے باوجود برادرانہ نہ رہے ۔

پچھلے باب میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ صوبہ اسکندرونہ کا قضیّہ لیگ اقوام نے ترکی کے حسب منشا طے کر دیا تھا ۔ اور اس پر ایک حد تک ترکی اقتدار بھی تسلیم کر لیا تھا ۔ لیکن لیگ اقوام کے اس فیصلہ کے باوجود اس سال سنجق اسکندرونہ کی خود اختیاری حکومت کے انتخاب کا وقت آیا تو شامی ترکوں اور عربوں میں تصادم ہو گیا ۔ ارمینیوں نے بھی جو ترکی سے نکالے جانیکے بعد یہاں آ بسے ہیں اور جو اسی لئے ترکوں کے جانی دشمن بنے ہوئے ہیں اس ترک عرب جھگڑے کو خوب خوب ہوا دی اور فرانسیسی حکومت نے جسے غیر جانب دار رہنا چاہیئے تھا ایسا رویّہ اختیار کیا جس سے عربوں کو شہ ملتی تھی ۔ غرض یہاں حالات رفتہ رفتہ ایسے بگڑے کہ ترکی اور فرانس کے سیاسی تعلقات میں بدمزگی پیدا ہونیکا اندیشہ ہونے لگا تھا لیکن

ترکی اور فرانس کے ذمّہ دار مدبّرین نے اس صورت حال پر بہت جلد قابو پا لیا۔ اور سنجق اسکندرونہ کے آئینی انتخابات بلا شکایت مکمل ہو گئے۔

اسکندرونہ کے حالیہ عرب اور ترک جھگڑے میں دراصل وہی "وحدت عربیہ" والا تخیل کارفرما تھا، شامیوں کو یہ ہرگز پسند نہ تھا کہ سنجق اسکندرونہ کا علاقہ جس سے ترکی ۱۹۲۱ء اور بعد کو ۱۹۲۶ء کے معاہدہ کی رُو سے دست بردار ہو چکا ہے پھر اس کے زیر اقتدار آجائے لیکن ۱۹۳۶ء میں جب شامیوں کی قومی جدوجہد کے باعث یہ طے ہو گیا کہ شام کو خود اختیاری حکومت دیدی جائے تو اسکندرونہ کے ترکوں کے تمدن اور ان کے سیاسی نظم ونسق کی حفاظت کیلئے یہ ضروری ہوا کہ خود اسکندرونہ کو بھی حکومت خود اختیاری دیدی جائے۔ اور شام اور لبنان کے ساتھ ملا کر ان تینوں علاقوں کی ایک فیڈریشن بنا دی جائے۔ اور یہی وجہ تھی کہ شامی اپنی مرضی کے خلاف لیگ کے اس فیصلہ کو ماننے پر مجبور ہو گئے۔

ترکی کے گرد و پیش کی سیاست کا یہ مختصر سا خاکہ ہے جو پچھلے اوراق میں پیش کیا گیا ہے۔ اور مقصود اس سے یہ ہے کہ ترکی کی موجودہ سیاسی صورت حال پوری طرح روشنی میں آجائے اور قارئین کو بطور خود یہ اندازہ کرنے میں آسانی رہے کہ آئندہ جنگ یا صلح دونوں صورتوں میں ترکی کی پوزیشن کیا ہوگی؟

حقیقت یہ ہے کہ ترکی جمہوریہ کی جائے وقوعہ اپنی جغرافیائی حیثیت سے جس قدر اہم ہے اسی قدر نازک بھی ہے۔ دُنیا کے دو سب سے بڑے خطوں (براعظموں) کا یہ نقطہ اتصال ہے اور یورپ اور ایشیا کی سیاست

اور تمدن دونوں سے اس کا براہ راست تعلق بھی ہے۔

ایک ملک، ایک قوم اور ایک تہذیب کی حفاظت اس قدر مشکل نہیں جس قدر دو مختلف تہذیبوں کی کش مکش میں کسی ملک اور قوم کی حفاظت مشکل ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے جمہوریہ ترکیہ کی انفرادیت عزت و وقار کے ساتھ اسی وقت قائم و برقرار رہ سکتی ہے جب اس کو مشرق اور مغرب کی سیاسی اور تمدنی کش مکش سے بالاتر ثابت کیا جائے اور یہ واقعہ ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اتاترک کی مدبرانہ قیادت نے اس وقت ترکی جمہوریہ کو ہر حیثیت سے جس مرتبہ بلند پر پہونچا دیا ہے وہ ہر قسم کی کش مکش سے ارفع اور بڑی حد تک حوادثِ روزگار کی زد سے محفوظ ہے اور رہیگی۔

انشاء اللہ تعالےٰ!

آتا ترک کے
جنازہ کا
جلوس
قسطنطنیہ
میں

اتا ترک کی آخری آرام گاہ انقرہ میں
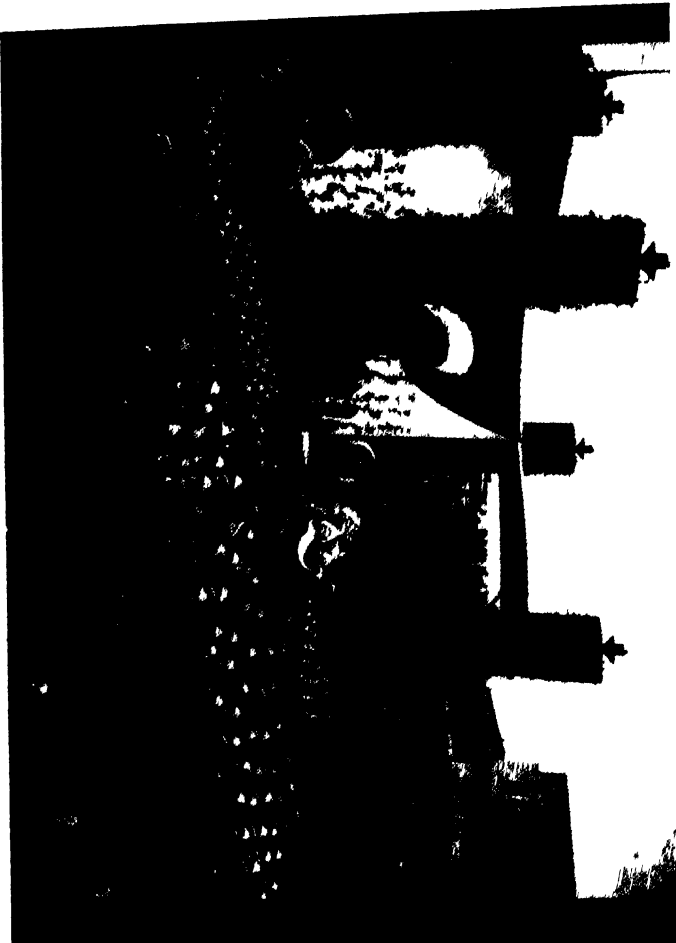
باب ۳۸

سوگوار ترکی

اتاترک نے ترکی جدید کا جو نقشہ ۱۹۲۴ء میں بنایا تھا ۱۹۳۸ء میں وہ پایہ تکمیل کو پہونچ چکا اور اس کی تکمیل کے ساتھ اتاترک کا وہ مقصد بھی بدرجۂ کمال پورا ہوگیا جس کے باعث انھوں نے ترکی انقلاب کی رہنمائی کی تھی۔

تاریخ میں بہت کم شخصیتیں ایسی ہیں جنھیں قدرت کی طرف سے اپنے مقصد کے تکمیل کی مہلت بھی مل گئی ہو۔ انہی گنی چنی خوش قسمت ہستیوں میں اتاترک بھی ہیں۔ جو مقصد وہ لیکر اٹھے اپنی زندگی ہی میں اس کی تکمیل بھی کرلی۔ جو باغ انھوں نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا اس کی بہار بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی!

ایک بنجر زمین میں کاشت کی اور اس کو لہلہاتا کھیت بنا دیا۔ ایک تھکی ہوئی اور حوصلہ ہاری ہوئی قوم کی سرداری کی اور اس میں زندگی کی نئی روح پھونک دی۔ صدیوں کے غلاموں کو روایات قدیم کی زنجیریں کاٹ کر آزاد کردیا۔ اور یورپ کے مرد بیمار کو جو ۱۹۱۸ء میں لب گور پہونچ چکا تھا اپنی معجزانہ قوتوں سے نہ صرف دوبارہ زندہ اور تندرست کردیا بلکہ

اس قدر توانا اور مضبوط بنا دیا کہ آج دولِ عالم اس سے آنکھ ملاتے ہوئے شرماتے ہیں۔

اتاترک کی زندگی کا مقدس مشن پورا ہو گیا!

ترک قعرِ مذلت سے نکل چکے، ایک باوقار اور ہر اعتبار سے آزاد ترکی جمہوریہ کی بنیادیں ابھری جا چکیں۔ ترکوں کی نئی نسلیں ایک نئے احساسِ خودداری اور جذبۂ حبِّ وطن سے سرشار ترقی کی ان راہوں پر جو اُن کے سردار اور رہنما نے ان کیلئے مقرر کر دی تھیں گامزن ہو گئیں۔ قدیم روایات حتیٰ کہ قدیم تمدن اور معاشرت بھی ترکوں کی تباہی اور کمزوری میں جن کا ہاتھ تھا ایک ایک کر کے آزادیٔ وطن کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ چکیں۔ ترک ایک نئی قوم بن گئے۔ نئے نئے حوصلے اور نئے نئے ارادے ان میں پیدا ہو گئے۔ مغربی تمدن کا طلسم ٹوٹ چکا۔ اور اسی کے ساتھ یورپ سے ان کی وہ مرعوبیت بھی رخصت ہوئی جو صدیوں سے ان کے دلوں میں گھر کئے ہوئے تھی۔

اپنے معاشی وسائل کا بھی انھیں احاطہ کرنا آگیا۔ اپنی ضروریاتِ زندگی کیلئے غیر اقوام کی انھیں محتاجی نہ رہی۔ گویا ترک اپنی ذات پر اعتماد کرنا سیکھ گئے۔ اپنی خداداد قوتوں سے کام لینے کا سلیقہ ان میں پیدا ہو گیا ایجاد و اختراع کے میدان میں ان کی صلاحیتوں کے جوہر کھلنے لگے۔ اور اپنی معاشی ترقیوں کا انھیں چسکا پڑ گیا۔

اتاترک کی زندگی کا مقدس مشن پورا ہو گیا!

ساڑھے چھ سو برس بعد ترکی تلوار پھر نیام سے نکلی، اور اپنے پرانے حریفوں سے ایک ایک کر کے اس مدت کے سارے اختلافات طے کر لئے۔ دوست

دفورِ مسرت سے جھومنے لگے اور دشمن مبہوت ہوکر رہ گئے۔ ترکی ہاتھ اب بھی ضرب لگا سکتا ہے؟! ترکی تلوار اب بھی کاٹ سکتی ہے!!

پرانے بیر ختم ہوئے۔ نئے رشتے جوڑے گئے۔ دوست ہمیشہ کیلئے حلیف بن گئے اور جو کل تک ترکی خون کے پیاسے تھے اور اُسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے پر تُلے ہوئے تھے اس نئی اور انتہائی غیور ترکی کے حلقہ احباب میں شمار ہونا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھنے لگے۔

سیاست کے بازار میں ترکی ساکھ دوبارہ قائم ہوگئی اور ایشیا اور یورپ کی سرحدوں پر پھر سے اس کی سرداری کا سکّہ چلنے لگا۔

اتاترک کی زندگی کا مقدس مشن پورا ہوگیا!!!

۲۹۔ اکتوبر ترکی جمہوریہ کی سالگرہ کی تاریخ ہے، احسان مند ترک اس دن عید مناتے ہیں۔ اور اپنے نجات دھندہ اور محسن کے حضور میں دلی محبّت اور عقیدت کے نذرانے پیش کیا کرتے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں ترکوں نے یہ پندرھویں عید منائی اور اسی شان سے منائی۔ لیکن یہ آخری عید تھی جس میں انھیں اپنے محسن کے حضور میں حاضری دینے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ دن ہر سال آئیگا اور برابر آتا ہی رہے گا جب تک ترکی قائم ہے لیکن یہ سعادت ترکوں کو پھر کبھی حاصل نہ ہوگی کہ وہ اپنے محسن کے حضور میں حاضر ہو سکیں۔ اس لئے کہ قدرت کا یہی منشا تھا۔

ترکوں کو بامِ کمال پر پہنچا کر اُن کا کمالؔ اُن سے چھن گیا اور وہ کا یتیم رہ گئے!

انا للہ انا الیہ راجعون

یہ ایک زبردست قومی حادثہ تھا، ایسا حادثہ جس نے ساری ترکی کو اس سرے سے اس سرے تک رنج وغم سے نڈھال کر دیا۔ اور ترکی ہی کو کیا سارے عالم اسلام بلکہ سارے ایشیا کو بےچین کر دیا۔ اس لیے کہ اتاترک صرف ترکوں ہی کے سردار نہیں تھے بلکہ اسلام کے نامور سپوت اور ایشیا کے زبردست فاتح اور ہیرو بھی تھے۔

اس موقع پر ترکوں نے جس انداز سے اپنے محسن اور اپنے سردار کا سوگ منایا اس کی مثال تاریخ میں کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ ترکی کے عرض وطول میں انتہائی حزن وملال کی فضا طاری تھی۔ اور ترکوں کا ہر ہر فرد اتاترک کا سوگوار نظر آتا تھا۔ ترکی خواتین نے خصوصیت کے ساتھ اتاترک کا سب سے زیادہ ماتم کیا۔ ان کے سیاہ پوش گروہ کے گروہ ترکی شہروں میں جلوس کی صورت میں بین کرتے ہوئے گذرتے دکھائی دیتے تھے۔ اور یہ ایسا نظارہ ہوتا تھا کہ دیکھنے والوں کا صبر رخصت ہو جاتا تھا اور وہ خود بھی چیخیں مار مار کر سوگواروں کے ساتھ ہو جاتے۔

اس سے بھی زیادہ دلدوز اور وجد انگیز نظارہ وہ تھا جب ترکوں نے اپنے "پدر مہربان" کا آخری دیدار کیا۔ لاکھوں سوگوار ترکوں کا ہجوم ایک ہی وقت میں اتاترک کے تابوت کی طرف پروانہ وار بڑھتا اور اپنے سردار اپنے مربی اور سرپرست کے حضور میں جس نے انھیں قعر مذلت سے اٹھا کر "بام کمال" پر پہونچا دیا تھا آخری مرتبہ اپنی فدایت اور عقیدت کے آنسو پیش کر کے امڈتے دل اور پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ الٹے قدموں واپس ہوتا۔ ایک دن کامل یہی ہوتا رہا۔ اور اس طرح کروڑوں ترکوں نے اپنے پدر مہربان کا آخری دیدار کیا۔ ترکوں کے اس جوش اور وارفتگی کو سمجھنے کیلئے صرف یہ

لکھدینا کافی ہے کہ اس آخری دیدار والے دن گیارہ ترک جن میں جوان، بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں مجمع کے دباؤ کی تاب نہ لاکر جاں بحق ہو گئے۔

اتاترک کے آگے اپنی محبت وعقیدت کی یہ آخری شہادت تھی جو اس دن ترکوں نے پیش کی!

جنازہ کا جلوس اس سے کہیں زیادہ وجد انگیز نظارہ پیش کرتا تھا۔ اس موقع پر وہ دستہ فوج جس نے اتاترک کی زیر کمان میدان سقاریہ میں فتح حاصل کی تھی "سقاریہ مارچ" بجاتا ہوا جلوس کے آگے آگے تھا، اس کے پیچھے اتاترک کا تابوت اور تابوت کے پیچھے اتاترک کے وفادار دوست اور مددگار رفقے۔ اور ان کے پیچھے دول عالم کے نمائندے برہنہ سر ساتھ تھے۔ اور ان کے پیچھے سیاہ پوش ترکوں کا ایک بے پناہ ہجوم تھا۔ سینکڑوں ہوائی جہاز جلوس کے اوپر فضائے آسمانی میں گشت لگا رہے تھے۔ اور ترکی توپخانے ذرا ذرا سی تاخیر کے ساتھ ماتمی فائر سے اتاترک کی جدائی کا اعلان کر رہے تھے۔ ترکی پارلیمنٹ نے اتاترک کے شان شایاں مقبرہ کی تعمیر کیلئے ایک لاکھ ترکی پونڈ کی منظوری دی تھی۔ لیکن اتنی جلد اس قدر عظیم الشان عمارت چونکہ تعمیر نہیں ہو سکتی تھی اس لئے عارضی طور پر اتاترک کا تابوت انقرہ کے نمائش گھر میں رکھدیا گیا۔ اور یہیں دول عالم کے نمائندوں نے اتاترک کے حضور میں آخری خراج عقیدت پیش کیا۔

عصمت انونو اتاترک کے جانشین مقرر ہوئے۔ یہ وہی عصمت انونو ہیں جو استخلاص وطن کی جدوجہد میں ہمیشہ اتاترک کے شریک وسہیم رہے۔ اور

جنھیں اتاترک کے وفادار اور معتمد دوست ہونیکا بھی فخر حاصل تھا۔ موجودہ ترکی میں حقیقت یہ ہے کہ ان سے بڑھکر اس منصب جلیلہ کا کوئی حقدار بھی نہ تھا خصوصاً اس لئے بھی کہ اتاترک کے مقدس مشن کی تکمیل میں یہ ان کے مددگار رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ اتاترک نے ترکی جدید کی تعمیر کن لائنوں پر کی ہے

عصمت انونو اتاترک کے جانشین ہو گئے۔ اور انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اس شاہراہ پر چلیں گے جو اتاترک بنا گئے ہیں۔ اتاترک کی یاد کو تازہ رکھنے کی یہ بہتر بن صورت تھی لیکن ترکوں نے اس سے بھی بڑھکر یہ کیا کہ اتاترک کو ہمیشہ کیلئے اپنا صدر تسلیم کر لیا۔ اور ترکی کے دستور اساسی میں ہمیشہ کیلئے یہ نام لکھدیا۔ مقصد یہ کہ صدر تو قیامت تک اتاترک ہی رہیں گے یہ ان کے نائب ہوں گے جو ہر چوتھے سال جمہوریہ ترکیہ کی صدارت کیلئے منتخب ہوا کرینگے اپنے اس فیصلہ سے ترکوں نے دُنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک باحمیت اور شریف ترین قوم ہیں جو اپنے مربی اور محسن کی قدر پہچانتے ہیں۔

ترکوں کا یہ جذبہ ان کی "قومی زندگی" کا مظہر ہے جو حوادث عالم میں ان کی بقا اور ترقی کی ضمانت کرتا رہیگا!

اب اس ہستی کے زندۂ جاوید ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے جس نے دُنیا میں ایسی زندہ قوم اپنی نشانی چھوڑی!!

باب ۳۹

اتاترکؒ کی شخصیت اور ذاتی خصوصیات

وہ سپاہی تھے اور تمام عمر سپاہی رہے!

سپاہی نڈر بے باک اور حوادث گردو پیش سے کبھی مرعوب نہ ہونیوالی فطرت کا مالک ہوتا ہے۔ اتاترک میں یہ صفات بدرجہ کمال موجود تھیں۔

میدان کارزار ہو یا میدانِ سیاست، کوئی رسمی کانفرنس ہو یا بے تکلف صحبت وہ آپ کو ہر جگہ سپاہی نظر آئیں گے۔

دشمن کی تعداد اور اس کی قوت وشوکت سے وہ کبھی مرعوب نہ ہوئے اور نہ مخالف سے مخالف حالات نے کبھی انھیں ہراساں کیا۔

جس طرح دشمن کے گولوں اور گولیوں کے طوفان کو وہ انتہائی بےجگری اور بیباکی سے فرو کرنے پر قادر تھے۔ اسی طرح وہ اپنے فطری عزم و ارادے کی قوت سے شدید سے شدید مخالفت کے امنڈتے ہوئے سیلاب کا رُخ بھی بے تکلف پھیر دیا کرتے تھے۔

میدانِ جنگ میں بارہا ترکی فوجیں انتہائی مایوس کن حالات میں بھی ان کی بےجگری کی وجہ سے فتحمند رہیں۔ اور سیاست کے میدان میں بڑی سے بڑی مخالفتیں بھی ان کے فطری عزم و ارادے کے آگے سرنگوں نظر

آئیں ۔

۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے ۔ قسطنطنیہ میں آزاد پارلیمنٹ کے ممبر گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے ۔ جو بھاگ سکے وہ انقرہ آگئے ۔ سلطان نے اتاترک کے سر کیلئے دس ہزار روپیہ کے انعام کا اعلان کر دیا اور ایک قہار فوج قوم پرستوں کے کچلنے کو اناطولیہ بھیج دی ۔

سلطانی فوج آندھی مینھ کی طرح یلغار کرتی ہوئی انقرہ کی طرف بڑھنے لگی ۔ خود انقرہ میں قوم پرستوں کے خلاف بغاوت ہوگئی ۔ قوم پرستوں کے دل ڈوب گئے ۔ اب ان کے لئے اطاعت یا فرار کے سوا چارہ نہ رہا ۔

رات کو انقرہ کے مدرسہ زراعت کے بڑے ہال میں اتاترک کے رفیق و مددگار کرنل رفعت ، علی فواد ، ڈاکٹر عدنان ، خالدہ ادیب ، عصمت فیضی اور کرنل عارف آخری مشورہ کیلئے جمع ہیں ۔ مدرسہ کے احاطہ میں زین کسے گھوڑے تیار کھڑے ہیں تاکہ صبح سلطانی فوجوں کے انگورہ میں داخل ہونے سے پہلے وطن کے ان فدائیوں کو روس کی سرحد کے پار لے جائیں کرنل عارف فرار کے سارے انتظامات مکمل کر کے ہال میں داخل ہوتے ہیں ہر شخص روحانی کرب واذیت میں مبتلا ہے ۔ یاس وحرماں ہر چہرہ پر برس رہا ہے ۔ کمرہ میں موت کی سی خاموشی طاری ہے ——— لیکن اتاترک ان مایوسیوں کی صف میں شامل نہیں ہیں ۔ وہ گردن نیچی کئے پشت پر ہاتھ باندھے نہایت گہری سوچ میں کمرہ میں ٹہل رہے ہیں ۔ کرنل عارف کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی وہ چونک پڑتے ہیں ۔ چہرہ سے بجائے خوف وہراس کے خوداعتمادی اور آہنی عزم وارادے کی پُرجلال کیفیات ظاہر ہوتی ہیں اور ساتھ ہی جوش میں ڈوبی ہوئی آواز یہ کہتی ہوئی سُنائی

دیتی ہے :۔

"ہم لڑیں گے ـــــ آخر دم تک ! ۔ مٹا دیں گے یا خود مٹ جائیں گے !"

یہ ایک سپاہی کا فیصلہ تھا جو انتہائی مایوس کن حالات میں بھی گھبرانا نہیں جانتا۔ اور خطرے کے وقت پیٹھ دکھانا نہیں چاہتا۔

غور کیجئے! کیا یہی وہ تاریخی فیصلہ نہیں ہے جس نے ترکی کی قسمت پلٹ کر رکھدی !!

مشہور ہے کہ اناطولیہ میں جب یونانی فوجیں "اقیون قرہ حصار" تک بڑھ آئیں، ترکی فوجوں کی سقیم حالت کو دیکھکر انقرہ کے کرسی نشین مدبروں نے بہ یک زبان اتاترک پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ یونان سے صلح کرلی جائے۔ فرانس نے بھی اس موقع پر بیچ بچاؤ کرنا چاہا۔ اور یونانی نمائندے کے ساتھ اپنا سفیر اتاترک کے حضور میں بھیجدیا۔ اس سفیر کے اعزاز میں اتاترک نے ایک ڈنر دیا۔ اور ضیافت کے دوران ہی میں وہ موضوع چھیڑ دیا جس پر یونانی اور فرانسیسی سفراء گفتگو کرنی چاہتے تھے۔

یونانی نمائندے نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اپنی قوت وشوکت کی ہوا باندھنی شروع کردی۔ اتاترک نہایت خاموشی سے نیچی نظریں کئے بیٹھے سنتے رہے۔ یونانی سمجھا کہ اس نے میدان مار لیا۔ بے دھڑک اپنا مقصد بیان کر گیا اور ترکوں کو یہ "دوستانہ" مشورہ دے گیا کہ ترک اب ہتھیار ڈال دیں۔ اور یونان کی پناہ میں آجائیں۔

ڈنر ختم ہو چکا تھا، اتاترک بہ اطمینان تمام "نیپکن" سے منہ صاف

کر کے کرسی سے اٹھے ۔ یونانی نمائندے پر ایک غلط انداز نگاہ ڈالی اور میز پر سے ایک شیشے کا گلدان اٹھا کر کمرے کے فرش دے مارا اور نہایت صاف گرجدار آواز میں فرمایا :۔

"آپ نے جو کچھ فرمایا میں نے سُنا ۔ جو مقصد آپ لیکر آئے تھے وہ اسی طرح پاش پاش ہو گیا جس طرح یہ گلدان !

رہا فتح وشکست کا معاملہ ، اس کا فیصلہ اب آپ کے اور ھمارے درمیان تلوار کریگی ــــــــ جس کو مولا دے !"

تلوار نے فیصلہ کر دیا اور دُنیا نے دیکھ لیا کہ فتح مولا نے کس کو دی !!

وہ جنرل تھے ـــــــ خوش قسمت اور کامیاب جنرل تھے !

" صرف وہی جنرل خوش قسمت اور کامیاب کہلاتا ہے جسے اپنی زندگی میں کامیابی کا کوئی موقع ملے ۔ اور اس سے وہ پورا پورا فائدہ بھی اٹھائے "

حالات نے اتاترک کیلئے کامیابی کے مواقع فراہم کرنے میں کبھی بُخل سے کام نہیں لیا ۔ اور اتاترک نے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانے

میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

جنگ عظیم کے دوران میں دردانیال کا معرکہ اتاترک کی فوجی زندگی میں کامیابی کا پہلا موقع تھا جس سے انھوں نے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔ اور یہی واقعہ دراصل ان کی شخصیت کو دُنیا سے متعارف کرانے کا باعث بھی بنا۔

۱۹۱۵ء میں گیلی پولی کے محاذ پر جہاں ترکوں کی صرف چالیس ہزار فوج پڑی تھی اسی ہزار تازہ دم انگریزی فوج حملہ کر بیٹھی۔ جرمن سپہ سالار لیمان فان سنڈرس کے حواس جاتے رہے اور اسے اپنی شکست کا یقین ہو گیا۔ شکست کی صورت میں چونکہ ترکی کے تعلقات آسٹریا اور جرمنی سے منقطع ہو جانے کا خطرہ تھا اس لئے وہ اس شکست کی ذمہ داری اپنے سر لینے سے گریز کر گیا۔ اور گیلی پولی کی ساری فوجوں کی کمان کمال اتاترک کے سپرد کر دی۔

کس قدر نازک موقع ہے! ۹۹ فیصدی ناکامی اور مشکل سے صرف ایک فیصدی کامیابی کا قرینہ!!

لیکن کمال اتاترک اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور بے دھڑک اس اہم ترین ذمہ داری کو قبول کر لیتے ہیں۔

دُنیا کے ذمہ دار ماہرین جنگ کا اعتراف ہے کہ جنگ عظیم کے دوران میں صرف دردانیال ہی کا معرکہ اصول حرب کے اعتبار سے کامیاب ترین معرکہ کہا جا سکتا ہے!!

دوسرا موقع کمال اتاترک کو شام کے محاذ پر ملا۔ انھوں نے

جرمن سپہ سالار کی مرضی کے خلاف محض اپنی ذمہ داری پر ترکی فوجوں کو شام کے اصلی محاذ سے تین سو میل پیچھے ہٹا کر خالص ترکی سرحد میں اپنا مورچہ قائم کیا۔ اور حلب کے محاذ پر انگریزوں کی ہندوستانی فوج کو شکستِ فاش دیکر ترکی علاقہ کو برطانوی تاخت کی ذلت سے بچا لیا۔

آج ترکی جمہوریہ کی جنوبی سرحد وہی ہے جہاں کمال اتا ترک نے آخری مورچہ قائم کیا تھا!

تیسرا موقع اپنے حربی جوہر دکھانیکا اتا ترک کو میدان سقاریہ میں ملا، اس معرکہ میں تین لاکھ یونانیوں کے مقابلہ میں صرف ایک لاکھ ترکی سپاہ تھی۔ اپنی کثیر تعداد کے ساتھ یونانی فوجیں تازہ دم اور جدید آلاتِ حرب سے مسلح بھی تھیں۔ برخلاف اس کے ترکوں کی تھکی ہوئی فوجوں کے پاس نہ سامانِ رسد ہی کافی تھا اور نہ آلاتِ حرب! اور اہمیت اس معرکہ کی یہ تھی کہ اگر یونانی سقاریہ میں ترکوں کو شکست دیدیتے تو پھر انھیں کوئی روکنے والا نہ تھا۔ سارا اناطولیہ یونانی سلطنت میں شامل ہو جاتا۔ اور وینیز ولہ کی وہ دیرینہ تمنا بر آتی جس کیلئے اس نے بے وجہ ترکوں پر فوج کشی کی تھی۔

معرکہ سقاریہ کے بعد ہی اتا ترک کا شمار دنیا کے بہترین اور کامیاب ترین جنرلوں میں ہونے لگا۔ اس لئے کہ اس نابرابر کے مقابلہ میں ترکوں کو محض اتا ترک ہی کی معجزانہ فوجی مہارت کی بدولت فتح نصیب ہوئی تھی۔ اس معرکہ نے نہ صرف ترکی کی بلکہ صحیح معنوں میں سارے ایشیا کی قسمت پلٹ دی اور آئندہ صدیوں تک کیلئے ایشیا کو یوروپین قوتوں کی تاخت

سے بچا لیا۔

وہ آہنی عزم وارادے کے مالک تھے!

جرمن مصنف ہانس فروم گن کی رائے ہے کہ :۔

"ترکی انقلاب، دُنیا کے اور انقلابوں سے مختلف محض ایک ہی عزم و ارادے کی پیداوار تھا"

ترکی انقلاب کے متعلق یہ حقیقتاً نہایت صحیح اور سچی رائے ہے۔ پہلی بات تو اس انقلاب کے متعلق یہ ہے کہ اس میں عوام کے مذھبی یا روایتی جوش اور جذبہ سے مطلق کام نہیں لیا گیا۔ اور نہ عوام اس تمام دوران میں کسی خاص جذباتی اثر سے مدہوش ہو کر" اصول نظم و ضبط" سے گریزاں نظر آئے۔ یہ ایسی عجیب بات ہے کہ اس معاملہ میں دُنیا کے کسی انقلاب کو اس کے مقابلہ میں نہیں رکھا جا سکتا ——— انقلاب تو جنون اور دیوانگی کا ایک طوفان ہوتا ہے، وحشیانہ ہنگاموں کا ایک سیلاب ہوتا ہے جو آن کی آن میں ہر اُس چیز کو بہا لے جاتا ہے جو اسکی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ اس کا تو مفہوم ہی ان جذباتی بلکہ زیادہ صحیح یہ کہ ان غیر ذمہ دار حیوانی قوتوں کی کارفرمائیوں سے عبارت ہے جو کسی قاعدہ قانون یا ضبط و نظم سے مانوس ہی نہیں ہوتیں! ———

لیکن ترکی انقلاب اس وحشت اور دیوانگی سے پاک ہے۔ پھر بھی اپنے نتائج کے اعتبار سے انقلاب ہی کہلاتا ہے!

دوسری بات اس انقلاب میں یہ ہے کہ اس میں خونریزی صرف خارجی طاقتوں کے مقابلے اور مجادلے ہی میں ہوئی اور اس لئے ہوئی

کہ ترکی کو غیر اقوام کے اثر سے آزاد کرایا جا سکے۔ خانہ جنگی پر نہ اس انقلاب کی بنیاد رکھی گئی اور نہ اختتام ہوا!!

آزادی کی جد و جہد کے دَوران میں بعض ایسی باتیں بے شک پیدا ہو گئی تھیں جو اگر بڑھتیں تو ان کا نتیجہ شاید خانہ جنگی کی صورت میں نکلتا۔ مثلاً جب سیواس کانفرنس میں قوم پرستوں نے بالاتفاق یہ طے کر دیا کہ یونانیوں کا باقاعدہ مقابلہ کیا جائے۔ اور اتاترک اس مہم کی رہنمائی کریں تو ادھم نے جس کا بے قاعدہ لشکر اناطولیہ کی پہاڑیوں میں لوٹ مار میں مصروف تھا اور چھپ چھپ کر یونانیوں پر چھاپے مارا کرتا تھا، اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کیا۔ اور اتاترک کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ادھم کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ علی فواد بھی شریک تھے۔ چنانچہ اس موقع پر خانہ جنگی کا قوی اندیشہ پیدا ہو گیا تھا لیکن اتاترک نے جب دیکھا کہ ادھم پر سنجیدہ باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے اور وہ ہاتھوں ہی سے نکلا جاتا ہے تو انھوں نے کرنل رفعت کی ماتحتی میں ادھم کی سرکوبی کو ایک چھوٹی سی فوج بھیج دی جس نے ادھم کو قونیہ سے مار بھگایا۔ اور اس کے بے قاعدہ لشکر کو ترکی فوج میں شامل کر لیا۔ اور علی فواد چونکہ پہلے ہی تائب ہو کر اتاترک کی ماتحتی قبول کر چکے تھے اس لئے یہ سارا ہنگامہ بغیر کسی الجھن اور بے چینی کے ختم ہو گیا۔

اسی طرح اس وقت بھی خانہ جنگی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا جب کاظم قرہ بکر، جنرل نورالدین، رؤف، ڈاکٹر عدنان اور خالدہ ادیب جیسی با اثر ترکوں نے اتاترک کے طرز حکومت سے اختلاف کیا اور خلیفہ عبدالمجید کو انکی

مرضی کے خلاف دوبارہ سلطان بنا دینا چاہا۔ یہ موقع حقیقتاً ترکی کیلئے بہت نازک تھا۔ لیکن عوام نے چونکہ ان ترکوں کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اس لئے یہ تحریک ایک منظم حکومت کے خلاف صرف چند جاہ طلب افراد کی سازش بن کر رہ گئی۔ اور اس گناہ کے کفارے میں آل عثمان کو ہمیشہ کیلئے ترکی سرزمین چھوڑنی پڑی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اتا ترک نے دَوران انقلاب ہی میں جدید ترکی کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیا تھا۔ اور اسی کی تکمیل کو اپنا مقصدِ زندگی قرار دے لیا تھا۔ یہ عزم ان کا اس قدر راسخ اور ارادہ اس قدر پکا تھا کہ اس راہ میں بڑی سے بڑی مخالفت نے بھی انھیں کبھی بددل نہیں کیا۔ اور نہ مشکلات کے مقابلہ میں وہ کبھی کمزور نظر آئے۔ وہ ایک آہنی دیوار بنے کھڑے تھے جس سے مخالفتیں ٹکرا کر خود بخود پاش پاش ہو جاتی تھیں۔ ایک زبردست چٹان تھے جسے مخالفتوں کی تیز سے تیز آندھیاں بھی جنبش نہ دے سکتی تھیں۔

اپنے اس مقصد کے لئے کوئی بڑی سے بڑی قربانی ایسی نہیں تھی جو انھوں نے نہیں دی۔ اور اس سے اختلاف کی صورت میں دشمن تو دشمن اپنے ساتھیوں اپنے وفادار اور جگری دوستوں تک کی پرواہ نہیں کی۔

وہ یہ عزم کر چکے تھے کہ ترکی کو نیا جنم دیں گے اور ترکوں کی ساری بوسیدہ اور فرسودہ روایات کو ختم کر کے رکھ دیں گے یہی وہ ساری عمر کرتے رہے اور دُنیا کی کوئی قوت ان کے اس عزم کو مضمحل اور ان کے اس ارادے کو پست نہ کر سکی۔ ان کی بیوی لطیفہ خانم جن سے اتا ترک نے اس قدر

رومانی انداز میں شادی کی تھی اور جنھیں چاہتے بھی بہت تھے ان کی سرگرمیوں میں مخل ہوئیں، اتاترک نے انھیں بے تکلف طلاق دیدی۔ لطیفہ خانم انھیں بہت عزیز تھیں۔ لیکن ترکی انھیں لطیفہ خانم سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ اسے ایک لمحہ کیلئے بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی عزیز بیوی اس مقدس مشن میں ان کا ہاتھ بٹانے اور حوصلہ بڑھانے کے بجائے ان کے عزائم کو پست اور ان کی سرگرمیوں کو بے اثر بنانے کی کوشش کرے۔

کرنل عارف، اتاترک کے جگری دوست اور اس وقت کے ساتھی تھے جب اتاترک فوج میں ایک معمولی سے کرنل تھے اور انور پاشا انھیں آگے نہ بڑھنے دیتے تھے۔ ان دونوں کی دوستی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ لوگ ان دونوں کو قریبی رشتہ دار سمجھا کرتے تھے۔ سمرنا کے مقدمہ سازش میں یہی کرنل عارف دوسرے سازشیوں کے ساتھ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے نظر آتے ہیں جب ان پر سازش کا جرم ثابت ہو جاتا ہے اور عدالت مجرموں کی پھانسی کے کاغذ صدر جمہوریہ ترکیہ کے حضور میں بھیجتی ہے تو اور کاغذوں میں کرنل عارف کی پھانسی کا بھی وارنٹ ہوتا ہے۔ اتاترک کا سکریٹری کرنل عارف کا وارنٹ پیش کرتے ہوئے جھجکتا ہے اس خیال سے کہ یہ شخص مدتوں اتاترک کا جگری دوست رہا ہے شاید اتاترک اس کو معاف کر دیں۔ لیکن اتاترک بلا کسی پس و پیش کے اس پر اپنے دستخط ثبت کر دیتے ہیں۔ اور کرنل عارف بھی معمولی مجرموں کی طرح پھانسی پا جاتے ہیں۔

اتاترک کے حریفوں نے جہاں ان کے طرز حکومت پر اعتراضات

کئے ہیں، کرنل عارف اور لطیفہ خانم کے واقعہ کو بھی خوب خوب اچھالا ہے۔ اور ان سے وہ اتاترک کے ہوس اقتدار پر دلیل لاتے ہیں لیکن ہم اس سے متفق نہیں۔ اقتدار ہی حاصل کرنا اگر اتاترک کا مقصد وحید ہوتا تو استخلاص وطن اور آل عثمان کے اخراج کے بعد ایک سے ایک زیادہ مرتبہ تسکین ہوس کے یہ مواقع انھیں مل چکے تھے بلکہ عالم اسلام کی طرف سے انھیں ترغیبیں بھی دی گئی تھیں، اگر وہ چاہتے تو بہت آسانی سے اپنا یہ مقصد حاصل بھی کر سکتے تھے۔ لیکن اتاترک نپولین نہیں تھے، اپنی ذات اور اپنا خاندان کبھی ان کے پیش نظر نہیں رہا۔ وہ صرف ترکی کی سربلندی چاہتے تھے اور ترکوں کو من حیث القوم معزز اور مفتخر کرنا چاہتے تھے۔ البتہ وہ اتنے خودرائے تھے اور ان کے عزم و ارادے کی قوت اتنی زبردست تھی کہ اپنے اس مقدس مشن کی تکمیل میں کسی قسم کی جذباتی روک کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ انھیں اتنی اخلاقی جرأت بھی تھی کہ شدید ترین قومی خطرہ کے وقت اپنے عزیز ترین دوستوں اور ساتھیوں تک کو اس مقدس مشن کی بھینٹ چڑھا دیں۔

اس کے باوجود ترکی انقلاب اس اعتبار سے کامیاب ترین انقلاب ہے کہ اس میں تاریخ کے سارے اگلے پچھلے انقلابوں کے مقابلہ میں مطلق خونریزی نہیں ہوئی۔ اور اس کی وجہ صرف ایک ہے یہ کہ ترکی انقلاب محض ایک ہی عزم وارادے کی پیداوار تھا۔ اور عوام کے جوش و جذبہ کو اس میں مطلق دخل نہ تھا۔

وہ مدبر تھے ——— انتہائی دور بین اور مصلحت اندیش مدبر تھے!

ایک اچھے جنرل کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ایک کامیاب اور مصلحت اندیش مدبر بھی ہو۔ بلکہ یہ دونوں صفات ایک ہی شخصیت میں کبھی جمع نہیں ہوا کرتیں۔ لیکن اتاترک کی ذات اس کلیہ سے مستثنیٰ تھی وہ جس پائے کے سپاہی تھے اسی مرتبہ کے مدبر بھی تھے۔ اگر ایک طرف ان میں یہ قدرت تھی کہ اپنے وطن کو غیر ملکی اقتدار سے آزاد کرائیں، تو دوسری طرف ان میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ اپنے قوت بازو سے حاصل کی ہوئی آزادی کو ہمیشہ قائم اور برقرار رہنے کی ضمانت بھی کر جائیں۔

وطن کو آزاد کرانے کیلئے انھوں نے غیر ملکی طاقتوں سے جنگ کی تھی لیکن آزادی کے تحفظ کیلئے جو طریقہ وہ اختیار کرنا چاہتے تھے اس کے لئے انھیں خود اپنے ہم وطنوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اور یہ مقابلہ غیر ملکی طاقتوں سے زیادہ سخت تھا۔

صدیوں کے پرانے طرز حکومت کو بدل دینا آسان کام نہیں تھا۔ اور نہ ان مذہبی توہمات کو ترکوں کے دماغوں سے محو کرنا سہل تھا جو صدیوں سے ان کی میراث بن گئے تھے۔ لیکن اتاترک نے یہ دونوں کام معجزانہ مہارت سے کر دکھائے۔ اور اس قدر تیزی اور آسانی سے انھیں سرانجام دیا کہ آج ساری دنیا ترکی کی اس کایا پلٹ کو دیکھتی ہے۔ اور حیران رہ جاتی ہے۔

اتاترک نے ترکی جمہوریہ کے ہر ہر شعبہ کو جس جس انداز سے منظم کیا وہ تو خیر کیا ہی تھا۔ لیکن ان میں تدبر اور مصلحت اندیشی کے اصلی جوہر ترکی کے خارجی تعلقات کے سلسلے ہی میں ظاہر ہوئے۔

لوزان کانفرنس میں اپنے تدبر اور دانش مندی سے وہ سب کچھ حاصل کر چکنے کے بعد جو ترک حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ وہ اپنے سارے دشمنوں کو یک لخت بھول جاتے ہیں اور ان سب سے مساویانہ شرائط پر حلیفانہ معاہدے کر لیتے ہیں ۔ اسی کے ساتھ "اتحاد شرق" کی ایک نئی سیاسی تحریک لیکر اٹھتے ہیں اور مشرق کے ان اسلامی ممالک کو ایک رشتے میں باندھ دیتے ہیں جنھیں کبھی بھولے سے بھی یہ ہوش نہیں آیا تھا کہ مفادِ مشترک کی حفاظت کیلئے اس قسم کا اتحاد بھی دنیائے سیاست میں ضروری ہوتا ہے ۔

لوزان کانفرنس میں سب کچھ تو ترکوں کو مل چکا تھا ۔ لیکن دردانیال پر ان کا مالکانہ قبضہ تسلیم نہیں کیا گیا تھا ، اتاترک اس وقت تو مصلحتاً چپکے ہو رہے تھے ۔ لیکن ۱۹۳۵ء میں جیسے ہی اٹلی حبشہ پر فوج کشی کرتا ہے اتاترک اسی کو وجہ بنا کر دردانیال پر ترکی کے مالکانہ قبضہ کا اعلان کر دیتے ہیں ۔ اور مونٹ ریے کی کانفرنس میں دولِ یورپ سے اس کی توثیق کرا لیتے ہیں ۔

جمہوریہ ترکی سے سوویٹ روس کے دوستانہ تعلقات ہیں اور مدتوں سے چلے آتے ہیں ۔ اسپین کی خانہ جنگی کے دوران میں جب جنرل فرینکو کے جہازوں پر نگرانی شروع کی جاتی ہے تو اس سلسلے میں روس اور اٹلی میں دو روسی جہازوں کے غرق ہو جانیکے باعث رنجش پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور یہ رنجش کچھ ہی دنوں میں اس قدر نازک صورت اختیار کر جاتی ہے کہ ان دونوں قوتوں کے آپس میں دست و گریبان ہو جانیکا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس سے عصمت انونو وزیر اعظم کو

تشویش ہوتی ہے۔ اور انھیں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں روس اور اٹلی کی دردانیال ہی کے دہانہ پر جھڑپ نہ ہو جائے۔ اور ناکردہ کار ترکی کو خواہ مخواہ اس میں الجھنا پڑے۔ وہ گھبرا کر دردانیال کو بند کر دینے کا حکم دیدیتے ہیں۔ اتاترک اس غیر مدبرانہ حکم کو فوراً منسوخ کر کے دردانیال کا راستہ روسی جہازوں کیلئے کھول دیتے ہیں۔ اور عصمت انونو کو اس اختلاف پر استعفٰی دینا پڑتا ہے۔

آتاترک کے تدبر اور مصلحت اندیشی کی یہ بالکل سرسری مثالیں ہیں لیکن ایک بات ان سے بہرحال بہ خوبی ثابت ہوتی ہے، وہ یہ کہ آتاترک قدرت کی طرف سے حیرت انگیز طور پر متوازن دماغ لیکر آئے تھے۔ اور انہیں حالات اور واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہایت خشک اور منطقی اصول پر نتیجہ اور صحیح نتیجہ نکالنے کا بڑا اچھا سلیقہ تھا یہی وجہ ہے کہ دول یورپ جو سیاسیات حاضرہ کا استاد مانا جاتا ہے اسے بھی بالآخر آتاترک کے تدبر اور فراست کا لوہا ماننا پڑا۔

وہ مصلح تھے ــــــــ قوم کے نبض شناس اور بیدار مغز مُصلح تھے!

ترکی جدید کی تعمیر میں آتاترک کی اصلاحات کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لئے کہ ان ہی اصلاحات کی مدد سے آتاترک نے ترکی کی کایا پلٹ دی اور صفحہ ہستی پر ایک ایسی غیور بلند حوصلہ اور ہر اعتبار سے متمدن قوم پیدا کر دی جس کا سرمایہ حیات درخشاں ماضی کے بجائے مستقبل کی روشن توقعات سے

عبارت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کسی قوم کا شاندار ماضی بعد کی نسلوں میں اپنی قوم کی عظمت و جبروت کا احساس ضرور پیدا کر دیتا ہے لیکن اس قوم میں "زندگی" نہیں پیدا کر سکتا۔ 'زندگی' کا صحیح احساس اگر پیدا ہو سکتا ہے تو مستقبل ہی کی روشن توقعات میں ہو سکتا ہے۔

ایشیا میں مغلوں اور تاتاریوں کا ماضی دیکھئے کتنا درخشاں ہے۔ چنگیز بگولے باد کی طرح دشت گوبی سے اٹھتا ہے اور آدھے سے زیادہ یورپ پر چھا جاتا ہے لیکن جس تیزی سے یہ بگولہ اٹھتا ہی اسی تیزی سے فنا بھی ہو جاتا ہی اور مغل آدھی دنیا کو تاخت و تاراج کرنیکے بعد پھر اسی دشت گوبی میں منتشر ہو جاتے ہیں اور اپنے اس باجبروت ماضی کی میراث ان کے حافظہ میں دَورِ چنگیزی کی خوشگوار یاد کی صورت میں باقی رہ جاتی ہے اور بس۔

چنگیز کے بعد اسی ایشیا کے میدانوں سے ایک اور اولوالعزم سپاھی اپنا پھریرا اُڑاتا ہوا نکلتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے یورپ میں دریائے ڈینیوب کے کنارے اس کو نصب کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی آنکھ بند ہوتے دیر نہیں ہوتی کہ اس کی یورپ اور ایشیا کی اس وسیع سلطنت کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ اور تاتاریوں کے پاس اس باعظمت ماضی کی میراث سوائے تیمور کی یاد کے اور کچھ باقی نہیں رہتی۔

خود ترکوں کو دیکھ لیجئے، سلیمان اول کے وقت میں جبکہ ان کے حوصلے جوان تھے ان کی سلطنت کی وسعت کیا تھی اور وحیدالدین کے زمانہ میں جو اس خاندان کا آخری نام لیوا تھا وہ کیا رہ گئی تھی؟

اصل میں ان قوموں کو جن کا ماضی بہت شاندار ہوتا ہے۔ اپنی قدیم روایات سے جو امتداد زمانہ کے باعث اپنی اصلی روح کھو بیٹھتی ہیں اور محض توہمات کی شکل اختیار کر جاتی ہیں ایک قسم کی عصبیت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ تعصب ان میں اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ پھر وہ تغیر بدلے ہوئے حالات میں بھی اپنے ان توہمات کو کسی تازہ جدت اور مفید سے مفید اصلاح کے عوض بھی ترک کرنے پر تیار نہیں ہوتیں۔ اور غیر محسوس طریقے پر کمزور اور رُو بہ تنزل ہوتی جاتی ہیں۔

گویا ان قوموں کی کیفیت جو بڑھتی ہوئی رفتار تمدن کے ساتھ اپنے قدم نہیں ملا سکتیں ایک ایسے قافلہ کی سی ہوتی ہے جو اپنے کارواں سے بچھڑ کر دشت گمنامی میں بھٹکتا پھرتا ہے۔

انقلاب سے پہلے ترکوں کی بالکل یہی کیفیت تھی۔ یہ قوم جو ساڑھے چھ سو برس سے یورپ اور ایشیا کے درمیانی علاقوں پر حکومت کرتی رہی تھی، اپنی چند فطری خصوصیات بھی رکھتی تھی۔ اور اس کی کچھ قدیم روایات بھی تھیں۔ جو دوسری قوموں کے اختلاط سے پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے باعث ان روایات کی اصلی روح غائب ہو چکی تھی اور یہ محض توہمات کی صورت اختیار کر گئی تھیں جس سے ترکوں کی فطری خصوصیات میں بھی زنگ آ گیا تھا۔ اور بدلے ہوئے حالات میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کی صلاحیت اُن سے رخصت ہو گئی تھی۔

ان توہمات کا اثر چونکہ ترکوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کر چکا تھا اور اس قدر گہرا چڑھ چکا تھا کہ محض معمولی سا علاج اس پر کارگر نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے قوم کے اس نبض شناس طبیب حاذق نے اس مرض ہی

کو بیخ و بنیاد سے اکھیڑ دینیکا تہیّہ کر لیا۔ اور ترکوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو پلٹ کر رکھدیا۔

ترکی کی انقلابی اصلاحات کے سلسلہ میں اتاترک پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ترکوں کو جو ایک مشرقی قوم تھی مغربی رنگ میں رنگ دیا۔ اور اس رشتہ کو منقطع کر دیا جو صدیوں سے مشرق کے ساتھ قائم چلا آتا تھا۔ اس اعتراض کا جواب خود اتاترک نے یہ دیا تھا کہ:۔

"ہمارے پیش نظر صرف ترکی کی فلاح اور بہبود ہے ہم ہر بات کو ترکی ہی کی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور ایشیا اور یورپ سے صرف وہ باتیں ہم قبول کرنی چاہتے ہیں جو ہمارے لئے مفید ہوں"

اتاترک کے اس مختصر سے جواب کو سمجھنے کیلئے ترکی کی جغرافیائی اور سیاسی پوزیشن کا جاننا بہت ضروری ہے۔ ترک ایک ایشیائی قوم بیشک ہے لیکن صدیوں سے اس کا واسطہ ایشیا سے کم اور یورپ سے زیادہ رہا ہے۔ جس کے باعث ایشیا کی فرسودہ روایات کے مقابلہ میں جن پر صدیوں سے جمود طاری تھا یورپ کے تیزی سے بدلتے ہوئے تمدن کا اثر ان پر پڑا اور انھوں نے قبول بھی کر لیا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ طبعاً ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ دوسرے ان کی سیاسی ضرورت انھیں مجبور کر رہی تھی کہ وہ اپنے ہمسایہ یورپ سے بیگانہ نہ رہیں۔ لیکن وہ پوری طرح ایک مغربی

قوم بن جانے سے مدتوں جھجکتے رہے اس لئے کہ مشرق سے ان کا تعلق بالکل ہی منقطع نہیں ہوا تھا، ان کی سلطنت کا بڑا حصّہ اب بھی مشرقی تھا، اور اس حصہ میں مسلمانوں کے ایسے مقدس مقامات بھی شامل تھے جن پر قبضہ و اقتدار قائم رکھنے میں ترکوں کیلئے اپنی مشرقیت کو باقی رکھنا بہت ضروری ہوگیا تھا۔ لیکن ۱۹۱۸ء کے بعد یہ حیلہ بھی جاتا رہا۔ اور ان مشرقی علاقوں نے خود ہی ترکوں سے قطع تعلق کر لیا۔ ترک اب بالکل آزاد تھے۔ مشرق کا دباؤ ان پر سے ہٹ گیا اور اب وہ اپنی بقا کیلئے اپنی مرضی کے خلاف اپنی مشرقیت کی نمائش کرنے پر مجبور نہ تھے۔

مشرقی علاقوں سے قطع تعلق ہو جانیکے بعد ترکوں کا تعلق صرف یورپ باقی رہ گیا تھا۔ اور اس تعلق کو استوار رکھنے کیلئے اِس بات کی ضرورت تھی کہ اس مغربی رنگ سے عوام ترکوں کو بھی بے تکلف ہونے کا موقع دیا جائے جو ترکوں کی اونچی اور مہذب سوسائٹی پر مدتیں گذریں کہ چڑھ چکا تھا۔ فی الحقیقت جو اصلاحات اتاترک نے ترکی میں نافذ کیں ان سے ترکی کا اونچا طبقہ بہت پہلے سے مانوس[1] تھا اور متوسط طبقہ میں بھی

---

[1] ۱۹۰۹ء میں جبکہ ترکی پر انجمن اتحاد و ترقی کے ممبروں کو اقتدار حاصل تھا۔ ترکی خواتین نے اس خیال سے کہ نوجوان ترک ان کی حمایت کرینگے پردہ کیخلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اور بے پردہ ترکی خواتین کا ایک گروہ بھی اپنے مطالبہ کی حمایت میں قسطنطنیہ کی شاہراہوں پر پھرتا نظر آیا لیکن نوجوان ترکوں نے ترکی خواتین کا یہ مطالبہ رد کر دیا۔ جس کے باعث مجبوراً انھیں پرانی معاشرت کا پابند رہنا پڑا۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ترکی خواتین میں بیداری بہت پہلے سے پیدا ہو چکی تھی۔ (مرتب)

بھی اس کی طلب بڑھتی جا رہی تھی۔ البتہ اناطولیہ کے دیہاتی اور کسان ابھی اس رنگ میں مانوس نہیں ہوئے تھے۔ یہ 'کمال' اتاترک کا تھا کہ انھوں نے اناطولیہ کے جاہل دیہاتیوں کی دیکھتے ہی دیکھتے کایا پلٹ دی اور اپنی زندگی کے متعلق ان کا صدیوں کا فرسودہ نظریہ یکسر بدل ڈالا۔ اس معاملہ میں ترکی کے اونچے طبقہ نے اتاترک کی بہت مدد کی جو پہلے ہی مغربی تمدن اور معاشرت سے بے تکلف تھا۔ اور در اصل اسی طبقہ کی مدد سے اناطولیہ میں اتاترک کی یہ انقلابی اصلاحیں اس قدر جلد کامیاب بھی ہوگئیں۔ ورنہ ترکوں کا قدامت پرست طبقہ اور مذہب کے ٹھیکہ دار درویش اور مولوی اس منزل کو اتاترک کیلئے اس قدر کٹھن بنا دیتے کہ شاید اس تک پہونچنا ان کیلئے مشکل ہو جاتا۔ اس پر بھی درویشوں، مولویوں' اور قدامت پرستوں نے اتاترک کی ان اصلاحات کی مخالفت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اور جب کبھی انھیں موقع ملا مذہب کے نام پر عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کی اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کی لیکن ان کی یہ کوششیں عوام میں کامیاب نہ ہوسکیں اور ہر موقع پر ان غریبوں کو بری طرح منہ کی کھانی پڑی!

اتاترک کی انقلابی اصلاحات میں "عالم اسلام" کی طرف سے سب سے زیادہ عورتوں کی آزادی اور ترکوں کی مغرب زدگی پر اعتراض ہوئے اس کا اتاترک کی طرف سے یہ جواب تھا:۔

"عالم اسلام؟ — کیا یہ وہی عالم اسلام نہیں ہے

جس نے جنگ عظیم کے دَوران میں ترکوں کی دشمنوں سے سازش کر کے ترکی کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہا تھا؟

کیا اسی عالم اسلام نے اس وقت جبکہ ترکی دشمنوں کے نرغہ میں پھنس گیا تھا اُسے غافل پاکر اس کی پُشت پر وَار نہیں کیا تھا؟

آج اُسے یہ حق کیسے حاصل ہو گیا کہ وہ ترکی معاملات پر مُنہ کھولنے کی بھی جرأت کرے؟"

اتاترک کے اس تلخ جواب سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترک، عرب، شام اور فلسطین کی اس بیوفائی کو نہیں بھولے ہیں، جو جنگ عظیم کے دَوران میں ان سے سرزد ہوئی تھی وہیں اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اتاترک ترکی معاملات میں کسی جذباتی نظریہ کا بے ضرورت احترام کرنے کیلئے تیار نہیں تھے، انھیں اس پر اصرار تھا کہ ترکی ترکوں کے لئے ہے۔ ترکوں نے بغیر کسی کی مدد کے اُکو محض اپنے قوتِ بازو سے آزاد کرایا ہے، اس لئے ترکی جدید کی تعمیر بھی خالص ترکی نقطۂ نظر سے ہو گی اور کسی کو اس میں لب کشائی کا حق نہ ہو گا۔

لیکن اتاترک کے اس جواب کے قطع نظر اسی باب میں اتاترک کے

اس نظریہ کو سمجھ لینے کے بعد جس کے ماتحت انھوں نے ترکی میں یہ انقلابی اصلاحات نافذ کیں اس اعتراض کی کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہتی جو عالم اسلام نے ترکوں کی مغرب زدگی پر کئے تھے۔ صدیوں کے واسطے، تعلقات اور یگانگت کے بعد اگر ترک یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی قومی فلاح اسی میں ہے کہ وہ مغربی تہذیب بغیر کسی تراش خراش کے قبول کرلیں تو اس میں کسی کو اعتراض کا حق کیا ہے۔ اگر ترک مشرق کی قدیم اور فرسودہ روایات کو ترک کردینا چاہتے ہیں تو کسی کو یہ اصرار کیوں ہو کہ ترک خواہ مخواہ ان بوسیدہ مشرقی روایات کو اپنے گلے میں حمائل ہی کئے رہیں؟

اتاترک اصل میں پرانی لکیر کو پیٹے جانے کے سخت خلاف تھے اور لیپا پوتی کے وہ قائل نہ تھے، وہ تو یہ چاہتے تھے کہ اصلاحات ہوں تو تکمیل کے ساتھ ہوں، ان فرسودہ روایات کا تسمہ بھی نہ لگا رہے جنھوں نے ترکوں کو ہر اعتبار سے کمزور اور خود اپنی حفاظت کے ناقابل بنا رکھا تھا۔

چنانچہ ترکی میں جو اصلاحات ہوئیں وہ اسی تکمیل کے ساتھ ہوئیں کہ انھوں نے ترکوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو بدل ڈالا۔ حتیٰ کہ مذہبی رسوم بھی اصلاحات کی زد سے نہ بچ سکے۔ مذھب کی اصلی روح کو برقرار رکھتے ہوئے درویشوں اور مولویوں کی خود ساختہ اجارہ داری کو ختم کردیا۔ امتدادزمانہ کے باعث توہمات نے اعتقادات کی صورت اختیار کرلی تھی انھیں دور کردیا۔ اور ہر اعتبار سے ترکوں کو ایک نئی اور زندہ قوم بنا ڈالا۔

ان مذھبی اصلاحات کے دوران میں بعض حلقوں میں ترکوں کی بیدینی اور لامذھبی کے بھی چرچے ہوئے، لیکن یہ محض غلط فہمیوں کا نتیجہ تھے مذہب

اسلام کے متعلق اتاترک کا نظریہ یہ تھا کہ مذہب تمدنی ترقیوں کی راہ میں حائل نہیں ۔ بلکہ دنیا کے سارے مذاہب میں صرف مذہب اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس میں دُنیاوی ترقیوں کا ساتھ دینے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے ۔ اس میں اگر کوئی کمزوری ہے تو وہ درویشوں اور مولویوں کے وجود سے پیدا ہوگئی ہے جنھوں نے اپنی اجارہ داری کو قائم رکھنے کی خاطر اسلام کی اصلی روح کو توہمات کے انبار میں دبا دیا ہے اور عوام کو مدت سے گمراہی کے چکّر میں مبتلا کر رکھا ہے ۔ اسی خیال کے ماتحت ترکی سرزمین کو اتاترک نے ملّاؤں اور درویشوں کے وجود سے پاک کیا اور ترکوں کو مذہب اسلام کی اصلی روح سے مانوس ہونیکا موقع دیا ۔ اور فی الحقیقت اتاترک کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ مذہبی اصلاح کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی ۔

وہ انسان تھے ـــــــــ انسانیت کی صفات عالیہ ان میں بدرجہ کمال موجود تھیں !

اتاترک کی سیرت کا یہ سرسری خاکہ غیر مکمل رہے گا اگر ہم یہاں ان کی چند ذاتی خصوصیات کا تذکرہ نہ کریں ۔ شہرت پسندی یا شہرت طلبی ایک انسانی کمزوری ہے ۔ اور اس کمزوری میں تاریخ کی بڑی سے بڑی اور نام آور سے نام آور شخصیتیں مُبتلا نظر آتی ہیں ۔ لیکن اتاترک کی سیرت حیرت انگیز طور پر اس کمزوری سے پاک ہے ۔ ان کی زندگی کے کسی حصّہ میں کوئی واقعہ ایسا نہیں گذرا جس سے ان کی شہرت پسندی پر دلیل لائی جا سکے ۔ اور نہ اپنی پبلک زندگی میں انھوں نے کبھی ایسا غیر معمولی انداز اختیار کیا جو

ان کی شہرت کا سبب بنتا۔ انھوں نے کبھی کوئی کام کسی فرد واحد یا کسی جماعت کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے نہیں کیا جو کچھ کیا وہ قوم کیلئے کیا۔ اور اس طرح کیا کہ نہ کبھی مخالفتوں کی پرواکی اور نہ صلہ وستائشوں کی تمنّا!

اتاترک کی وہ نصیحت خود ان کی اپنی سیرت کا آئینہ ہے جو انھوں نے ۱۹۱۰ء میں جمال پاشا کو کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اتحاد و ترقی، کو ترکی میں کافی عروج حاصل ہو چکا تھا اور اس کے لیڈروں کی ملک میں بڑی شہرت تھی۔ جمال پاشا بھی اتحاد و ترقی کے ایک لیڈر تھے اور اپنی کامیابیوں سے کچھ مدہوش سے ہو رہے تھے۔ ایسے موقع پر اتاترک ان سے کہتے ہیں:۔

"آج کل کے بہت سے شہرت پسندوں کی طرح تم کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ تمھیں ہر راہ چلتے احمق کو خوش کرنا ہے۔ یاد رکھو عوام کی ستائش نہ کچھ معنی رکھتی ہے نہ وزن! بڑائی اس طرح حاصل نہیں ہوتی کہ لوگوں کے سُنے سُنائے مسلمات کو پبلک کے آگے دوہرا دیا جائے بلکہ بڑائی صرف اس طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ ملک کی حقیقی ضرورت کو سامنے رکھکر انسان پہلے

اپنی منزلِ مقصود بنائے اور پھر حوادث گردو
پیش سے بے پرواہ ہو کر اُسے حاصل بھی کر لے۔ اس
راہ میں تمھیں بہت سی مشکلوں اور مخالفتوں کا
مقابلہ کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر تم نے ان سب کا
کامیابی سے مقابلہ کر لیا تو یقیناً تمھیں بڑائی حاصل
ہو جائے گی!"

اتاترک کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اپنی زندگی کے کسی دور میں انھیں اپنی ذات یا اپنے خاندان کے مفاد کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ ایک کامیاب اور با اقبال شخص کی یہ دوسری آزمائش ہے، ایسی کہ تاریخ کی اولوالعزم سے اولوالعزم ہستیاں اس سخت آزمائش پر پوری نہ اتر سکیں۔ لیکن اتاترک اس آزمائش میں نہ صرف پورے اترے بلکہ صفحۂ تاریخ پر اپنی بے ریا زندگی کا ایسا گہرا نقش چھوڑ گئے کہ صدیوں تک آنیوالی نسلوں کے لئے قابلِ تقلید رہے گا۔

قومی سرگرمیوں کے دوران میں، جبکہ بڑے سے بڑا دنیاوی اعزاز ان کے قدموں سے لگا پڑا تھا، شخصی کامیابیوں اور فتحمندیوں کے اس دور میں جبکہ زمانہ ان کی ذات اور ان کے خاندان کے لئے ترکی کی آئندہ تاریخ کے صفحات وقف کرنیکو تیار تھا، اتاترک انتہائی

شانِ بے نیازی کے ساتھ، اپنی زندگی کے مقدس مشن کی تکمیل میں مصروف نظر آتے ہیں۔

انھیں غالباً کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ اپنی "ذات" کے متعلق بھی کچھ سوچیں۔ اور نہ ان میں کبھی اتنا شعور پیدا ہوا کہ وہ اپنی ذات کو اپنی قوم سے الگ کرسکیں۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اپنی قوم ہی کا ایک معمولی فرد سمجھتے رہے، اور قوم سے علیحدہ اپنے وجود کے قائل نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم دستور کے مطابق دُنیا کے نزدیک ہر قسم کے اعزاز و احترام کی مستحق ان کی ذات تھی، لیکن ان کے نزدیک اس کی مُستحق ان کی قوم تھی جس کے یہ بھی ایک فرد تھے۔

اپنی قوم کے متعلق ان کا یہ اعتقاد اس قدر راسخ تھا، کہ زندگی میں اگر انھوں نے اپنی ذات کو قوم کے حوالے کر دیا تھا تو مرنے کے بعد اپنا لاکھوں پونڈ کا ذاتی سرمایہ قوم کو بخش دیا۔

اتاترک کے ایثار کی یہ ایسی زبردست مثال ہے کہ تاریخ اس باب میں کوئی ان کا مثیل نہیں پیش کرسکتی!!

مشہور ہے کہ اتاترک جذبات سے عاری ایک ٹھوس اور خشک مہندسانہ دل ودماغ کے مالک تھے۔ اس شہرت میں اصلیت ضرور ہے اس لئے کہ وہ جذبات کے بجائے اپنے دل ودماغ سے کام لیا کرتے تھے۔ اضطراری طور پر کبھی کوئی رائے قائم نہیں کرتے تھے اور جب کافی غور وخوض کے بعد ایک رائے قائم کرلیتے تو اس سے ایک انچہ بھی اِدھر اُدھر ہونا نہیں جانتے تھے اور یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔

لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ جذبات سے بالکل ہی عاری تھے۔ ان میں احساس تھا اور بہت تھا لیکن وہ اس کا علانیہ اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر میں وہ فولاد کی طرح سخت اور سرد نظر آتے تھے مگر بہ باطن وہ ایسے ثابت نہیں ہوتے۔ ان کی زندگی میں ایسے موقعے بہت سے گذرے ہیں جن میں انھوں نے اپنی معمولی احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور انتہائی جوش و خروش سے کام لیا ہے۔ اور ایسے واقعے بھی پیش آئے ہیں کہ فولاد کی طرح کا سخت اور سرد چہرہ بہت دیر تک ان کے اندرونی جذبات کو چھپا نہیں سکا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ایسے واقعے اتاترک کی خانگی زندگی میں زیادہ پیش آئے ہیں۔ ایک جمہوریہ کے صدر میں یہ "کمزوری"، عام طور پر محسوس نہیں کی گئی۔

اس موقع پر اتاترک کا ایک ایسا ہی واقعہ ہمیں یاد آگیا جو انقرہ کے اخبار "حاکمیت" کے حوالہ سے ۱۹۳۷ء میں بعض اخباروں میں چھپا تھا:۔

اتاترک دسمبر ۱۹۳۷ء میں سمرنا کے نواح میں دورہ کر رہے تھے شہر "اوزکوئی" میں اتاترک کا کیمپ پڑا۔ اطراف و جوانب سے لوگ اپنے سردار کے دیدار کو دوڑے۔ اور ہر روز کیمپ کے گرد اچھا خاصا میلا رہنے لگا۔ محمود شوکت پاشا مرحوم ترکی کے سابق وزیر اعظم کی بڑھیا بیوہ لڑکی جو اسی شہر میں اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہا کرتی تھیں اتاترک کی آمد سے فائدہ اٹھانے اور اپنے بیٹے کے لئے جو ترکی محکمہ پرواز میں ملازم تھا ترقی کی سفارش کرنے اتاترک کے کیمپ پر پہونچیں۔ لیکن کئی گھنٹے انتظار کرنے کے بعد بھی انھیں اتاترک کے حضور میں باریابی کا موقع نہ ملا

مایوس اور تھکن سے نڈھال افتاں و خیزاں اپنے گھر واپس آرہی تھیں کہ راستہ میں انھیں ایک ترک سپاہی ملا۔ جس نے ان کی ضعیفی کا احترام کرتے ہوئے اپنے بازو کا سہارا پیش کیا اور آہستہ آہستہ ان کے گھر تک ساتھ گیا۔ راستہ میں بیوہ خاتون نے جو اتاترک کے کیمپ سے بھری ہوئی آرہی تھیں، سپاہی کو اپنی بپتا سنائی۔ اور اتاترک کو خوب ہی دل کھول کر برا بھلا کہا۔ اتنے میں خاتون کا گھر آگیا۔ ان کی نوجوان بہو نے کواڑ کھولے اور یہ دیکھکر دنگ رہ گئی کہ اس کی ساس کے ساتھ خود اتاترک کھڑے ہیں۔ لڑکی نے جب اتاترک کا نام لیا اور انھیں جھک کر سلام کیا تو بیوہ خاتون کو ہوش آیا۔ اور اپنی راستہ کی باتیں ایک ایک کر کے یاد آئیں۔ اور انھوں نے خوفزدہ انداز میں اتاترک سے معذرت چاہی۔ لیکن اتاترک نے یہ کہہ کر خاتون کو روک دیا:۔

"محترم خاتون! کسی معذرت کی ضرورت نہیں، میں حقیقتاً نادم ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے قوم کی خدمت میرے سپرد کی لیکن میں اپنے حوصلہ کے مطابق یہ خدمت ادا نہیں کرسکتا"

اس پر خاتون نے اتاترک کو دعائیں دیتے ہوئے کہا کہ "لوگ اندھے ہیں جو ایسے خدا ترس کو بے دین کہتے ہیں"

اتاترک نے فرمایا:۔

"لوگوں کو برا نہ کہو، مسلمان ہونا حقیقتاً بہت مشکل

ہے۔ مسلمان تھے فاروق اعظمؓ، خالد بن ولیدؓ،
حضرت امام حسینؑ۔ میں ان مسلمانوں کی خاکِ پا کی
برابری بھی نہیں کر سکتا۔ میرے لئے جنّت کی
دُعا نہ کرو بلکہ یہ دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرض
میرے ذمّے عائد کر رکھا ہے میں اسکو ایمانداری
کے ساتھ ادا بھی کر سکوں"۔

اس کے بعد اتاترک جب اپنے کیمپ واپس ہوئے نوجوان ترکوں کے نوجوان لڑکے کی ترقی کا حکم جاری کر دیا۔

اتاترک کے غیر ملکی تذکرہ نویسوں نے اتاترک کی بعض کمزوریوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان تذکرہ نویسوں میں سب سے پیش پیش کپتان آرم اسٹرانگ نظر آتا ہے، جو جنگ عظیم کے دوران میں ترکوں کے ہاتھ گرفتار ہو گیا تھا۔ اور کئی برس اس نے انقرہ کے قیدخانہ میں بسر کئے تھے۔ اس شخص نے جس غیر ثقہ انداز میں اتاترک کی سیرت پر حملے کئے ہیں اس سے یہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اتاترک پر اپنا بخار نکالا ہے۔ اور تین برس ترکوں کی قید میں رہنے کا اس طرح بدلہ لیا ہے کیونکہ سوائے آرم اسٹرانگ کے اتاترک کے کسی غیر ملکی تذکرہ نویس کو ان کی سیرت میں وہ باتیں نظر نہیں آئیں حالانکہ ان تذکرہ نویسوں میں

جرمن بھی ہیں اور فرانسیسی اور امریکن بھی شامل ہیں جنھیں اناطولیہ کی سرگرمیوں کے زمانہ میں آرام اسٹرانگ سے زیادہ اتاترک کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل چکا ہے۔ چنانچہ اپنے اسی نابکار انداز بیان کی باعث آرم اسٹرانگ کی "گرے وُلف" نہایت غیر معتبر اور جھوٹ کی پوٹ سمجھی جاتی ہے۔ جس کا سمجھدار طبقہ میں کوئی وزن اور وقار نہیں ہے آرم اسٹرانگ کے علاوہ جن تذکرہ نویسوں نے اتاترک کی کمزوریوں کا ذکر کیا ہے ان میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے جسے اتاترک کی عظیم الشان شخصیت کی طرف منسوب کرتے ہوئے ہم جھجکیں۔ اور یہ نام نہاد کمزوریاں بھی ان تذکرہ نویسوں کو دراصل ترکی کی ٹھیٹ مشرقی روایات کی روشنی میں نظر آتی ہیں۔ ورنہ ترکی میں اصلاحات کی تکمیل کے بعد جن غیر ملکی حضرات نے اتاترک کی لائف... لکھی ہے انھوں نے بھولے سے بھی ان کی طرف اشارہ نہیں کیا۔

بہر حال اتاترک فرشتہ نہیں تھے انسان تھے۔ اور انسان میں کچھ نہ کچھ کمزوریوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر ان میں کچھ انسانی کمزوریاں تھیں بھی تب بھی ان کی معجزانہ شخصیت پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ اس لئے کہ ان کمزوریوں کا کوئی اثر ان کی ان خصوصیات پر نہیں ملتا جو ان کی ذات میں جمع تھیں۔ اور جن کے باعث اتاترک کی شخصیت قدیم اور جدید تاریخ میں بالکل منفرد نظر آتی ہے اور ڈھونڈی سے بھی کوئی ان کا مثیل اور نظیر نہیں ملتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اتاترک دنیا کے ان استثنائی نفوس میں سے ایک تھے، جنھیں قومیں صدیوں کے مسلسل ریاض کے بعد پیدا کیا

کرتی ہیں اور جو خود انکی اپنی نجات کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ ترکی کی مبارک سرزمین نے اتاترک کو جنم دیا۔ اتاترک نے ترکوں کو نئی زندگی بخشی۔
اتاترک زندہ ہیں جب تک ترک دنیا میں باقی ہیں۔ اور دنیا کے حافظہ میں ان کا نقش محفوظ ہے جب تک دنیا کی آنیوالی نسلوں کا احساس تازہ ہے۔
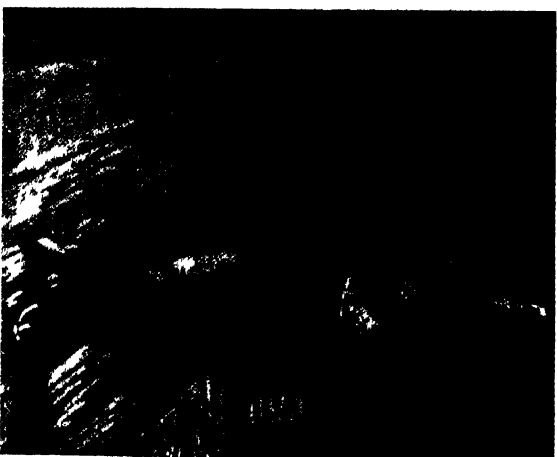
عصمت اینونو دریا کے کنارے

آتا ترک کی متبنہ لڑکی صبیحہ آتا ترک کے ہاتھ پر بوسہ دے رہی ہے

باب ۴۰
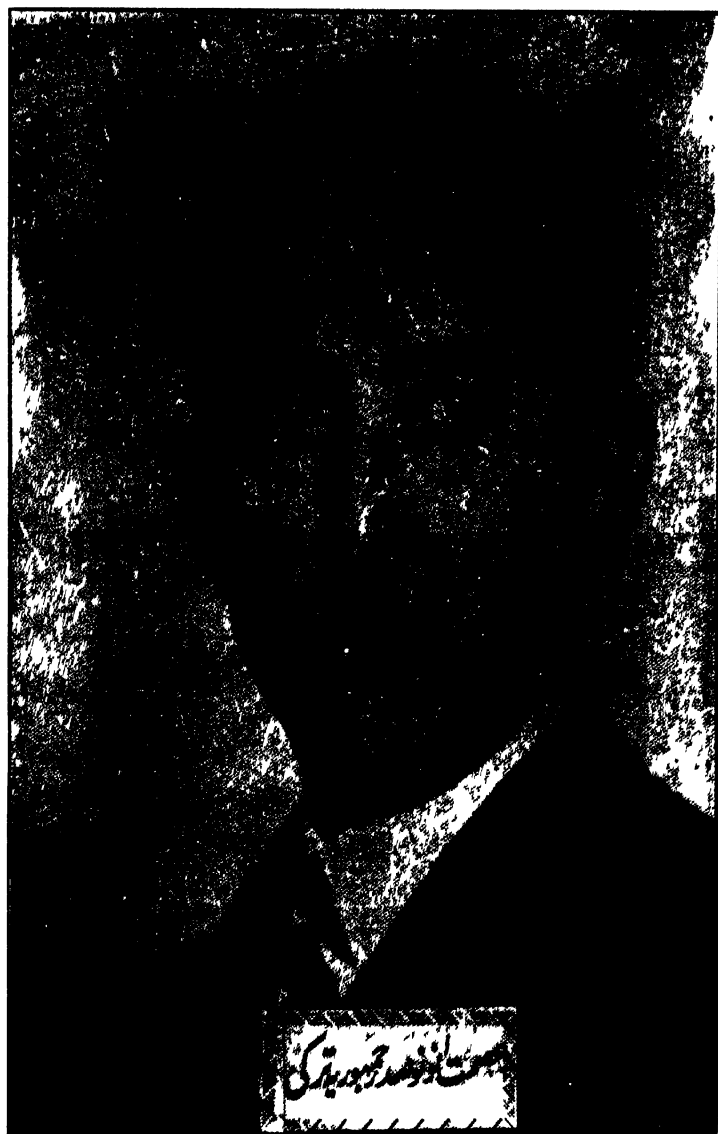
اتاترکؒ کا جانشین

۱۹۲۰ء میں جب سلطان وحید الدین اناطولیہ کی قومی تحریک کو اپنی پوری قوت سے کچلنے کی کوشش کرتے ہیں اور آزاد پارلیمنٹ کے اکثر ممبروں کو گرفتار کر کے قسطنطنیہ سے مالٹا بھیجدیتے ہیں تو قسطنطنیہ کے بہت سے معزز اور با اثر ترک اس دار و گیر سے گھبرا کر قسطنطنیہ سے فرار ہو جاتے ہیں اور اناطولیہ پہونچ کر اتاترک کی پناہ لیتے ہیں۔ انھیں میں ایک پستہ قامت ، نحیف الجثہ لیکن نہایت ذہین اور سنجیدہ خط وخال کے ایک ترک بھی ہیں ، اتاترک بڑے تپاک سے ان کی پذیرائی کرتے ہیں اور فوراً انھیں اپنی قومی تحریک میں شامل کر لیتے ہیں ——
یہ عصمت ہیں جو پہلی مرتبہ قومی تحریک میں عملی حصّہ لینے ، قسطنطنیہ سے اناطولیہ آئے ہیں ۔

لیکن عصمت اور اتاترک کی یہ پہلی ملاقات نہیں تھی اس سے بہت پہلے جنگ عظیم میں عصمت کاکیشیا کی فوج میں کرنل تھے ، جب اس فوج کی کمان اتاترک کے پاس تھی ، یہیں اتاترک عصمت سے واقف اور

اور ان کی خداداد قابلیتوں سے متعارف ہوتے ہیں۔ افسر اور ماتحت میں دوستی کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد عصمت قسطنطنیہ آجاتے ہیں اور اتاترک شام کی مہم پر چلے جاتے ہیں لیکن اس دوستی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ قسطنطنیہ کی وزارت میں تبدیلی ہوتی ہے۔ عصمت دفتر جنگ میں پہونچ جاتے ہیں، اتاترک قسطنطنیہ میں بیکاری کا زمانہ گذارتے ہوتے ہیں۔ لیکن دونوں میں رشتۂ خلوص برابر قائم رہتا ہے۔ اتاترک اناطولیہ پہونچتے ہیں اور قومی تحریک نہایت منظم طریقے پر پوری سرگرمی کے ساتھ شروع کر دیتے ہیں۔ عصمت دل سے اس تحریک کی حمایت کرتے ہیں۔ اور اتاترک کو دفتر جنگ سے ضروری اطلاعات دینے کا کام اپنے ذمے لیتے ہیں۔ لیکن جب عصمت کیلئے قسطنطنیہ میں رہکر قومی تحریک کی مدد کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ تو اناطولیہ آجاتے ہیں اور علانیہ اتاترک کی قیادت میں قومی کام شروع کر دیتے ہیں۔

عصمت میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ سپاہی بھی ہیں اور سیاسی مدبر بھی ہیں۔ تحریک کے ابتدائی دَور میں وہ قوم پرستوں کی فوج کے چیف آف اسٹاف تھے۔ چنانچہ اینونو قرہ حصار، اسکی شہر اور سقاریہ میں ترکی فوجیں انھی کی زیر کمان مظفر و منصور رہی تھیں۔ جنگ و جدل کے بعد قیامِ جمہوریت کا دَور شروع ہوتا ہے۔ اس دَور میں عصمت ایک سیاسی مدبر کی حیثیت سے میدان میں آتے ہیں اور پہلا ہی معرکہ لوزان میں انگریزوں کے مشہور سیاست داں لارڈ کرزن کے مقابلہ میں

سَر کرتے ہیں۔ اور ساری دُنیا سے ترکی کی قطعی آزاد اور خود مختار حیثیت تسلیم کرا لیتے ہیں۔ اس کامیابی کے بعد عصمت اتاترک کے دستِ راست بن جاتے ہیں۔ اور پوری سرگرمی سے ترکی کے اس جدید نقشے میں رنگ بھرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں جو ترکی جمہوریہ کو لئے اتاترک نے تیار کیا تھا۔

عصمت چار مرتبہ ترکی جمہوریہ کے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ اور چوتھی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں اپنی خدمت سے استعفا دیا۔ اس تمام دوران میں عصمت نے اپنے اس جلیل القدر عہدہ کی ذمہ داریوں اور فرائض کو بکمال تدبر اور دانشمندی پورا کیا۔ اور اتاترک کے ساتھ مل کر ترکیہ جمہوریہ کے اعزاز و وقار کو بہت اونچا کر دیا۔

عصمت انونو، ابتدا ہی سے اتاترک کے نہایت معتمد اور وفادار دوست رہے۔ اور سارے زمانہ ابتلا میں کبھی ایک سکنڈ کیلئے بھی انھیں اتاترک کی ذات یا ان کے مشن پر شبہ نہ ہوا۔ انھیں اتاترک کی ذات سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اور ہمیشہ آنکھیں بند کر کے ان کے حکم کی تعمیل کیا کرتے تھے۔

اسی کے ساتھ عصمت انونو بڑے زبردست وطن پرست ہیں اور ایسے کٹر ترک ہیں کہ ترکی میں ایک بھی غیر ترکی روایت کو زندہ رکھنے کے روادار نہیں۔ ترکی زبان سے عربی اور فارسی الفاظ کے اخراج کی ذمہ داری زیادہ تر عصمت انونو پر ہے۔ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ عصمت انونو نے جب یہ وزیر اعظم تھے نیشنل اسمبلی میں اپنی رپورٹ اسقدر

ہٹیٹ ترکی زبان میں سنائی گئی کہ اسمبلی کے آدھے سے زیادہ ممبر اس رپورٹ کو پوری طرح سمجھ ہی نہ سکے۔ دراصل اسی واقعہ کے بعد غیر ترکی الفاظ کو ترکی زبان سے خارج کرنیکی تحریک شروع ہوئی۔

لیکن ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ترکی جمہوریہ کا جو نقشہ اتاترک نے بنایا تھا اس میں رنگ انہی کی جانفشانیوں سے بھرا گیا۔ اصلاح کا جو پروگرام اتاترک نے ترکی میں جاری کیا تھا انہی کی مدد سے وہ پورا ہوا۔ اور حکومت جن بنیادوں پر اتاترک نے قائم کی اور پندرہ برس چلائی اس میں عصمت انونو اتاترک کے برابر کے رفیق اور مددگار رہتے۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں عصمت انونو جب چوتھی مرتبہ جمہوریہ ترکیہ کی وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہوئے تو عام خیال یہ تھا کہ عصمت انونو اور اتاترک میں اب کے اس قدر زبردست اختلاف پیدا ہوا ہے کہ یہ دُور نہ ہو سکے گا اور نہ پھر یہ دونوں ترکی سیاست میں ایک جگہ جمع ہو سکیں گے۔ لیکن عصمت انونو نے اس عام خیال کی اپنے عمل سے تردید کر دی۔ مستعفی ہونے کے بعد جب وہ اپنی صحت کی خاطر انقرہ سے دیانا جانے لگے ہیں تو اتاترک کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اپنی قدیم محبت اور عقیدت کا اظہار کیا۔ اور یہ درخواست کی کہ بحالی صحت کے بعد جس وقت اتاترک طلب فرمائیں گے وہ فوراً حاضر ہو جائیں گے۔ چنانچہ جب عصمت انونو جون ۱۹۳۸ء میں ترکی واپس ہوئے تو ایک افواہ یہ تھی کہ عصمت انونو کو اتاترک نے لندن کی سفارت پر مقرر فرمایا ہے۔ اور عنقریب وہ اپنے عہدہ کا چارج لینے والے ہیں لیکن یہ تجویز روبہ عمل نہ آسکی۔ اور عصمت انونو کو ترکی کی عملی سیاست میں فوراً بار

نہ ملا ممکن ہے کہ اس کی وجہ اتاترک اور عصمت انونو کا سیاسی نقطہ نظر کا اختلاف ہو! کیونکہ عملی سیاست میں اس طرح کا اختلاف دو گہرے دوستوں اور وفادار ساتھیوں میں بھی ناممکن نہیں ہے۔ اور پھر اتاترک اور عصمت انونو میں جو صحیح معنوں میں ترکی جدید کے بانی تھے اپنی عملی زندگی میں اکثر اس طرح کا اختلاف ہوا ہے اور دور بھی ہو گیا ہے لیکن کبھی اس قسم کے سیاسی اختلاف کو یہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی کہ ان کی آپس کی شخصی محبّت اور دوستی میں کوئی فرق آیا ہو۔

جو لوگ عصمت انونو کے مستعفی ہونے کے بعد یہ سمجھنے لگے تھے کہ اتاترک اور عصمت انونو میں اتنے دنوں کے اتحاد خیال کے بعد ذاتی طور پر نہ مٹنے والا اختلاف پیدا ہو گیا ہے وہ صحت پر نہیں تھے۔ اس لئے کہ ترکی کی یہ دونوں عظیم المرتبت ہستیاں اس اسٹیج سے بہت آگے بڑھ چکی تھیں جہاں ذاتیات کا سوال معرضِ بحث میں ہوتا ہے۔ ان دونوں کے آگے تو ذاتی سوال کبھی آیا ہی نہیں۔ ان کے پیشِ نظر اگر کچھ تھا تو صرف ترکی اور ترکوں کا مفاد تھا۔ اسی سوال پر بعض اوقات نقطہ نظر کا اختلاف بھی ہوتا تھا لیکن اکثر اوقات مکمل اتحاد رہتا تھا۔ جہاں صورتِ حال یہ ہو وہاں کسی سیاسی اختلاف کو ذاتی اختلاف خیال کرنا صریح زیادتی ہے۔

اتاترک اور عصمت انونو کی گہری محبّت اور دوستی کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ اتاترک نے اپنے بسترِ مرگ پر عصمت انونو کو یاد کیا اور وہ فوراً اتاترک کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اور انتقال کے وقت تک اتاترک کی بہن مقبولہ اور منہ بولی لڑکیوں کے ساتھ ایک ہی خاندان کے فرد کی حیثیت

سے برابر اتاترک کی خدمت میں حاضر رہے ۔ یہ وہ اعزاز تھا جو ترکی کے کسی بڑے سے بڑے ذمّہ دار افسر کو بھی حاصل نہ ہو سکا ۔ جس وقت اتاترک کا انتقال ہوا ہے تو برابر کے کمرے میں اتاترک کا جاں نثار ایڈی کمپ صالح بوزک نے فوراً ریوالور کی گولی سے خودکشی کر کے اپنے محبوب آقا سے جا ملا ۔ اور کمرے میں مقبولہ خانم اور عصمت انونو اس صدمہ سے بیہوش ہو گئے ۔ دوسرا ناقابل تردید ثبوت عصمت انونو کے ساتھ اتاترک کی محبّت اور دوستی کا یہ تھا کہ اتاترک نے اپنی وصیّت میں اپنے اثاثہ کا ایک حصّہ جو مقبولہ خانم اور اپنی منہ بولی بیٹی کے حصّہ سے دوگنا تھا عصمت انونو کے بچّوں کی تعلیم کے لئے وقف فرما دیا ۔ اس وصیّت نامہ میں اپنی بہن مقبولہ خانم کے ساتھ عصمت انونو اور ان کے بچّوں کا اس انداز سے اتاترک نے ذکر کیا ہے جیسے یہ سب ایک ہی خاندان کے فرد ہوں ۔ ان شواہد کی موجودگی میں غالباً اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہی کہ اتاترک اور عصمت انونو میں کسی قسم کا ذاتی اختلاف نہیں تھا بلکہ یہ دونوں بزرگ ہستیاں آپس میں ایک ایسے رشتہ خلوص و محبت میں بندھی رہیں جو کبھی کمزور نہ ہوا ۔

اتاترک کے خلوص اور محبّت کا جواب عصمت انونو کی طرف سے بھی ہمیشہ وفاداری اور عقیدت کے ساتھ ملا ، اتاترک کی سیاست سے اختلاف رؤف کو بھی ہوا ۔ کاظم قرہ بکر ، علی فواد اور جنرل نورالدین کو بھی ہوا اور عصمت انونو نے بھی بعض اوقات اختلاف کیا ۔ لیکن فرق انہیں اور عصمت انونو میں یہ ہے کہ یہ لوگ اتاترک سے اختلاف کر کے ترکی میں ہمیشہ ایک نئی

اور مخالف پارٹی بناتے اور ترکی سیاست میں پیچیدگیاں ڈالتے رہے لیکن عصمت انونو نے اتاترک سے علیحدہ کبھی اپنی کوئی مخصوص سیاسی پارٹی نہیں بنائی۔

اس کے صرف ایک معنی تھے اور وہ یہ کہ عصمت انونو کو بعض باتوں میں اتاترک سے اختلاف کے باوجود ان کی قیادت پر پورا پورا اعتماد تھا۔ اور وہ ایک لمحے کیلئے بھی اسے پسند نہ کرتے تھے کہ جو نسبت انھیں اتاترک سے حاصل ہے وہ زائل ہو جائے۔

گویا عصمت انونو کو صحیح معنوں میں اتاترک سے عقیدت تھی۔ اور وہ ہمیشہ ان کے رفیق، ساتھی اور ان کے عملی پروگرام میں نہایت سرگرم مددگار رہے۔

آج یہی عصمت انونو اتاترک کے جانشین ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ساری ترکی میں اس اعزاز کا ان سے بڑھکر کوئی اور ترک مستحق بھی نہ تھا۔ اتاترک کے ساتھ اتنی مدت کام کر چکنے کے بعد حکومت کی ان لائنوں سے یہ اچھی طرح مانوس ہیں جو اتاترک نے متعین کر دی تھیں۔ اور ان اصلاحات کی قدر و قیمت کو خوب جانتے ہیں جنھیں اتاترک کی قیادت میں خود انھوں نے ترکی کے عرض و طول میں نافذ کیا تھا۔

اس اعتبار سے عصمت انونو کے انتخاب کے بعد ہم بجا طور پر یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ترکی کا اعزاز و وقار بدستور دن دونی رات چوگنی

ترقی کرتا جائیگا اور ترکی جمہوریہ کا وہ پودا جو ۱۹۲۴ء میں اتاترک کے مقدس ہاتھوں نے لگایا تھا عصمت انونو کے زمانہ میں اپنی پوری بہار دکھائے گا!

انشاء اللہ تعالیٰ

ختم شد

کتب خانہ علم و ادب دہلی کی خاص مطبوعات

فاؤسٹ شاعر کی مصوری اور مصور کی شاعری کی شہرۂ آفاق کہانی اردو میں پہلی مرتبہ عام فہم پیرایہ میں پیش کی گئی ہے۔ مترجمہ شاہد احمد بی۔اے دہلوی۔ قیمت عہ۔

عروس ادب دل میں کھپ جانیوالے افسانوں کا مجموعہ۔۔ ۳صفحات۔ زبان نہایت صاف از قاضی عباس حسین دہلوی۔ قیمت عہ۔

خطوط کی ستم ظریفی یہ خط بھی کیسے ستم ڈھاتے ہیں۔ خصوصاً خط و کتابت ایک شریر لڑکی اور جوان مرد کی۔ از مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ قیمت ۸

سات تارے ایک ہی پلاٹ پر سات مشہور مصنفوں کے لکھے ہوئے افسانوں کا مجموعہ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ مجلد مطلا۔ قیمت عہ

لالہ رخ یہ کتاب تقریباً ۵ سال سے نایاب تھی اب مصنف سے اجازت لیکر بہترین طریقہ سے شائع کی گئی ہے۔ از ل۔ احمد اکبر آبادی۔ قیمت مجلد دو روپئے۔

کھرپا بہادر ایک بدمعاش لفنگے کی سرگذشت سے اس ناول کی ابتدا ہوتی ہے۔ الف لیلےٰ کے سوتے جاگتے (ابو الحسن) کے قصے سے بھی زیادہ دلچسپ اور مضحکہ خیز ہے۔ از مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ قیمت ایک روپیہ۔

معاشقہ نپولین فرانس کے جنگجو سپہ سالار اور شہنشاہ نپولین کی حیات معاشقہ۔ قیمت ۶/

تاج آفس پروپرائٹر شیخ نذیر احمد
محمد علی روڈ بمبئی ۳